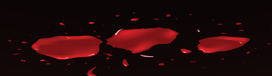
کلام اللہ اور سنّت و تعلیماتِ نبویؐ کی شہادت

کہ

توہینِ رسالت کی سزا

قتل

نہیں ہے



ہادی علی چوہدری

کلام اللہ اور سنّت و تعلیماتِ نبویؐ کی شہادت

کہ

توہینِ رسالت کی سزا

قتل

نہیں ہے

تصنیف

ہادی علی چوہدری

*****

انسانیت، انسان

اور

اس کے خون

کے سب سے بڑے محافظ

رَحمَۃٌ لِّلعَالَمِین

مُحَمَّد

رسول اللہ ﷺ

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی عَبْدِہِ الْمَسِیْحِ الْمَوعُوْدِ

خدا تعالیٰ کے فضل اور رحم کے ساتھ

ھو النّاصر

پیش لفظ

*****

نسلِ انساں میں کشت و خون اور قتل و غارت گری ابتداء سے ہی جاری دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرآن کریم نے حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کا ذکر بھی کیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان مذہبی تھا یا غیر مذہبی، وہ کسی نہ کسی وجہ سے قتل و خون کرتا ہی چلا آیا ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان کو ہلاک کرنے والا انسان جاہل و غیر مہذّب بھی تھا اور تہذیب و تعلیم یافتہ بھی۔ بلکہ تہذیب و تعلیم یافتہ انسان پہلے بھی اس ظلم میں دو ہاتھ آگے ہی تھا اور ابھی بھی آگے ہی ہے۔ بلکہ اب تو وہ لاکھوں انسان ہلاک کر کے بھی تسکین نہیں پاتا۔ بہر حال اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انسان کو بیماریوں، درندوں، طوفانوں، زلزلوں یا دیگر قدرتی آفات نے اتنی تعداد میں ہلاک نہیں کیا جتنی کثرت سے خود انسان نے انسان کو ہلاک کیا ہے۔

تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ انسان کو اس قتل و غارت اور ظلم و استبداد سے نکالنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء علیہم السلام نے بہت بڑا اور بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ مگر محسنِ انسانیت، رحمۃٌ للعٰلمین حضرت محمد مصطفی ﷺ نے انسانیت کو، انسان کو اور انسان کے خون کو سب سے زیادہ بچایا اور سب سے بڑھ کر کمال تحفّظ فراہم فرمایا ہے۔ آپؐ نے بذاتِ خود انسان

کے لئے رحمت، محبّت، اخوّت، سہولت، دوستی، صلح و آشتی، عفوودرگزر، صبر ووفا، ایثار و پیار اور برداشت کے اعلیٰ، بلند اور بیمثال نمونے بھی پیش فرمائے اور قیامت تک قائم رہنے والے محکم درس بھی دیئے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت بھی ہے اور انسانی تحفّظ کی تاریخ کا ایک سنہرا اور کھلا ہوا باب ہے۔ جس کی تفصیل قارئین آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے انشاء اللہ۔ قارئین یہ بھی واضح طور پر مشاہدہ کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اور رسول اللہ ﷺ نے شریعت میں کسی جگہ بھی توہین و تنقیصِ رسولؐ کی سزا قتل تو کجا ذرّہ برابر جبر و تشدّد بھی قرار نہیں دی۔

اس سب کچھ کے باوجود بدقسمتی یہ ہے کہ خود کو اسی رحمتِ عالم اکی طرف منسوب کرنے والے اپنے بعض غلط اور جھوٹے نظریات کی اتباع میں قتل وخون اور جبر و ظلم کے علمبردار بن گئے ہیں۔ انہوں نے توہینِ رسولؐ کے نعرے کو کشت وخون کا ذریعہ بنا کر اپنے خونی عقائد و نظریات کی بنیاد بنالیا ہے۔ وہ اپنے خون آشام نظریات یا عزائم کے تحقّق کے لئے بعض آیاتِ قرآنیہ کو غلط معنے پہناتے ہیں۔ بعض واقعات جو رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی میں یا آپؐ کے بعد رونما ہوئے ان کو غلط منظر اور ماحول میں لا کر پیش کرتے ہیں یا ان کی ایسی تشریحات کرتے ہیں کہ جن کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ایسی روایات کو بھی رواج دیا ہے جو بے بنیاد تھیں یا سرے سے ہی جھوٹی تھیں۔ بہرحال یہ ایک المیہ ہے کہ ان خود ساختہ باطل تشریحات اور جعلی روایات کی بھینٹ چڑھ کر اسلامی دنیا ایک بہت بڑے نقصان سے دوچار ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی قیمتی جانوں کا ضیاع اس قوم کو تنزّل و ادبار کی گہرائیوں میں اتار چکا ہے۔ لیکن جو سب سے بڑا اور ناقابلِ تلافی نقصان اسلام کو پہنچا ہے، وہ ہمارے آقا و مولیٰ محسنِ انسانیت، رحمۃٌ للّعٰلمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی بابرکت ذات اور آپؐ کے حسین ترین چہرے پر ظلم و جبر کے بدنما داغ لگانے کی کارروائی ہے۔ اس نے دنیا کو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کی رحمت کے قریب آنے کی بجائے دور کر دیا ہے اور اسے آپؐ کے پیغام کو قبول کرنے سے روک

دیا ہے۔ یہ کارروائی تخلیقِ کائنات کی وجہ اور اس کی دلیل کو مبہم بلکہ مسخ کرنے کی بھی کھلی جسارت ہے۔ پس ان کارروائیوں کو اب ہر حال میں ختم ہونا ضروری ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص فضل سے عاجز کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اسے اسلام کی حسین تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی عالمین پر وسیع پُر رحمت ذات سے ظلم و جبر اور قتل و خون کے دھبّوں کو صاف کرنے کا ذریعہ فرمائے۔ یہ کوشش آپؐ کے ناموس کی حفاظت کے حقیقی طریقوں اور مستقیم راستوں کی نشاندہی کرنے والی ہو اور دنیا پر آپؐ کی رحمتوں کی ازلی ابدی سچائیاں واضح کرنے والی ہو۔ وما توفیقی الّا باللہ العظیم۔ اس عاجز کی یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عاجز گنہگار کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے بخش دے اور اخروی زندگی میں اس کے قدموں میں جگہ دے۔

آخر میں خاکسار ان سب مخلصوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے جنہوں نے اس تصنیف میں خاکسار کی مدد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے اور اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے عاشقوں میں شمار فرمائے۔

خاکسار

ہادی علی چوہدری

فروری 2019ء

*****

اَللّٰهُمَّ

صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ

وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ

وَسَلِّمْ إِنَّكَ حَمِيْدٌ

مَّجِيْد

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

باب اوّل

مضمون	صفحہ
1: آیات جو توہین رسالت کی سزا "قتل" کے لئے پیش کی جاتی ہیں	1
پہلی آیت: "وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ......." (التوبہ:61)	2
اذیّت اور اس پر ردّ عمل	7
رسول اللہ ﷺ کو اذیّت	9
ایک اور آیت: "أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ......" (التوبہ: 63)	14
لفظ یُحَادِدِ کے معنے اور مفہوم	15
ایک خوبصورت تعلیم	17
2: آیات جو صبر کی اور توہین کرنے والے سے عفو و درگزر، اعراض اور صرفِ نظر کی تعلیم دیتی ہیں	20
رسول اللہ ﷺ کی باتوں کو توڑنے مروڑنے والے	24
زبان کے زخم	27
شاتم کا جبراً مسلمان ہونا	28
مومن کا قتل	28
سنگین سزاؤں میں بھی معافی کی گنجائش	31

3: رؤوف ورحیم نبی ﷺ 33

بار بار تعلیمِ عفو و احسان 35

خاص طور پر جراحات اللّسان پر صبر کی تعلیم 37

عام طور پر معاف کرنے، صرفِ نظر کرنے اور مغفرت کی دعا کرنے کی تعلیم 39

باب دوم

ان روایات پر محاکمہ جو اپنے مؤقف میں قتلِ شاتم و گستاخِ رسولؐ کے قائل پیش کرتے ہیں 43

1 کعب بن اشرف 46

☆ عرب شاعری 55

2 ابو رافع 61

3 عصماء بنت مروان 66

4 ابو عفکؓ 70

5 عقبہ بن ابی معیط 75

6 زینب بنت الحارث 77

7 گالیاں دینے والی ایک عورت 81

8 ایک شاتم یہودیہ 83

☆ دشمن کے لئے کافی ہونا اور خون کا اکارت جانا 85

9 شاتم یہودیہ۔ ایک اور روایت 87

10 زندیق سوزی 89

☆	روایت اور اس کی سند	95
☆	عکرمہ بربری	98
☆	مرتدّین اور ان کا قتل	102
☆	دین بدلنا	102
11	مرتدّسوزی	104
☆	عبد الرّزّاق	108
☆	واقدی	110
12	آنحضرت ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے والا	113
13	حضرت زبیرؓ کا ایک شخص کو قتل کرنا	117
14	نابینا اور اس کی بیوی	120
☆	مزید پہلو	123
15	یہ حق رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کے لئے نہیں ہے	126
16	عبد العزّٰی بن خَطَل	131
17	ابن خطل کی دو داشتائیں	134
18	حارث بن نُفَیل	136
19	مقیس بن صبابہ	137
☆	ایک بہت بڑی واقعاتی دلیل	137
20	مَنْ سَبَّ نَبِیّاً فَاقْتُلُوْہُ	138

	روایت کے مأخذ اور اس کا زمانہ	138
	روایت کی سند کی اور اس کی حیثیت	139
	غیر مستند ہونے کے مزید واضح ثبوت	142
	روایت کا ناقابلِ عمل حصّہ	143
	روایت کے متن کا تجزیہ	147
	روایت کے الفاظ میں تبدّل	152
	خلاصہ کلام	153
21	مرتد کا قتل	155
22	یمن میں ایک مرتدّہ	158
23	سفیان ہُذَیلی	161
24	محمد بن ابی بکرؓ کے بارے میں ایک روایت	164
25	منافق کی گردن کشی	167
☆	آیات کے شانِ نزول کی حقیقت	170
☆	ایک ریکارڈ	173

باب سوم

کتاب "الصّارم المسلول علیٰ شاتمِ الرّسولؐ" کا ایک مختصر تجزیہ	175
کتاب "الصّارم المسلول علیٰ شاتمِ الرّسولؐ"	175
جھوٹے راوی اور "الصارم المسلول......"	178

نقضِ عہد	182
بے ربط اور الٹا استدلال	197
بے ترتیب اور وضعی کہانی	199
قتل کی وجہ، لسانی ایذاء!!!	200
سُنَینہ یہودی کا قتل (اب جس یہودی پر تم قابو پاؤ اُسے قتل کر دو۔)	202
بے سروپا روایات اور صحابہؓ پر ایک الزام	205
شاتم جنّوں کا قتل!	210
مؤمن اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے؟	211
ذوالخویصرہ اور کتاب 'الصارم........'	228
شارع اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پیش کردہ تعریفِ مسلم	235
عبد اللہ بن ابیّ بن سلول کا معاملہ	238
دنیا کا سب سے طاقتور انسان، محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم	241
۱: عفو کا حکم	241
۲: پہاڑوں کے فرشتے کی پیشکش	243
۳: ابو جہل کا خوف	243
۴: آپؐ کے ہمراہ الٰہی طاقت کا ایک اور مظاہرہ	246
۵: ایک بڑی فوج کے مقابل پر تنہا	248
یہودی کا 'اَلسَّامُ عَلَیْکَ' کہنا	253

کیا رسول اللہ ﷺ کو گالی پہنچتی ہے؟ 260

امت کا فرض ہے کہ وہ شاتمِ رسولؐ کو معاف نہ کرے!! 262

قرآن کریم کو گالیاں 268

"امّتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں" 269

ایک سنہری اصول، ایک قیمتی سبق 277

کتاب "الصارم المسلول......" کا پس منظر 279

باب چہارم

قتلِ شاتم کے مسئلہ پر اجماع کا ڈھونگ 285

قتلِ شاتم کے مسئلے پر نام نہاد اجماع کی پگڈنڈی 287

اس اجماع کی حقیقت 291

حضرت ابو بکرؓ 298

حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم 299

حضرت امام ابو حنیفہؒ 300

حضرت امام مالکؒ 302

حضرت امام شافعیؒ 304

حضرت امام احمد بن حنبلؒ 305

عدم اجماع کی ایک اور شہادت 306

باب پنجم

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ پاک کا ایک حقیقت افروز تجزیاتی مطالعہ

حلف الفضول	311
حجرِ اسود کا قضیہ	312
نفع رساں اوصافِ حمیدہ	313
آسانی عطا فرمانے والے	314
بیحد دیالو	315
سادگی پسند، حلیم الطبع اور منکسر المزاج	315
مجسّم حیا	317
غلاموں، یتیموں بے کسوں اور خادموں پر شفقت	317
بے کسوں کا والی	319
زیادتی کرنے والوں پر بھی سایہ ترحّم	321
شدید ترین ظلموں پر صبر و برداشت	322
سب سے بڑے گستاخ سے بھی عفو و شفقت	322
امن و سلامتی کا پیغامبر	325
شفقت علیٰ خلق اللہ	331
انسان، انسانیت اور انسانی خون کا سب سے بڑا محافظ	334
انبیاء علیہم السلام کی گواہی	334

دعوتِ حق کے لئے جارحیّت سے گریز کی خواہش	335
ذہنی اور جسمانی اذیت دینے والوں کو در گزر	336
جانی دشمن پر عفو ومہربانی	337
میثاقِ مدینہ، قوموں کے لئے امن و سلامتی کا ابدی عہد، معاہدہ	337
معاہدہ شکنی پر در گزر	340
قیامِ امن کے لئے ہر ممکنہ کوشش	340
أَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا	341
خونریزی سے پاک فتح	344
تشنگانِ لہو پر لطف وکرم	346
سزائے موت پر بھی سایۂ عفوورحمت	348
ایک قابلِ ذکر واقعہ۔ عکرمہ کی معافی	349
عدوّ مبین پر سائبانِ رحمت وکرم	353
سزایافتگان کی معافی	355
قتل سے ہاتھ روکو	356
ارادۂ قتل کے مجرم کو معافی اور دعا	357
قتل پر شدّتِ درد	359
سیرت طیّبہ کا ایک اور تابناک پہلو	362
ا۔ جادوگری کی ذلیل جسارت پر معافی:	362

۲۔سازشوں کا اڈّہ: 365

۳۔مسجد ضرار اور اس کا انہدام: 365

۴۔منافقوں کی سرگرمیاں 369

۵۔منافقوں کی ایک خوفناک سازش 370

۶۔ابو عامر راہب 372

انسان اور انسانی خون کے تحفّظ کے بعض احکام 375

باب ششم

توہینِ رسالت کی روک تھام کی ممکنہ تدابیر 379

ہمارے فریضے 380

ملکی تدابیر 383

عالمی تدابیر 386

حرفِ آخر 390

ناموسِ رسالت کی تحفّظ کا الٰہی نظام 394

زندہ نبی اور خدا تعالیٰ کا اعلیٰ درجہ کا نبی ﷺ

ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ ﷺ

باب اوّل

وہ آیات جو توہین رسالت کی سزا 'قتل' کے لئے پیش کی جاتی ہیں

*****

قرآن کریم کسی نبی کے شاتم یعنی اس کو گالی دینے والے یا اس کی توہین کے مرتکب کے قتل کے نظریئے کو کلّیۃً رَدّ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو ایسے نظریئے کی حقیقی دلیل کے طور پر پیش کی جا سکتی ہو۔ بنیادی طور پر یہی ایک مضبوط دلیل اور منطقی پہلو ہے جس کے تحت احادیث صحیحہ میں بھی کوئی ایسی روایت نہیں ملتی جس میں یہ مذکور ہو کہ رسول کریم ﷺ نے کسی کو صرف اور صرف سبّ و شتم کی وجہ سے قتل کیا تھا یا کرایا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ بعض لوگ ایسے تھے کہ جن کے دیگر سنگین جرائم انہیں سزاوارِ قتل ٹھہراتے تھے تو انہیں ان جرائم کی پاداش میں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ مگر ایک مرتبہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی کو محض سبّ و شتم کی وجہ سے سزائے موت سنائی گئی تھی یا اسے قتل کیا گیا تھا۔ یہ ایک نہایت واضح اور حقیقت افروز مطالعہ ہے جو جملہ حقائق و دلائل کے ہمراہ آئندہ ابواب میں پیش ہو گا۔

چونکہ توہینِ رسالت کی سزا کے لئے قتل کی تعلیم قطعی طور پر قرآن کریم میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا جو آیت کریمہ بھی اس نظریئے کے قائلین اپنے مؤقف کو ثابت کرنے کے لئے پیش کرتے ہیں وہ دُور کی کوڑی لاتے ہیں۔ کیونکہ عبارۃ النّص اور دلالۃ النّص تو کیا ایسا نظریہ اشارۃ النّص سے بھی ہر گز ثابت نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ اپنے وحشیانہ نظریات کے تحت ان آیات کے ایسے مفہوم نکالتے ہیں جن کو قرآن کریم واضح طور پر ردّ کرتا ہے اور اسوۂ رسول ﷺ کا ان سے دور

کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پس قطعی طور پر یہ ایک غلط موقف ہے جسے قائلین ِ قتلِ شاتم قرآن کریم سے کسی طور پر بھی ثابت کر سکے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی مشکل یہ ہے کہ چونکہ وہ یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ یہ سزا ایک شرعی حیثیت رکھتی ہے اس لئے کسی نہ کسی طور پر وہ اسے قرآنِ کریم سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے اوّل طور پر جس آیت سے استدلال پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ:

”وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ‌ ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ‌ ؕ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ“

(سورۃ التوبہ: 61) کہ ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو نبیؐ کو اذیت پہنچاتے ہیں، تکلیفیں دیتے ہیں اور کہتے ہیں هُوَ أُذُن کہ یہ تو ہر وقت سننے کا کان بنا ہوا ہے۔ یعنی لوگوں کی چغلیاں سنتا اور ان پر عمل کرتا اور ان پر ایمان لاتا ہے اور یکطرفہ باتیں سن کر ان کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ یہ کفّار اور منافقوں کے خیالات ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ وہ کان تو ہے مگر بھلائی کی باتوں پر کان دھرتا ہے۔ وہ ایسا کان ہے جو تمہاری بھلائی کا کان ہے۔ تمہارے لئے شرّ کی بات کو قبول نہیں کرتا۔ تمہاری خیر کی بات کو قبول کرنے والا ہے۔ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وہ اللہ پر ایمان لاتا ہے اور مومنوں کے لئے ایمان رکھتا ہے۔ یعنی مومنوں کی سچی باتیں سنتا ہے۔ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ اور وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لائے ہیں ان کے لئے مجسّم رحمت ہے۔ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ اور وہ لوگ جو اللہ کے رسول کو اذیت دیتے ہیں۔ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہ آیت ہے جو اوّل طور پر پیش کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے والوں پر عذابِ الیم کی تلوار لٹکا دی گئی ہے۔ اس سے وہ بچ نہیں سکتے۔ان کا موقف یہ ہے کہ اس آیت میں عذابِ الیم سے مراد یہ ہے کہ اذیّت دینے والے جس کسی کے بھی ہاتھ لگیں وہ انہیں قتل کر دے۔یعنی قتل کرنے والا خود ان پر عذابِ الیم بن کر ٹوٹے۔ حالانکہ اس آیت سے یا قرآن کریم میں کسی بھی مقام پر مذکور الفاظ ' لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ' سے یہ نتیجہ کسی طرح بھی اخذ نہیں ہوتا کہ کسی شاتم کی گردن مارنا کسی فرد پر دینی فرض ہے۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ایذاء پہنچانے کا ذکر تو واضح طور پر موجود ہے اور ایسا کرنے والوں کو دردناک عذاب کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔ مگر اس آیت میں یا اس کے سیاق و سباق میں دنیا میں اس ایذاء دہی کی سزا کے کسی قانون کا ذکر نہیں ہے۔نہ ہی شاتم کو قتل کرنے کا اشارہ تک موجود ہے۔ پھر یہ بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایذاء دینے والوں کے لئے اس آیت کے تحت کوئی سزا تجویز نہیں فرمائی۔نہ ہی بعد میں خلفائے راشدین ؓ یا دیگر صحابہ ؓ نے انہیں کوئی سزا دی۔تو یہ آیت پیش کر کے یہ کہنا کہ اس سے شاتمِ رسول ؐ کے قتل کا ایسا قانون وضع ہوتا ہے کہ ہر کوئی آزاد ہے کہ کوئی کسی بھی شخص کو شاتم قرار دے کر اسے قتل کر دے، درست نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی خبریں قرآن کریم میں کثرت کے ساتھ تحریر ہیں۔ خاص طور پر 'عذاب الیم 'کی وعید بھی قرآن کریم میں متعدد گناہوں پر بیسیوں کی تعداد میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ تمام کجیاں خواہ وہ عقائد سے تعلق رکھتی ہوں یا اعمال سے، اللہ تعالیٰ کے حضور ناپسندیدہ ہیں اور وہ ان سب کجیوں کے ذکر کے بعد کسی نہ کسی عذاب کی خبر دیتا ہے۔ لیکن ایک بات ہر جگہ بالکل واضح اور فیصلہ شدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کسی انسان کو کوئی اجازت

نہیں دی کہ وہ کسی کے عقائد کی بناء پر کسی کو سزا دے۔ اس کی ایک مثال بھی قرآن کریم میں موجود نہیں ہے۔ باقی جہانتک بعض مخصوص بد اعمال، جرائم کا یا معاملات کا تعلق ہے، تو شریعت نے ان پر مخصوص سزائیں مقرر فرمائی ہیں۔ جن کی تخصیص و تعیین خود رسول اللہ ﷺ نے فرما دی ہے۔ جہانتک رسول اللہ ﷺ کی توہین و تنقیص یا اذیّت پر کسی قسم کی سزا کا تعلق ہے تو شریعت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لئے شریعت نے کسی فرد یا افراد کے لئے یہ جائز نہیں کیا کہ وہ کسی کو از خود عذاب دے اور قتل کرے۔ اس اصول کو رسول اللہ ﷺ نے بڑی وضاحت اور تاکید کے ساتھ اور سخت وعیدِ شدید کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

” اِنَّ اللّٰہَ یُعَذِّبُ الَّذِیۡنَ یُعَذِّبُوۡنَ النَّاسَ فِی الدُّنۡیَا۔“ (مسلم کتاب البرّ و الصّلۃ والآداب باب الوعید الشّدید......) کہ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو عذاب دے گا جو اس دنیا میں لوگوں کو عذاب دیتے ہیں۔ یہاں امام مسلمؒ نے آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد پر ” اَلۡوَعِیۡدُ الشَّدِیۡدُ“ کا عنوان باندھا ہے۔ یعنی جو کسی کو اس دنیا میں عذاب دیتے ہیں ان کے لئے یہ ایک شدید خوف دلانے والی بات ہے۔ اس انذار سے بغیر کسی ابہام کے واضح ہے کہ اس دنیا میں کسی کو عذاب دینا ممنوع ہے اور اس نہی کی خلاف ورزی کر کے خود اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مورد بننے کی واضح جسارت ہے۔ اسلام نے ملکی اور ریاستی قوانین تفصیل کے ساتھ وضع فرمائے ہیں۔ ان کی خلاف ورزی پر مخصوص سزائیں بھی تجویز فرمائی ہیں اور ان کا نفاذ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ پس ان سے تجاوز کر کے اور آگے بڑھ کر قانون اپنے ہاتھ میں لینا اسلام نے کسی کے لئے جائز قرار نہیں دیا۔

انتہائی افسوسناک بات ہے کہ انسان کو تکالیف اور عذابوں سے بچانے والا اور جب سے دنیا بنی ہے انسانی خون کا سب سے بڑا محافظ جو قدم قدم پر انسان کو انسان ہی کے ظلم سے محفوظ

رکھنے کے اقدام کرتا ہے، اسی پر یہ لوگ نعوذ باللہ یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ ﷺ کسی کی گالی پر فوراً اس کے قتل کا حکم دیتا تھا اور اگر اتفاق سے کبھی وہ ﷺ حکم نہیں بھی دیتا تھا تو بھی صحابہؓ ایسے شخص کو قتل کر دیتے تھے اور وہ ﷺ اس سے خوش ہو جاتا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ازلی ابدی سچائی یہ ہے کہ وہ رحمۃٌ للعٰلمین ﷺ تو انسان کے ساتھ ماں سے بھی بڑھ کر رحم کے جذبات رکھتا تھا۔ ؎

آں ترحّمہا کہ خلق از وے بدید کس نہ دیدہ در جہاں از مادرے

جو رحم اور رحمت لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے دیکھی وہ اس دنیا میں کسی نے اپنی ماں سے بھی نہ پائی تھی۔

اس مذکورہ بالا زیرِ بحث آیت میں اور مجموعی طور پر بھی قرآن کریم میں جس 'عذاب الیم 'کا ذکر ہے ،وہ کافروں، منافقوں، مرتدّوں، متکبّروں، آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں، حد سے بڑھنے والوں، اللہ کے سوا کسی اور چیز کی عبادت کرنے والوں۔ ملحدوں، ظالموں وغیرہ کے لئے بار بار استعمال ہوا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جن کے لئے یہ وعید بالتاکید موجود ہے، وہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ارد گرد تھے۔ وہ بھی اسی معاشرے میں مسلسل اپنی کارروائیاں کرتے پھرتے تھے۔ مگر اس آیت میں مذکور اذیت دینے والوں سمیت وہ تمام افراد جن کے ساتھ 'عذاب الیم 'کی وعید منسلک کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے کسی ایک کو بھی اس جرم کی سزا نہیں دی۔ بلکہ اسے جرم بھی قرار نہیں دیا۔

لہٰذا اس آیت میں مذکور 'عَذَابٌ اَلِیْمٌ' کی وجہ سے اگر توہین کرنے والے یا اذیت دینے والے کی سزا قتل قرار پاتی ہے تو دیگر آیات میں مذکور باقی سب لوگوں کی سزا بھی تو "عذاب الیم" بیان ہوئی ہے۔ وہاں اس سے قتل مراد کیوں نہیں لی جاتی۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ایک ہی

وعید سے ایک جگہ معنے اور لئے جائیں اور دوسری جگہ اور۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام میں سے کسی ایک کو بھی اس لفظ کی وجہ سے ہلاک نہیں کیا گیا یا اس کی ہلاکت کی اجازت نہیں دی گئی۔ جب عملاً ایسا نہیں ہوا اور واقعۃً ایسا نہیں کیا گیا تو پھر توہین کے مرتکب کو قتل کرنے کی دلیل کیا ٹھہری؟ اس آیت کو پیش کرنے کا جواز کیا ہوا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ محض ظلم و خونریزی کی باتیں ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو بدنام کرنے کی گندی اور ذلیل کوششیں ہیں۔

مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ایک آیت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ

"إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَاباً مُّهِيْناً۔" (الاحزاب:58) کہ وہ لوگ جو اللہ اور رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر اس دنیا میں بھی لعنت کی گئی اور آخرت میں بھی لعنت کی گئی اور ان کے لئے ذلیل کرنے والا، رسوا کن عذاب مقدّر ہے۔

قائلینِ قتلِ شاتم اس آیت سے استنباط کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تو رسول اللہ ﷺ کو اذیّت دینے والوں کو عذاب دے گا مگر یہ آیت دنیا میں بھی تو لعنت کی بات کرتی ہے۔ لہٰذا یہاں انہیں یہ اختیار ہے کہ وہ کسی پر بھی ایسا الزام لگا کر اسے قتل کر دیں۔ پھر عملاً یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دنیا میں یہ خود ان توہین کرنے والوں پر اللہ کی لعنت بن کے برسیں گے۔ یعنی وہ لعنت یہ لوگ خود ہیں جو توہین کرنے والوں پر برستی ہے۔ اس بارے میں قرآن کریم میں جب ہم راہنمائی تلاش کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جس طرح 'عذاب الیم' کئی طرح کے مجرموں کے لئے آیا ہے اسی طرح لعنت کا محاورہ بھی اس میں عام ہے۔ یہود میں سے نبیوں کی مخالفت کرنے والوں اور بدعہدوں کے متعلق بھی کثرت سے ہے کہ ان پر بار بار لعنت پڑتی رہی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اور نبیوں کی زبان سے بھی۔ دنیا میں بھی ان پر غضب نازل ہوا

اور آخرت میں بھی ہو گا۔ مگر اس کا یہ نتیجہ تو کسی طور بھی اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم ان قائلین قتلِ شاتم کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ہر یہودی کو جہاں دیکھیں قتل کر دیں۔ قرآن کریم میں لعنت کا لفظ ایک ہی معنٰی و مفہوم میں آیا ہے۔ اس کا جو معنی ایک آیت میں ہے وہی دوسری جگہ بھی ہے۔ کسی جگہ بھی اس کے معنوں میں کسی کے لئے یہ اختیار داخل نہیں ہے کہ کوئی کسی پر الزام لگا کر اسے قتل کر دے۔ پس اس آیت کو قتلِ شاتم کے لئے پیش کرنا کسی منطق، کسی فلسفے اور کسی دلیل کے مطابق درست نہیں۔

اذیّت اور اس پر ردّ عمل

ان آیات کو قرآن کریم کی دیگر آیات کی روشنی میں اگر دیکھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ کو پہنچائی گئی اس اذیت پر آپؐ کا اور آپؐ کے صحابہؓ کا ردّ عمل کیا تھا؟ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تعلیم پر کس طرح عمل کیا؟ اور مومنوں کو اس بارہ میں کیا کرنا چاہئے وغیرہ امور بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”لَتُبْلَوُنَّ فِيْ أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوتُوْا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ أَشْرَكُواْ أَذًى كَثِيْراً وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الأُمُوْرِ“ (ال عمران: 187)ترجمہ: تم ضرور اپنے اموال اور اپنی جانوں کے معاملے میں آزمائے جاؤ گے اور تم ضرور ان لوگوں سے جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور ان سے جنہوں نے شرک کیا، بہت اذیتناک باتیں سنو گے۔ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یقیناً یہ ایک بڑا باہمّت کام ہے۔

یہ آیت ان لوگوں کی پیش کردہ اوپر والی آیات کا واضح اور جامع جواب ہے کہ جب بھی تم اذیت کی باتیں سنو تو تمہارا ردّ عمل اور تمہارا شیوہ یہ ہونا چاہئے کہ صبر کو تھامو اور تقویٰ

اختیار کرو۔ کسی کو قتل کرنا ہمّت اور بہادری نہیں ہے بلکہ اصل ہمت اور بہادری اور بڑا پن یہ ہے کہ تم صبر کرو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ غیر مبہم، بڑی واضح اور انتہائی روشن تعلیم ہے اور ایک زبردست حکمتِ عملی ہے جو مخالفوں، منافقوں، مشرکوں اور اہلِ کتاب کی ہرزہ سرائی اور زبان درازی کے ردِّ عمل کے طور پر مومنوں کو سکھائی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور صحابہؓ کی ساری زندگی گواہ ہے کہ انہوں نے اس تعلیم پر صد فی صد عمل کیا اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم اور تعلیم کی کسی رنگ میں بھی نافرمانی نہیں کی۔ پھر اللہ تعالیٰ مزید ارشاد فرماتا ہے:

”وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفَى بِاللّٰهِ وَكِيْلاً“

(الاحزاب:49) ترجمہ: کافروں اور منافقوں کی اطاعت نہ کر اور ان کی ایذارسانی کو نظر انداز کر دے۔ اور اللہ پر توکل کر اور اللہ ہی کارساز کے طور پر کافی ہے۔

دَعْ اَذَاهُمْ کے معنے کیا ہیں؟ یہی کہ ان کی اذیت کو چھوڑ دے۔ اسے نظر انداز کر دے۔ اسے محسوس نہ کر۔ اس سے صرفِ نظر کر۔ معلوم ہوتا ہے کہ قائلین قتلِ شاتم نے یہ آیت پڑھی نہیں یا ان کا خیال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نعوذ باللہ اپنے پیارے ربّ کی اس نصیحت پر عمل نہیں کیا؟

یہ آیت سورۃ الاحزاب کی ہے جس کا نزول 5 سے 8 ہجری تک ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ابتدائی سورتوں میں بھی یہی تعلیم موجود ہے۔ عملاً قائلینِ قتل شاتم کا خیال یہ قرار پاتا ہے کہ ایک طرف یہ تعلیم مسلسل نازل ہو رہی ہے اور دوسری طرف نعوذ باللہ آپؐ اس تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں فرما رہے اور نہ صبر فرماتے ہیں بلکہ مسلسل قتل و خون کا حکم دیتے چلے جا رہے

ہیں۔ کیا یہ لوگ یہ اسوہ پیش کر رہے ہیں رحمۃٌ للعالمین ﷺ کا؟ کیا یہ لوگ خدا تعالیٰ کے سب سے پیارے نبی ﷺ کے بارے میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپؐ اللہ تعالیٰ کے نافرمان تھے؟ پس یہ ہیں وہ "اپنے ہی دوست" جو کمین گاہ میں چھپ کر تمام دنیا کے محسن ﷺ پر تیر چلاتے ہیں۔ چنانچہ اگر گھر کے رکھوالے ہی اس طرح کے چور نکلیں تو پادری فانڈر، پادری عماد الدّین اور سلمان رشدی جیسوں کو کس طرح الزام دیا جاسکتا ہے؟

رسول اللہ ﷺ کو اذیّت

مذکورہ بالا آیت کریمہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَى طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِيْنَ إِنَاهُ وَلَكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ۔ إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ يُؤْذِيْ النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِيْ مِنكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعاً فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ وَمَا كَانَ لَكُمْ أَن تُؤْذُوا رَسُولَ اللّٰهِ وَلَا أَن تَنكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِن بَعْدِهِ أَبَداً إِنَّ ذَلِكُمْ كَانَ عِندَ اللّٰهِ عَظِيماً" (الاحزاب:54) ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو سوائے اس کے کہ تمہیں کھانے کی دعوت دی جائے مگر اس طرح نہیں کہ اس کے پکنے کا انتظار کر رہے ہو لیکن (کھانا تیار ہونے پر) جب تمہیں بلایا جائے تو داخل ہو اور جب تم کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور وہاں (بیٹھے) باتوں میں نہ لگے رہو۔ یہ (چیز) یقیناً نبی کے لئے تکلیف دہ ہے مگر وہ تم سے (اس کے اظہار پر) شرماتا ہے اور اللہ حق سے نہیں شرماتا۔ اور اگر تم اُن (ازواجِ نبی) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ یہ تمہارے اور ان کے دلوں کے لئے زیادہ پاکیزہ (طرزِ عمل) ہے۔ اور

تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ اور نہ ہی یہ جائز ہے کہ اس کے بعد کبھی اُس کی بیویوں (میں سے کسی) سے شادی کرو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے۔

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو مسلمان تھے۔ اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ ان کے اس مذکورہ بالا رویّے سے بھی رسول اللہ ﷺ کو اذیّت پہنچتی تھی۔ اگر بقول قائلین قتلِ شاتم اذیّت کی وجہ سے قتل واجب ہوتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ نے ان سب کو قتل نہ کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ؟ پھر فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ آذَوْا مُوسٰى فَبَرَّأَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهاً (الاحزاب:70) ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! ان لوگوں کی طرح نہ ہو جنہوں نے موسیٰ کو تکلیف پہنچائی۔ پس اللہ نے اُسے اُس سے بَری کر دیا جو انہوں نے کہا اور اللہ کے نزدیک وہ وجیہ تھا۔

اس آیت میں جن مومنوں کا ذکر ہے جو کسی نافہمی یا نادانستہ طور پر رسول اللہ ﷺ کے لئے اذیت کا موجب بنے تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو انہیں قتل کرنے کی تعلیم نہیں دی تھی بلکہ انہیں ایک قسم کی سرزنش کی تھی کہ وہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جنہوں نے پہلے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اذیّت دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کے لئے کسی اور گرفت یا سزا وغیرہ کا کوئی ارشاد نہیں فرمایا۔

اللہ تعالیٰ پہلے انبیاءؑ کا اور ان کی اُمّتوں کا ذکر کر کے حکایۃً بیان فرماتا ہے کہ انہوں نے بھی مخالفوں کی اذیتوں کے مقابلے میں ان میں سے کسی کو قتل نہیں کیا بلکہ اخلاق کے اعلیٰ تقاضوں کے تحت اسی صبر اور توکل کا ذکر کیا ہے انبیاءؑ نے انہیں جس کی تلقین فرمائی تھی۔ یہی

صبر اور توّکل تھا جو انبیاءؑ اور ان پر ایمان لانے والوں کی حقیقی طاقت تھا۔ انسانوں کو قتل کرنا کبھی بھی انبیاءؑ کا مقصود و مطلوب نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ انسانوں کی ہلاکت کے لئے نہیں، ان کو بقا عطا کرنے کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ وہ ان کے لئے زحمت نہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت لے کر آتے ہیں۔ وہ خود قربانیاں پیش کر کے دوسروں کو زندگیاں عطا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اور ان کے پیروکار ہر اذیّت برداشت کرتے ہوئے اپنے مخالفین کو یہی کہتے ہیں کہ

”وَمَا لَنَا أَلاَّ نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَى مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ“ (ابراہیم:13) ترجمہ: اور ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ پر توکل نہ کریں جب کہ اس نے ہماری راہوں کی طرف (خود) ہمیں ہدایت دی ہے۔ اور ہم یقیناً اس پر صبر کریں گے جو تم ہمیں تکلیف پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر پھر چاہیئے کہ توکل کرنے والے توکل کریں۔

یہ آیت کھول کھول کر منادی کر رہی ہے کہ صبر سے اور اللہ تعالیٰ پر توکّل سے بہتر اور کوئی چیز نہیں جو اذیّتوں کا مداوا کر سکے۔ قرآن کریم بتا رہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم وہ ہے جو اس نے سب نبیوں اور ان کے ماننے والوں کو دی ہے۔ چنانچہ پہلے نبیوں کی امّتیں بھی اسی الٰہی سنّت کے مطابق اذیّتوں پر صبر کرتی تھیں اور ان کی بقا کا نسخہ بھی یہی صبر اور توکّل تھا۔ رسول اللہ ﷺ چونکہ انبیاءؑ کی تمام حسین اور خوبصورت تعلیموں کے جامع تھے۔ لہٰذا آپؐ کا صبر اور توکل بھی دیگر انبیاءؑ کے مقابل پر بیحد زیادہ، وسیع اور جامع تھا۔ قرآن کریم میں ان گزشتہ حکایات کو بیان کرنے کا اصل مقصود یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیروکار اور امّتی بھی بدرجہ اولیٰ ہر اذیّت پر صبر کے اعلیٰ نمونے دکھائیں اور اللہ تعالیٰ پر انتہائی توکل کریں۔ مگر افسوس ہے کہ آج کے نام نہاد امّتی ہیں کہ اس سنہری تعلیم کو اپنے خوں آشام ارادوں کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ بات بات پر بے صبری دکھاتے ہیں اور مومنانہ سنّتِ توکّل سے منحرف ہیں۔

قرآن کریم میں دیگر انبیاءؑ اور ان کے متبعین کی اذیّتوں کا بھی ذکر کثرت سے موجود ہے جو اُن کے مخالفوں نے انہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے صبر کا بھی ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس صبر کی وجہ سے ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی مدد آئی۔ فرمایا:

''وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُواْ عَلَى مَا كُذِّبُواْ وَأُوذُواْ حَتَّى أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلاَ مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ وَلَقدْ جَاءكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِيْنَ ''(الانعام:35) ترجمہ: اور یقیناً تجھ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے گئے تھے اور انہوں نے اس پر کہ وہ جھٹلائے گئے اور بہت اذیت دیئے گئے، صبر کیا یہاں تک کہ ان تک ہماری مدد آ پہنچی۔ اور اللہ کے کلمات کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں اور یقینا تیرے پاس مرسلین کی خبریں آچکی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑا واضح طور بتایا ہے کہ کسی کو قتل کرنے سے نہیں بلکہ اذیّتوں پر صبر اختیار کرنے سے اللہ کی مدد اترتی ہے۔ نیز تنبیہہ فرمائی کہ یہی ذریعہ ہے اللہ کی مدد کے مستحق بننے کا کہ تکذیب اور اذیّتوں پر صبر کرو۔ وَلاَ مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ یہ وہ طریق ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی تبدیلی نہیں فرمائی۔

حیرت ہے کہ اس واضح تعلیم کو ترک کر کے قتل و غارت گری کے طریقوں کو کیوں اپنایا جاتا ہے۔ بلکہ یہاں تک ظلم کیا جاتا ہے کہ اس کشت و خون کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ آپؐ ہر قسم کی قربانی کر کے دوسروں کو سکھ پہنچانے کی کوشش فرماتے تھے۔ ان کی بھلائی کے لئے اپنی جان کو گویا ہلاکت تک پہنچا دیتے تھے۔ آپؐ کو تعلیم یہ تھی کہ

" كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْراً لَّهُم مِّنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ o لَن يَّضُرُّوكُمْ إِلاَّ أَذًى وَإِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الاَدُبَارَ ثُمَّ لاَ يُنصَرُونَ o(ال عمران: 111،112)ترجمہ: تم بہترین امّت ہو جو تمام انسانوں کے فائدہ کے لئے نکالی گئی ہو۔ تم اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو یہ ان کے لئے بہت بہتر ہوتا۔ ان میں مومن بھی ہیں مگر اکثر ان میں سے فاسق لوگ ہیں۔ وہ تمہیں ایک طرح کی اذیت کے سوا ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر وہ تم سے قتال کریں گے تو ضرور تمہیں پیٹھ دکھا جائیں گے۔ پھر وہ مدد نہیں دیئے جائیں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ امّت کا منصب اور اس کا لائحۂ عمل یہ بیان فرماتا ہے کہ تم لوگوں کی خیر خواہی اور بھلائی کے لئے نکلے ہو۔ ان کی مدد اور ان کے فائدے کے لئے نکلے ہو۔ ان کو نقصان پہنچانا یا ان کا قتل و خون کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ تم انہیں ہلاک کرنے کے لئے نہیں نکالے گئے۔ کیونکہ تمہارے مخالف تمہیں صرف کچھ اذیت ہی دے سکتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ غلبۂ اسلام سے متعلق تقدیرِ الٰہی میں کسی صورت میں بھی روک نہیں بن سکتے۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور غلبہ صبر اور توکل کرنے والے مومنوں ہی کا مقدّر ہے۔ لہٰذا ان کی طرف سے اذیّت پر قتل و غارت کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی تمہیں اس کی کوئی تعلیم دی گئی ہے۔ بلکہ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ان کو معاف کرو اور ان کی بھلائی کرو اور ان کے لئے ہدایت کی راہیں واضح اور کشادہ کرو تا وہ ہدایت پا کر اللہ تعالیٰ کے دین کے معاون و مددگار بنیں۔

ایک اور آیت

حسبِ ذیل آیت کریمہ بھی گستاخِ رسولؐ کے قتل کی سزا کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔

''أَلَمْ يَعْلَمُوٓاْ أَنَّهُۥ مَن يُحَادِدِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَأَنَّ لَهُۥ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ذَٰلِكَ ٱلْخِزْيُ ٱلْعَظِيمُ''(التوبہ:63)ترجمہ: کیا انہیں علم نہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کرتا ہے تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ لمبا عرصہ رہنے والا ہے۔ وہ بہت بڑی رسوائی ہے۔

اس کے ساتھ وہ یہ آیت بھی منسلک کرتے ہیں:

''إِنَّ ٱلَّذِينَ يُحَآدُّونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥٓ أُوْلَٰٓئِكَ فِى ٱلْأَذَلِّينَ''(المجادلہ:21) کہ یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہی انتہائی ذلیل لوگوں میں سے ہیں۔

وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سزا 'جہنّم کی آگ' اور 'بہت بڑی رسوائی' اس وقت تک لاگو نہیں ہوگی جب تک ایسے شخص کو وہ خود قتل نہ کر دیں۔ حالانکہ اس آیت کو یا اس کے الفاظ کو جس رُخ سے بھی پرکھ لیں، اس میں کسی جگہ کوئی شائبہ تک موجود نہیں کہ شاتم رسولؐ کی توہین کے مرتکب کو قتل کیا جائے۔ اس آیت میں تو ایسے لوگوں کی جزاء جہنّم قرار دی گئی ہے اور ذلّت ورسوائی کی وعید دی گئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ خود یہ رہنمائی فرماتا ہے کہ اس کی اور اس کے رسول ﷺ سے دشمنی کرنے والوں کی یہ ذلّت ورسوائی ان کے قتل سے نہیں، ان کے مغلوب ہونے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس سے اگلی آیت میں فرماتا ہے:

"كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ" (المجادلہ:22) کہ اللہ نے لکھ چھوڑا ہے کہ ضرور میں اور میرے رسول غالب آئیں گے۔ یقیناً اللہ بہت طاقتور اور کامل غلبے والا ہے۔

ان آیات میں قتل و غارت کی بجائے اتنا جواب دے دیا کہ ایسی گستاخی کرنے والے خود انتہائی ذلیل ہونے والے ہیں۔ یہ ذلّت ان کے قتل کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس قانون کی وجہ سے ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے غالب آجانے کی وجہ سے ہے۔ اس کے نتیجے میں ان دشمنوں کی شکست اور نکبت ان کے مذموم ارادوں میں نامرادی کے باعث ساری دنیا کے سامنے ان کی ذلّت کا مبیّنہ ثبوت ہے۔ یہ ذلّت ان کے قتل سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ پس قرآن کریم کی پیش فرمودہ واضح اور غیر مبہم تعلیمات کے ہوتے ہوئے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ احکامِ شریعت سے اور رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھ کر خود ظالمانہ احکام مرتب کرے۔

لفظ 'یُحَادِد' کے معنے و مفہوم

قرآن کریم کی سب سے مستند اور جامع لغت کے مصنّف حضرت امام راغبؒ نے یُحَادِد کے معنے اللہ اور رسولؐ کے مخالف کے بیان فرمائے ہیں۔ اس مخالفت کو یُحَادِد یا یُحَادُّون کے الفاظ سے بیان کرنا یا تو روکنے کے اعتبار سے ہے یا اَلْحَدِیْد (یعنی لوہے) کے استعمال سے یعنی جنگ کی وجہ سے۔

پھر امام راغبؒ اَلْحَدّ کے معنے یہ لکھتے ہیں: "اَلْحَاجِزُ بَيْنَ الشَّيْئَيْنِ الَّذِيْ يَمْنَعُ اِخْتِلَاطَ اَحَدِهِمَا بِالْآخَرِ" کہ دو چیزوں کے درمیان ایسی روک جو اُن کو باہم ملنے سے روک

دے۔ پھر وہ لکھتے ہیں: ''حَدُّ الشَّیْئِ۔ اَلْوَصْفُ الْمُحِیْطُ بِمَعْنَاہُ اَلْمُمَیِّزُ لَہُ عَنْ غَیْرِہٖ'' کہ کسی چیز کا وہ وصف جو اسے دوسروں سے ممتاز کر دے۔

ان معنوں میں اس زیرِ بحث آیت کا مفہوم انتہائی خوبصورت رنگ میں نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ مخالفوں کی جھوٹی اور ظالمانہ مخالفت اور دشمنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی سچائی کو مزید ممتاز اور روشن کر دیتی ہے۔ان کی مخالفت اور دشمنی ہی دراصل ان کی ناکامی، ذلّت اور موت ہے۔ان کی یہ دشمنی ہی حقیقت میں ایک حدِّ فاصل بن جاتی ہے۔جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو معزّز و ممتاز کر دیتی ہے۔

یہاں دوسرے معنے بھی بالکل واضح ہیں کہ اگر کوئی دشمنی کی بنا پر ظاہری ہتھیاروں سے حملہ کرے اور لوہے یعنی تیغ و تفنگ کا استعمال کرے تو اس کے دفاع میں لوہے کی یہ چیزیں استعمال کرنی ضروری ہو جاتی ہیں۔رسول اللہ ﷺ کا یہ دفاع بھی آپؐ کو دشمنوں پر غالب اور ممتاز کر دے گا۔

یہاں مدّ نظر رہے کہ یُحَادِد عربی کے قواعد کے مطابق مفاعلہ کا صیغہ ہے۔ صیغے کی اس شکل میں مقابلے کا مفہوم بنیادی طور پر شامل ہوتا ہے۔یعنی اگر وہ ہتھیار اٹھائیں تو مقابل پر تمہیں بھی ہتھیار اٹھانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اگر یہ صورتحال واقع ہو تو بھی اللہ اور اس کا رسولؐ غالب رہیں گے۔ دشمنوں کے اٹھائے ہوئے ہتھیار ہی ان کی دشمنی روکنے کا موجب بن جائیں گے۔یہ وہ عام منظر ہے جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کی تمام زندگی میں نظر آتا ہے کہ آپؐ کے دشمنوں نے ہتھیار اٹھائے تو وہ ان کے اپنے ہی قلع قمع کا موجب بن گئے۔اس سارے منظر کا گالی گلوچ یا توہین رسالت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پس اس آیت کو ہزار بار بھی پڑھا جائے تب بھی اس کا کوئی ایک لفظ اشارۃً یا کنایۃً یہ نشاندہی نہیں کرتا کہ توہینِ رسولؐ کے مرتکب کو قتل کیا جائے۔ نہ ہی کسی طور پر اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ پر سبّ و شتم کرے تو لوگوں کو اختیار ہے کہ اسے قتل کر دیں۔

ایک اور جگہ مومنوں کو جہاد سے روکنے والوں کا ذکر ہے اور ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے "سَلَقُوكُم بِأَلْسِنَةٍ حِدَادٍ" (الاحزاب:20) کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ وہ تیز زبانوں سے تمہیں ایذاء پہنچاتے ہیں۔ اس آیت کو اگر مذکورہ بالا آیت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو پھر یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ زیر بحث آیت میں یُحَادِد سے مراد تیز کاٹنے والی زبانوں کے زخم ہیں یعنی وہ گالی گلوچ، ہرزہ سرائی، غیبت اور توہین وغیرہ سے یہ زخم لگاتے ہیں۔ مگر ان سخت الفاظ کے ذکر کے باوجود اللہ تعالیٰ انہیں قتل کرنے کی کوئی سزا تجویز نہیں فرماتا۔ پس یہ ایک ظلم ہے جو توہین رسالت یا شتمِ رسولؐ یا گستاخِ رسولؐ کو قتل کرنے کے دعویداروں کی طرف سے اللہ تعالیٰ پر، رحمۃٌ للعالمین ﷺ پر اور اسلام پر روا رکھا جاتا ہے۔

الغرض رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں کے لئے جس جہنم کی آگ، اس میں بہت لمبا عرصہ رہنے، نیز بڑی رسوائی وغیرہ کلمات کا یہ معنیٰ یا مطلب نکالا گیا ہے کہ انہیں قتل کرنے کا اختیار ہر اَیرے غَیرے کو مل جاتا ہے، ایک قطعی جھوٹا اور انتہائی ظالمانہ معنیٰ اور مطلب ہے۔ اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا بذاتِ خود آپؐ کی توہین ہے اور آپؐ کی طرف ایک گھناؤنا ظلم منسوب کرنا ہے۔ جسے ہر سچا مسلمان دل و جان سے ردّ کرتا ہے۔

ایک خوبصورت تعلیم

انبیاءؑ کے مخالف یا ان کی جماعتوں میں شامل ہونے والے منافق ہمیشہ ہی ان کی تکذیب اور تنقیص کرتے رہے ہیں۔ اس پہلو سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے مخالف یا منافق بھی کوئی الگ طرز کے نہیں تھے۔ وہ آپؐ کو اذیّتیں بھی دیتے تھے، آپؐ کی تکذیب بھی کرتے تھے اور آپؐ کے خلاف جھوٹی باتیں کرنے اور اذیّت ناک باتیں تراشنے میں بھی پیش پیش تھے۔ انہیں قتل کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو یہ ہدایت فرمائی کہ جہاں بھی تکذیب، تنقیص، توہین اور استہزاء والی ایسی باتیں ہوں وہاں سے وہ اٹھ آیا کریں تا کہ کسی جھگڑے یا دنگے فساد کا موقع پیدا ہو کر بات قتل و خون تک نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

”وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ إِنَّكُمْ إِذاً مِّثْلُهُمْ إِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِيْنَ وَالْكَافِرِيْنَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيْعاً“(النساء:141)ترجمہ : اور یقیناً اس نے تم پر کتاب میں یہ حکم اتارا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے یا ان سے تمسخر کیا جا رہا ہے تو اُن لوگوں کے پاس نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔ ضرور ہے کہ اس صورت میں تم معاً اُن جیسے ہی ہو جاؤ۔ یقیناً اللہ سب منافقوں اور کافروں کو جہنّم میں اکٹھا کرنے والا ہے۔

اس آیت میں کسی شاتم یا توہین کے مرتکب کو قتل کرنے یا اس سے لڑنے جھگڑنے کی کوئی تعلیم، ہدایت یا نصیحت نہیں ہے۔ بلکہ اپنے جذبات اور اپنی غیرت کی قربانی کر کے اس مجلس سے اُٹھ آنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ مکرّر فرمایا:

”وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُل لَّسْتُ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ o لِّكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَ o وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُواْ فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ط وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلاَ تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ“ (الانعام:67 تا69)

ترجمہ: اور تیری قوم نے اس کو جھٹلا دیا ہے حالانکہ وہی حق ہے۔ تو کہہ دے کہ میں تم پر ہرگز نگران نہیں ہوں۔ ہر پیش خبری کا ایک وقت اور ایک جگہ مقرر ہے اور عنقریب تم جان لوگے۔ اور جب تو دیکھے اُن لوگوں کو جو ہماری آیات سے تمسخر کرتے ہیں تو پھر ان سے الگ ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تجھ سے اس معاملہ میں بھول چوک کروادے تو یہ یاد آجانے پر ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھ۔

رسول اللہ ﷺ کی تکذیب یعنی آپؐ کو نعوذ باللہ جھوٹا قرار دینا توہین سے بھی شدید تر ہے۔ مگر اس کے باوجود آیت میں مذکور تعلیم ہے جو توہین کے مقابل پر اور اس کے ردّ عمل کے طور پر ہے۔ یہ تعلیم ہے جو امنِ عامہ کی ضامن ہے۔ جو قتل و خون میں مانع ہے۔ جو دشمنوں کو بھی دوستوں میں بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔ چونکہ نبی کے کاموں میں سے ایک بڑا کام انسان کو قتل و غارت سے بچانا اور اسے امن و سلامتی میں لے کر آنا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ خود بھی یہی نمونہ دکھاتا ہے اور اپنے متبعین کو بھی ہر طرح کے جسمانی یا جذباتی جبر و تشدّد پر عفو و درگزر اور صبر و استقامت اور معاف کرنے کے ایسے اسلوب سکھاتا ہے کہ

” وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ “(الشوریٰ:44) کہ جو صبر کرے اور بخش دے تو یقینا یہ اُولوالعزم باتوں میں سے ہے۔

* * * *

آیات جو صبر کی اور توہین کرنے والے سے عفوو در گزر،

اعراض اور صرفِ نظر کی تعلیم دیتی ہیں

* * * * *

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کثرت کے ساتھ ایسی تعلیم اتاری ہے کہ جس میں مومنوں کو ہر قسم کی مشکلات، تکالیف، ایذا، جبر و تشدّد پر صبر اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف لانے، انسانیت کے شرف کو قائم کرنے اور انسان کو ہلاکتوں سے بچانے کا نام ہے۔ اس کے لئے مومنوں کو ہر قسم کی قربانی دینے کی تلقین فرما کر انہیں اجرِ عظیم کا وارث ٹھہرایا ہے۔ اس کے بر عکس بات بات پر توہین و تنقیص کا مدّعا کھڑا کر کے قتل و ہلاکت اور کشت و خون سے بار بار منع فرمایا ہے۔ چنانچہ درجِ ذیل آیات قرآنیہ انہی تعلیماتِ خداوندی کی آئینہ دار ہیں۔ یہ تعلیمات رسول اللہ ﷺ کے اور آپؐ کے پیروکاروں کے صدق و صفا اور صبر و عفا جیسے اخلاقِ حسنہ کی بھی منہ بولتی داستانیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ“ (القصص:56) ترجمہ : اور جب وہ کسی لغو بات کو سنتے ہیں تو اس سے اعراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ تم پر سلام ہو۔ ہم جاہلوں کی طرف رغبت نہیں رکھتے۔

اس آیت میں ہرزہ سرا اور لغو گو جاہلوں کو قتل کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ان سے صرفِ نظر کی تعلیم دی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے پسندیدہ مومنوں کا نمونہ پیش فرماتا ہے اور بتاتا

ہے کہ ان کا طریق ہے کہ جب وہ کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو ایسا کرنے والوں سے نہ صرف اعراض کرتے ہیں بلکہ اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑتے ہیں۔ان کے لئے سلامتی کی دعا کرتے ہیں اور ایسی جہالت کے مرتکبوں سے بے رغبتی اختیار کرتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ قتل وغارت کی بجائے دعوت الی اللہ، نیک اعمال کی بجا آوری، برائی کو نیکی اور بدی کو احسن سے دفع کرتے ہوئے صبر کی تلقین فرماتا ہے کہ

" وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّن دَعَا إِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحاً وَقَالَ إِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ O وَلَا تَسْتَوِيْ الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ O وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيْمٍ (حٰم السجدہ:34 تا 36) ترجمہ: اور بات کہنے میں اس سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک اعمال بجالائے اور کہے کہ میں یقیناً کامل فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ نہ اچھائی برائی کے برابر ہو سکتی ہے اور نہ برائی اچھائی کے (برابر)۔ ایسی چیز سے دفاع کر کہ جو بہترین ہو۔ تب ایسا شخص جس کے اور تیرے درمیان دشمنی تھی وہ گویا اچانک ایک جاں نثار دوست بن جائے گا۔ اور یہ مقام عطا نہیں کیا جاتا مگر اُن لوگوں کو جنہوں نے صبر کیا۔ اور یہ مقام عطا نہیں کیا جاتا مگر اُسے جو بڑے نصیب والا ہے۔

کیسی خوبصورت تعلیم ہے کہ بُرائی کرنے والے کے مقابل پر صرف بُرائی سے پرہیز کرنے کی تلقین نہیں کی گئی، بلکہ اس کے مقابل پر حسنہ یعنی نیکی اور احسن طریق اختیار کرنے کی رغبت دلائی ہے۔ پھر اس کے نتیجے میں دشمن کے دوست بننے کی ضمانت بھی دی ہے۔ یہی اسلام کی تعلیم کا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف لانے کے لئے انسانوں کو اور ان کی زندگیوں کو محفوظ رکھا جائے اور انہیں دعوت و تبلیغ کے ذریعے، اچھی باتوں اور نیک نمونے کے ذریعے اسلام کی

طرف راغب کیا جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں کے ایک متشدّد طبقے نے اس انتہائی خوبصورت تعلیم کو ردّ کر کے پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نام پر، رسول اللہ ﷺ کے نام پر اور قرآن و اسلام کے نام پر قتل و غارت اور دہشت گردی اختیار کرتے ہوئے دنیا کو اس حسین اور دلکش مذہب سے متنفر کر دیا ہے۔ اگر یہی لوگ اس پاک اور دلربا الٰہی تعلیم پر عمل کر کے بُرائی کو نیکی سے اور سیّئہ کو حسنہ میں بدلنے کی سعی کرتے اور رحمۃٌ للعٰلمین ﷺ کی عفوو رحمت سے لبریز پاک سیرت دنیا کے سامنے پیش کرتے تو یقیناً آج دنیا مسلمانوں سے چھلک رہی ہوتی۔ اسلام اعتراضات، نفرتوں اور دشمنیوں سے محفوظ ہوتا اور سیّد المطہّرین ﷺ کی ذاتِ پاک وبابرکات پر گند اچھالنے والے نہ ہونے کے برابر ہوتے۔

اللہ تعالیٰ کفریہ باتوں اور کفریہ اعمال سے حفاظت کی ضمانت اور تسلّی دیتے ہوئے یہ بھی فرماتا ہے:

” يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لاَ يَحْزُنكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُونَ فِيْ الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُواْ آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِن قُلُوبُهُم.......لَهُمْ فِيْ الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ “

(المائدہ:42) ترجمہ : اے رسول! تجھے وہ لوگ غمگین نہ کریں جو کفر میں تیزی سے بڑھ رہے ہیں، یعنی وہ جو اپنے مونہوں سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے تھے....... ان کے لئے اس دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بہت بڑا عذاب مقدّر ہے۔

شاتمِ رسولؐ کے قتل کے قائل کہتے ہیں کہ گالی دینے سے شاتم کافر ہو جاتا ہے اس لئے اسے قتل کرنا واجب ہے۔ مگر یہ آیت کہتی ہے کہ جو کفر کرتا ہے اس کا کفر تمہیں کسی غم و حزن میں نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے اس کے بارے میں کسی فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ اگر

خود ایسی مضبوط اور حتمی ضمانت فراہم کرتا ہے تو پھر کسی شاتم و گستاخِ رسولؐ کے قتل کی تعلیم کے کوئی معنے نہیں ہیں۔

اس آیت میں بھی دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب کی وعید ہے۔ خِزْیٌ یعنی رسوائی کے معنے کسی طور پر بھی قتل کے نہیں ہیں۔یعنی اس دنیا میں ایسے لوگ جو کفر کرتے ہیں، محض رسوائی اور ذلّت ہی اٹھاتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کا کفر، آپؐ کی مخالفت اور گستاخی کر کے وہ خود اپنے ہی ہاتھوں دنیا میں اپنی عزّت و تکریم کا جنازہ اٹھا چکے ہوتے ہیں۔روحانی اور معاشرتی لحاظ سے گویا وہ ایک طرح مر چکے ہوتے ہیں۔انہیں جسمانی طور پر مارنے کی کوئی تعلیم نہیں ہے۔اس کے ساتھ جس عذاب کی تقدیر ان کے لئے منسلک ہے وہ بھی آخرت کا عذاب ہے۔ الغرض اس آیت سے بھی قطعی فیصلہ یہی قرار پاتا ہے کہ گستاخِ رسولؐ کے قتل کا عقیدہ ایسا ہے کہ جسے قرآن کریم کلّیۃً ردّ فرماتا ہے۔پھر اللہ تعالیٰ اسی نوع کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے بیان فرماتا ہے:

”وَلاَ يَحْزُنكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُونَ فِيْ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَن يَّضُرُّواْ اللّٰهَ شَيْئاً يُرِيْدُ اللّٰهُ أَلاَّ يَجْعَلَ لَهُمْ حَظّاً فِيْ الآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ٥إِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُاْ الْكُفْرَ بِالإِيْمَانِ لَن يَّضُرُّواْ اللّٰهَ شَيْئاً وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ٥وَلاَ يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ أَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنفُسِهِمْ إِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُواْ إِثْماً وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ٥(ال عمران: 177 تا179) ترجمہ : اور تجھے دکھ میں نہ ڈالیں وہ لوگ جو کفر میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔یقیناً وہ ہر گز اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔اللہ یہ چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا کچھ بھی حصہ نہ رکھے۔اور ان کے لئے بہت بڑا عذاب (مقدّر) ہے۔یقیناً وہ لوگ جنہوں نے ایمان کے بدلے کفر خرید لیا وہ ہر گز اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔اور ان کے لئے بہت دردناک عذاب (مقدّر) ہے۔اور ہر گز وہ لوگ گمان

نہ کریں جنہوں نے کفر کیا کہ ہم جو انہیں مہلت دے رہے ہیں یہ ان کے لئے بہتر ہے۔ ہم تو انہیں محض اس لئے مہلت دے رہے ہیں تا کہ وہ گناہ میں اور بھی بڑھ جائیں۔ اور ان کے لئے رُسوا کر دینے والا عذاب (مقدّر) ہے۔

یعنی ایسے لوگ جو کفر اختیار کرنے میں جلدی کرتے ہیں انہیں اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے تا کہ وہ مہلت سے فائدہ اٹھائیں اور کفر و گناہ کو ترک کریں۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے۔ ان کے اس منفی طرزِ عمل پر اللہ تعالیٰ پھر منطقی نتیجے کا ذکر فرماتا ہے کہ بالآخر وہ گناہوں میں بڑھ جاتے۔ مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس آیت میں بھی انہیں قتل کرنے کی کوئی تعلیم نہیں ہے بلکہ ڈھیل اور مہلت دینے کا حکم ہے تا کہ ان پر ہر رنگ اور پہلو سے حجت تمام ہو جائے۔ پس یہ تعلیم قتلِ شاتم میں واضح طور پر مانع ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان آیات میں تسلسل کے ساتھ عذابِ عظیم، عذابِ الیم اور عذابِ مہین کا ذکر ہے۔ مگر ان کے قتل اور ان کی گردنیں مارنے وغیرہ الفاظ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ عملاً بھی کوئی واقعہ ایسا رونما نہیں ہوا کہ ان کو قتل کیا گیا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے والوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ رکھا تھا۔ چنانچہ آپؐ کی پاک سیرت اور اسلام کی روشن تاریخ بتاتی ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی قتل نہیں کیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی باتوں کو توڑنے مروڑنے والے

رسول اللہ ﷺ کی باتوں کو بگاڑنا، ان کو مختلف معنے پہنانا اور انہیں تضحیک کا نشانہ بنانا وغیرہ وغیرہ ایسے فعل ہیں جن کی بنیاد واضح گستاخی پر استوار ہے۔ اس گستاخی میں وہ ساری ساری رات بھی گزار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود انہیں قتل کرنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ بلکہ ایسے

گستاخوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ آپؐ کو صرف یہی تعلیم دیتا ہے کہ ان سے اعراض کرو اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھو۔ ان سے اللہ تعالیٰ خود نپٹے گا۔ کسی انسان کو ان کے قتل کی اجازت نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا'' (النساء:82) ترجمہ : اور وہ (محض منہ سے) 'اطاعت' کہتے ہیں ! پھر جب وہ تجھ سے الگ ہوتے ہیں تو اُن میں سے ایک گروہ ایسی باتیں کرتے ہوئے رات گزارتا ہے جو اس سے مختلف ہیں جو تُو کہتا ہے۔ اور اللہ ان کی رات کی باتوں کو احاطہ تحریر میں لے آتا ہے۔ پس ان سے اِعراض کر اور اللہ پر توکّل کر اور اللہ کارساز کے طور پر کافی ہے۔

اس آیت میں انہی لوگوں کا ذکر ہے جو وہ رسول اللہ ﷺ پر بہتان باندھتے ہیں۔ آپؐ کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو آپؐ نے کی نہیں ہوتیں۔ آپؐ کی توہین و تنقیص کی یہ ایک واضح جسارت ہے جس کے وہ مرتکب ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ان سے اعراض یعنی رُخ موڑنے اور صرفِ نظر کی تلقین فرماتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی فرماتا ہے:

''وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ'' (الحجر: 86) ترجمہ : اور ساعت ضرور آنے والی ہے۔ پس بہت عمدہ طریق پر درگزر کر۔

قرآن کریم مجرموں کو قتل کرنے کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ فیصلے کی گھڑی کی بات فرماتا ہے کہ جب وقت آئے گا تو لازماً ان کا فیصلہ ہو گا۔ اس سے پہلے ان سے بہت عمدہ طریق پر درگزر

کرنے کی تلقین فرماتا ہے۔ پھر قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کو داروغگی سے روکتا ہے اور نصیحت کرنے کی تلقین کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ o لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ o إِلَّا مَن تَوَلَّىٰ وَكَفَرَ o فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ o إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ o ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم'' (الغاشیہ:22 تا27) ترجمہ: پس بکثرت نصیحت کر۔ تُو محض ایک بار بار نصیحت کرنے والا ہے۔ تُو ان پر داروغہ نہیں۔ ہاں وہ جو پیٹھ پھیر جائے اور انکار کر دے۔ تو اُسے اللہ سب سے بڑا عذاب دے گا۔ یقیناً ہماری طرف ہی اُن کا لَوٹنا ہے۔ پھر یقیناً ہم پر ہی اُن کا حساب ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کس وضاحت سے فرماتا ہے کہ عذاب دینا اس کا کام ہے۔ منہ پھیر لینے والے اور کفر اختیار کرنے والے کے عذاب کو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اسے جب رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں بھی نہیں دیا تو کسی اور کو یہ اختیار کس طرح مل سکتا ہے؟ پس یہ دعویٰ کہ جو توہینِ رسولؐ کا مرتکب ہو اسے قتل کیا جا سکتا ہے یا اسے کوئی بھی یہ سزا دے سکتا ہے منافیٔ قرآن دعویٰ ہے۔

یہاں یہ بات بھی مدّ نظر رکھنی چاہیئے کہ اسلام جرائم کی روک تھام اور امنِ عامہ کے قیام کے لئے حدود و تعزیرات کا ایک مکمل اور جامع نظام پیش فرماتا ہے۔ لیکن اس نظام میں کسی جگہ بھی جذبات کے مجروح ہونے کی کوئی سزا نہیں رکھتا۔ بلکہ مہذّب دنیا کے بھی کسی قانون میں ایسی سزا نہیں ہے۔ جیسا کہ قارئین آئندہ صفحات میں دیکھیں گے کہ قرآن کریم کسی کی طرف سے جذبات کی انگیخت پر یا جذبات مجروح کرنے پر ہمیشہ اعراض، صبر اور توکل پر خاص زور دیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے:

"فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلاَغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ"(الرعد:41) ترجمہ:تو(ہر صورت) تیرا کام صرف کھول کھول کر پہنچا دینا ہے اور حساب ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی پیغام دیا ہے کہ حساب لینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ یہ کسی اور کے اختیار میں نہیں دیا گیا۔ کوئی اسلام کا انکار کر کے کفر اختیار کرے یا سبّ و شتمِ رسولؐ کی وجہ سے کافر قرار دے دیا جائے(جیسا کہ بعض مفتی کہتے ہیں کہ شتمِ رسولؐ سے کفر لازم آتا ہے)،اس کے قتل کا کسی کو اختیار نہیں دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے لفظ"عَلَيْكَ"استعمال فرما کر ایسے شخص کو احسن رنگ میں پیغام پہنچانا فرض قرار دیا ہے اور کفر سے باز نہ آنے والے یا پیغام کو ردّ کر دینے والے کے حساب کا ذمہ اپنے پر لیا ہے۔ اس واضح اور جامع ارشادِ باری تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ کسی کا حساب اپنے ذمہ لے کر اس پر کفر کا فتوٰی دے اور اسے واجب القتل قرار دے۔

زبان کے زخم

کہتے ہیں کہ زبان کے زخم نیزوں کے زخموں سے زیادہ گہرے اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِئَامٌ وَلَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَتْ لِسَانٗ

کہ نیزوں کے لگائے ہوئے زخم تو مندمل ہو جاتے ہیں مگر زبان کے لگائے گئے زخم کا اندمال نہیں ہے۔

لوگوں کی ایذا رساں باتوں، بہتانوں، سبّ و شتم اور توہین و تنقیص کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر بڑی وضاحت کے ساتھ تعلیم نازل فرمائی ہے۔ بار بار اور کھول کھول کر یہ تلقین فرمائی ہے کہ ایسا جرم کرنے والوں کی سزا اللہ تعالیٰ خود دے گا۔ کسی کو جبر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہاں! انہیں قرآن کریم کے ذریعے تذکیر و تبلیغ کا ارشاد کرتے ہوئے فرمایا:

”نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ“

(ق:46)ترجمہ: ہم اُسے سب سے زیادہ جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور تُو ان پر زبردستی اصلاح کرنے والا نگران نہیں ہے۔ پس قرآن کے ذریعہ اُسے نصیحت کرتا چلا جا جو میری تنبیہہ سے ڈرتا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے کس طرح واضح طور پر کھول کر بیان فرمایا ہے کہ کوئی خواہ کچھ بھی کہے، وہ ان باتوں کی حقیقت کو جانتا ہے۔ وہ ایسی باتیں کرنے والوں پر جبر کرنے سے منع فرماتا ہے۔ پس وہ فرماتا ہے کہ کسی توہین کے مرتکب یا سبّ و شتم کرنے والے کو قتل نہیں کرنا بلکہ اسے قرآن کریم کے مطابق تذکیر و نصیحت کرنی ہے۔ پس اگر کسی کو قتل کر دیا جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی کھلی کھلی نافرمانی ہے۔

شاتم کا جبراً مسلمان ہونا

شاتمِ رسولؐ کے قتل کے قائل بار بار بعض فقہاء کا یہ قول بھی بیان کرتے ہیں کہ اگر شاتم مسلمان ہو جائے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ قائلینِ قتلِ شاتم کے عجیب رنگ ہیں۔ ایک طرف کہتے ہیں کہ جو مسلمان سبّ و شتم کرے وہ کافر ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر شاتم مسلمان ہو جائے تو اسے کچھ نہ کہا جائے گا۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ بہر حال اگر یہ بات ہے کہ شاتم مسلمان ہو جائے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا تو عرض ہے کہ یہ بھی بعض

خاص مکتبِ فکر کے فقہاء کے اپنے فیصلے ہوں گے مگر ہیں واضح طور پر منافیٔ احکامِ الٰہی ۔ کیونکہ اس سے منافق تو پیدا ہو سکتے ہیں، سبّ و شتم کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو شخص اپنی موت کے ڈر سے مسلمان ہو گا، وہ لازماً بنیادی طور پر اپنے اندر نفاق کی جڑیں رکھتا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اسلام قبول کرنے کی کسی جگہ، کسی وقت اور کسی طور پر اجازت دیتا ہے نہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بلکہ واضح طور پر ممانعت فرماتا اور مکمل حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِيْ الاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِيْنَo وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلاَّ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لاَيَعْقِلُوْنَ “

(یونس:100،101) ترجمہ : اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو جو بھی زمین میں بستے ہیں اکٹھے سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو کیا تُو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے۔ حتّٰی کہ وہ ایمان لانے والے ہو جائیں۔ اور کسی نفس کو اختیار نہیں کہ وہ ایمان لائے مگر اللہ کے اِذن کے ساتھ۔ اور وہ ان (کے چہروں) پر جو عقل سے کام نہیں لیتے (ان کے دل کی) پلیدی تھوپ دیتا ہے۔

پس کسی کو کسی بھی بہانے سے جبرًا مسلمان بنانا اسلام کی بنیادی تعلیم کے منافی ہے۔

مومن کا قتل

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں کسی مومن کا قتل گناہِ کبیرہ قرار دیا ہے۔ اس وقت دنیا میں عملاً یہ ہو رہا ہے کہ اس گناہ کے مرتکب متشدّد لوگ کسی پر بھی شتمِ رسولؐ کا جھوٹا الزام دے کر اسے قتل کر دیتے ہیں۔ یہ زمین میں فساد پیدا کرنے اور کشت و خون کے دروازے کھولنے کا کھلا کھلا عمل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی سنّت اور اس کے فرمودات سے واضح

بغاوت ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے اور امرِ واقع بھی یہی ہے کہ کسی کو قتل کرنے کی قرآن کریم نے انتہائی سختی سے ممانعت کی ہے۔ مگر انسانوں اور انسانیت کے دشمن توہینِ رسولؐ کا نام نہاد مسئلہ کھڑا کر کے یہ طریق اختیار کرتے ہیں کہ محض فتنہ پردازی کے سبب کسی کو قتل کر دیتے ہیں اور اس پر یہ الزام دھر دیتے ہیں کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی توہین کی تھی۔ حالانکہ مقتول عملاً آپؐ سے محبت کرنے والا ہوتا ہے۔ یہ ظالمانہ نتیجے ہیں جو ایسے خوفناک منافیٔ اسلام عقیدے کی وجہ سے فی زمانہ کثرت کے ساتھ ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ، اسلام اور قرآن کریم پر بے تحاشہ باتیں اور الزام تراشیاں ہوتی ہیں۔ اس سے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا ہے اور پہنچ چکا ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ مومنوں کو عمداً قتل کرنے کی انتہائی تحدید کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''وَمَن يَقْتُلْ مُؤْمِناً مُّتَعَمِّداً فَجَزَآؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِداً فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً عَظِيْماً''(النساء:94) ترجمہ: اور جو جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ وہ اس میں بہت لمبا عرصہ رہنے والا ہے۔ اور اللہ اس پر غضبناک ہوا اور اس پر لعنت کی، اور اس نے اس کے لئے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں جہنم، غضب، لعنت اور عذاب عظیم وغیرہ تمام سزائیں مذکور ہیں۔ ان کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ قتل کرنے والوں سے سخت اور انتہائی ناراضگی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جب یہ لوگ اذیت والی آیت پر یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ چونکہ وہاں عذاب کا ذکر ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے قتل کیا جانا ضروری ہے۔ وہ اسی دلیل کو یہاں قاتل پر کیوں لاگو نہیں کرتے؟ یہاں تو مزید زور اور سختی سے قتل کرنے والے پر لاگو کرنی چاہئے کیونکہ یہاں جہنم، غضب، لعنت اور عذاب عظیم جیسے شدید

الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ان غضبناک اظہارات کے باوجود قاتلین کو موت کی سزا نہیں دی جاتی۔ بلکہ انہیں الٹا مجاہد اور ہیرو قرار دیا جاتا ہے۔ کیا یہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اور آپؐ کی شریعت کے ساتھ مذاق اور استہزاء نہیں ہے؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے فرمودات اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پُر رحمت سنّت کی توہین نہیں ہے؟ جس کا آج کے خونخوار نام نہاد علماء گلی گلی قریہ قریہ ارتکاب کررہے ہیں۔

سنگین سزاؤں میں بھی معافی کی گنجائش

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محاربت اور فساد و بغاوت ایسے قومی جرم ہیں کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سخت سے سخت سزائیں تجویز فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الاَرْضِ فَسَاداً أَن يُّقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِيْ الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌo إِلاَّ الَّذِيْنَ تَابُواْ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُواْ عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيْمٌ“ (المائدہ 34:،35) ترجمہ: یقیناً اُن لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں یہ ہے کہ انہیں سختی سے قتل کیا جائے یا دار پر چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں دیس نکالا دے دیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں ذلت اور رسوائی کا سامان ہے اور آخرت میں تو اُن کے لئے بڑا عذاب (مقدّر) ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پیشتر توبہ کرلیں کہ تم ان پر غالب آجاؤ۔ پس جان لو کہ اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں مذکورانِ سنگین جرائم کی سزاؤں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے معافی کی بھی مکمل گنجائش رکھی ہے اور اصحابِ مَقدرت کو توبہ قبول کرنے اور معاف کرنے کی رغبت دلائی ہے۔ جب ایسے سنگین ترین جرائم پر بھی اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے اور عفو ودرگزر کی گنجائش رکھتا ہے تو توہینِ رسولؐ جس کی شریعت میں کہیں بھی سزا قتل قرار نہیں دی گئی، کیونکر معافی نہیں ہو سکتی۔ کیونکر ایسے شخص کی توبہ کو قبول نہیں کیاجاسکتا؟ دراصل ظلم وجبر کے رسیا لوگ اپنی وحشتوں کی تسکین کے لئے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے نام پر زمین میں فساد کرتے ہیں اور قتل وخون ان کے مرغوب مشغلے ہیں۔

* * * * *

رؤف ورحیم نبی ﷺ

ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی تو فطرت ہی خیر خواہی اور عفو و رحمت کے خمیر سے اٹھائی گئی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کی گواہی مہیّا کرتے ہوئے فرماتا ہے:

''لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ'' (التوبہ:128) ترجمہ : یقیناً تمہارے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا۔ اسے بہت شاق گزرتا ہے جو تم تکلیف اُٹھاتے ہو (اور) وہ تم پر (بھلائی چاہتے ہوئے) حریص (رہتا) ہے۔ مومنوں کے لئے بے حد مہربان (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا لمحہ لمحہ شاہد ہے کہ آپؐ بنی نوع انسان کے لئے آسانیاں چاہنے اور ان کا انتظام کرنے والے تھے۔ انسان کی مشقّت اور تکلیف آپؐ پر شاق گزرتی تھی۔ اس جذبے ہی کی تجلّی تھی کہ آپؐ کا دامنِ رأفت و رحمت ساری کائنات پر دراز تھا۔ کسی پر سختی کرنا آپؐ کے لئے ناممکن تھا۔ اللہ تعالیٰ مزید ارشاد فرماتا ہے:

''فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ''

(آل عمران:160) ترجمہ: پس اللہ کی خاص رحمت کی وجہ سے تُو ان کے لئے نرم ہو گیا۔ اور اگر تُو تُند خُو (اور) سخت دل ہوتا تو وہ ضرور تیرے گرد سے دُور بھاگ جاتے۔ پس ان سے درگزر کر اور ان کے لئے بخشش کی دعا کر اور (ہر) اہم معاملہ میں ان سے مشورہ کر۔ پس جب تُو (کوئی) فیصلہ کرلے تو پھر اللہ ہی پر توکّل کر۔ یقیناً اللہ توکّل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی نرمی اور عفو درگزر کی شہادت مہیّا فرمائی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کی ہر ادا عفوو درگزر پر استوار رہی ہے۔ان آیات کے ہوتے ہوئے شاتمِ رسول کے قتل کے مدّعی کیا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی ان گواہیوں کو ردّ فرما دیا تھا؟ کیا نعوذ باللہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی ان شہادتوں کو جھٹلا دیا تھا اور ہر موقعے پر قتل و خون کا مظاہرہ کیا تھا؟ ہر گز نہیں۔ خدا کی قسم! ایسا ہرگز نہیں تھا۔ رسول اللہ ﷺ پر قتل و غارت گری کا الزام لگانے والے خود جھوٹے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی گواہی ان کے برعکس ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

’’ وَالَّذِيْنَ إِذَا أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنتَصِرُونَ o وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ‘‘(الشوریٰ:41،40)ترجمہ:اور وہ جن پر جب زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور بدی کا بدلہ، کی جانے والی بدی کے برابر ہوتا ہے۔ پس جو کوئی معاف کرے بشرطیکہ وہ اصلاح کرنے والا ہو تو اس کا اجر اللہ پر ہے۔ یقیناً وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو تعلیم دی اس میں کسی قسم کی زیادتی اور ظلم کا شائبہ تک نہیں۔ مثلاً یہ کہ بدی کا بدلہ اگر چکانا ہے تو اس بدی کے برابر بدلہ لیا جائے۔ حتّٰی کہ جنگوں اور لڑائیوں میں بھی ’’ وَلاَ تَعْتَدُوْا‘‘ کہ زیادتی نہ کرو، کا حکم ہمیشہ غالب رہا۔ آپؐ کو یہ فرمایا گیا کہ بدی کا بدلہ بدی کے برابر ہی ہوگا لیکن اگر عفو اور اصلاح مدّنظر رہے تو وہ زیادہ بہتر ہے۔ ایسی تعلیم رکھنے والے، ایسی تعلیم دینے والے اور اس پر ہمیشہ عمل کرنے اور کرانے والے پر یہ الزام دینا کہ وہ گالی دینے والے کو جب تک قتل نہ کروالیتا تھا اس وقت تک اسے چین نہ آتا تھا، کھلا کھلا بہتان ہے۔

اس زیرِ بحث آیت کا ذکر قبل ازیں مَنۡ یُّحَادِدِ والی آیت میں بھی گزر چکا ہے۔ اِس جگہ صرف اتنی عرض ہے کہ اس میں بدلہ لینے کا بھی ذکر ہے کہ وہ جن پر جب زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ وہ بدلہ کیا ہے؟ اور رسول اللہ ﷺ نے اس بدلے کا کیا نمونہ پیش فرمایا؟ چنانچہ جب ہم آپؐ کی پاک سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ سب کو بیک جنبشِ زبان معاف کر دیا اور دوسرے یہ کہ آپؐ نے نیکیوں، بھلائیوں اور خیر کے کاموں میں ان مخالفوں سے آگے سے آگے بڑھنے کی سعی فرمائی۔ ان کی بہبود کے کاموں میں احسان کے تمام پہلوؤں کو بروئے کار لائے۔ یعنی ظلم کا انتقام عفو، احسانات اور نیکیوں میں سبقت کے ذریعے لیا۔

بار بار تعلیمِ عفو و احسان

درجِ ذیل آیات میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اذیّت دینے والوں، بدزبانی کرنے والوں وغیرہ سے اعراض اور ان کے سبّ و شتم پر بار بار صبر، صرفِ نظر، عفو اور احسان کی تعلیم دی ہے۔ فرمایا:

" وَأَن تَعۡفُوٓاْ أَقۡرَبُ لِلتَّقۡوَىٰ " (البقرہ:238) ترجمہ: اور تمہارا عفو سے کام لینا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

" خُذِ الۡعَفۡوَ وَأۡمُرۡ بِالۡعُرۡفِ وَأَعۡرِضۡ عَنِ الۡجَاهِلِيۡنَ " (الاعراف:200) ترجمہ: عفو اختیار کر اور معروف کا حکم دے اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کر۔

" اَلَّذِيۡنَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡكَاظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ وَالۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ "(اٰل عمران: 135) ترجمہ: (یعنی) وہ لوگ جو آسائش میں بھی خرچ کرتے ہیں

اور تنگی میں بھی اور غصہ دبا جانے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

سبحان اللہ! کیا خوبصورت تعلیم ہے کہ نہ صرف یہ کہ غصّے کو پی جانا ہے بلکہ لوگوں کو معاف کرنا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان پر احسان کرنا ہے۔ یہ نمایاں اور امتیازی کردار ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بار بار پیش فرمایا اور مومنوں میں پیدا فرمایا۔ کیا ایسی تعلیم کوئی اور مذہب پیش کر سکتا ہے؟ کیا ایسی تعلیم ہر اس تلوار، ہر تیر اور ہر خنجر کو کند نہیں کر دیتی جو رسول اللہ ﷺ کے نام پر قتل و غارت کے لئے سونتی گئی ہو۔ کیا قتیلِ عفو و احسان بہتر نہیں ہے مقتولِ تیغ و تفنگ سے؟ لازماً اور یقیناً کشتۂ لطف و کرم بہتر ہے اور لاکھ درجے بہتر ہے۔ پھر قائلین قتلِ شاتم کیوں از راہِ ظلم گھاٹے اور خسارے کا سودا کرتے ہیں۔

" فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُوْلُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِل لَّهُمْ "(الاحقاف:36)ترجمہ: پس صبر کر جیسے اُولوالعزم رسولوں نے صبر کیا اور ان کے بارہ میں جلد بازی سے کام نہ لے۔

اگر دیگر انبیاء اولوالعزم تھے اور دامنِ صبر کو تھامنے والے تھے تو رسول اللہ ﷺ تو ان کے اوصاف کے جامع تھے۔ آپؐ ان سے ہزار گنا بڑھ کر صبّار اور صاحبِ شکیبائی تھے۔ آپؐ ہرگز ہرگز کسی کی بدزبانی پر انگیخت ہونے والے نہیں تھے اور نہ کبھی ہوئے۔

" وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ "(الشوریٰ:44) ترجمہ: اور جو صبر کرے اور بخش دے تو یقینا یہ اُولوالعزم باتوں میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ صبر و حوصلہ اور دوسرے کے گناہ معاف کرنا اور اس کے لئے مغفرت طلب کرنا ایسے کام ہیں جو ترقی و کمال کے زینے ہیں۔ مسلمان اگر ترقی اور عروج حاصل

کر سکتے ہیں تو کشت و خون سے نہیں بلکہ ان اوصاف کے ذریعے جن کی طرف اللہ تعالیٰ ہدایت فرماتا ہے۔

" سَلاَمٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ "(الرّعد:25)ترجمہ: سلام ہو تم پر بسبب اس کے جو تم نے صبر کیا۔ پس کیا ہی اچھا ہے گھر کا انجام۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں سلامتی کا انعام اور آخرت میں اچھے گھر کا وعدہ انہی لوگوں کے لئے ہے جو صبر کرتے ہیں۔ پس یہ تعلیمات اور ہدایات ہیں جو اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے متبعین کو بار بار پیش فرماتا ہے اور ان پر عمل کی بہترین سے بہترین اور اعلیٰ سے اعلیٰ اجر اور انعام کے وعدے کرتا ہے۔

خاص طور پر جراحات اللّسان پر صبر کی تعلیم

درج ذیل آیات ہیں جو خاص طور پر باتوں اور زبان سے لگائے گئے زخموں کے بارے میں سکون افزا، خوبصورت اور دلکش تعلیم پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت عطا فرماتا ہے:

" اصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ذَا الْأَيْدِ إِنَّهُ أَوَّابٌ "(ص:18)

ترجمہ: صبر کر اُس پر جو وہ کہتے ہیں اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر جو بڑی دسترس والا تھا۔ یقیناوہ عاجزی سے بار بار جھکنے والا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت داؤد علیہ السلام کا خاص طور پر ذکر آپؐ کے اقتدار، طاقت اور دسترس کے حوالے سے کیا ہے۔ یعنی باوجود اس کے کہ آپؐ ایسے لوگوں کو جو آپؐ کے لئے صبر کی آزمائش کا موجب تھے، اپنی غیر معمولی طاقت کے ذریعہ ختم کر سکتے تھے۔

مگر آپؐ نے یہ نہیں کیا بلکہ صبر سے ہی کام لیا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو حضرت داؤد علیہ السلام کی مثال پیش فرمائی اور طاقت کے استعمال کی بجائے صبر کی تلقین فرمائی۔ پھر فرمایا:

" فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ "(ق:40،41) ترجمہ: پس صبر کر اس پر جو وہ کہتے ہیں اور اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ (اُس کی) تسبیح کر سورج کے طلوع سے پہلے اور غروب سے پہلے بھی۔ اور رات کے ایک حصہ میں بھی اس کی تسبیح کر اور سجدوں کے بعد بھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں لوگوں کی طرف سے توہین و تنقیص کا ردّ عمل یہ سکھایا ہے کہ اس پر صبر کرنا ہے اور صبح و شام اور دن رات اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کرنی ہے۔ کوئی غم و غصہ نہیں دکھانا۔ کسی قسم کا جبر و جارحیت کا مظاہرہ نہیں کرنا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی تمام عمر شاہد ہے کہ آپؐ اس تعلیم پر ہر دم اور ہر لمحہ عمل پیرا تھے۔

یہی مذکورہ بالا تعلیم درجِ ذیل آیت میں دوبارہ پیش فرمائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید انسان کے اندر سکینت اور رضا کی شمع روشن کرتی ہے:

" فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَى "(طٰہٰ:131) ترجمہ: پس جو وہ کہتے ہیں اس پر صبر کر اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر۔ سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے نیز رات کی گھڑیوں میں بھی تسبیح کر اور دن کے کناروں میں بھی تا کہ تو راضی ہو جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ بدزبانوں کی دشنام دہی اور بدزبانی پر ایک اور ہدایت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

" وَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْراً جَمِيْلاً "(المزمّل:11)ترجمہ:اور صبر کر اُس پر جو وہ کہتے ہیں اور اُن سے اچھے رنگ میں جدا ہو جا۔ یہ اسی تعلیم کا دوسرا رُخ ہے جو گزشتہ صفحات میں سورۃ النساء کی آیت 141 میں بیان کیا گیا ہے کہ "فَلَاتَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتَّى يَخُوضُوا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهِ"کہ اُن لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ یہاں تک کہ وہ اس کے سوا کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔

یعنی لڑائی جھگڑے اور مار کٹائی کی بجائے پہلو تہی کرتے ہوئے اس مجلس سے اچھے طریق پر اٹھ آنا چاہئے۔اس قدر ضبط و احتیاط کی لاثانی تعلیم دنیا میں کہیں نہیں مل سکتی۔کیونکہ جب عقائد اور ایمان کے جذبات جھوٹی باتوں اور باطل کلام کے ذریعے مجروح کئے جارہے ہوں تو صبر و ضبط کے بندھن ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جذبات کی ایسی انگیخت کے وقت ہجرِ جمیل یعنی اچھے طریق پر جدا ہونا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن امنِ عامہ کے قیام اور مخالفوں کو شرمندہ اور اسلام کی تعلیم کی طرف مائل کرنے پر مجبور کرنے کے لئے یہ ایک مجرّب نسخہ ہے جو ہمیشہ کارگر رہاہے۔ یہ نسخہ رسول اللہ ﷺ کو عطا کیا گیا اور آپؐ نے اسے ہر جگہ آزمایا اور اپنے متبعین کو اسے بروئے کار لانے کی تلقین فرمائی۔

عام طور پر معاف کرنے، صرفِ نظر کرنے اور مغفرت کی دعا کرنے کی تعلیم

ذیل میں وہ آیات درج کی جارہی ہیں جن میں بالکل واضح الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کو اور آپؐ کے متبعین کو عفو و درگزر، غلطیاں معاف کرنے، دعا کرنے اور احسان کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَإِن تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“ (التغابن:15) ترجمہ: اور اگر تم عفو سے کام لو اور درگزر کرو اور معاف کر دو تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

”وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ“ (النور:23)

ترجمہ: پس چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں بخش دے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

یعنی معاف کرنے اور درگزر کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مغفرت منسلک ہے۔ اسی کی تلاش کے لئے اللہ تعالیٰ مومنوں کو بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کی مغفرت کی تلاش میں جلدی کرو اور اپنی موت سے پہلے اسے حاصل کرو۔

”فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ“ (المائدہ:14) ترجمہ: پس ان سے درگزر کر اور صرفِ نظر کر۔ یقیناً اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

”فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ“ (البقرہ:110)

ترجمہ: پس (اُن سے) عفو سے کام لو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ ظاہر کر دے۔ یقیناً اللہ ہر چیز پر جسے وہ چاہے دائمی قدرت رکھتا ہے۔

ہمارا ایمان ہے بلکہ ہر سچے مسلمان کا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کو اپنے جوارح، اپنے اعمال، اپنے اقوال، اپنے دل اوراپنی روح پر جاری فرمایا۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ نے تو یہ گواہی مہیّا فرمائی تھی کہ آپؐ کا خُلق قرآن پر استوار تھا۔ مگر حضرت انس بن مالکؓ آپؐ کی زندگی کے آخری لمحات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میں نے آپؐ کے چہرے کو دیکھا تو وہ گویا قرآن کا ایک ورق تھا۔ (ابن سعد ذکر امر رسول اللہ أبا بکر أن یصلّی بالناس فی مرضہ و ابن کثیر)

یہ پاک، رحیم و کریم، عفوّ و رؤف ذات تھی، جس نے اپنے ربّ میں جذب ہو کر اس کے ایک ایک حکم، ایک ایک تعلیم اور ایک ایک اشارے کی پورے کمال اور حسن و خوبی کے ساتھ تعمیل کی۔ اس نے انہی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ہر قسم کے گالی گلوچ، بدزبان بدگو ملزم یا مجرم کو معاف کیا۔ کسی کو قتل کی سزا نہیں دی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍوَ بَارِکْ وَ سَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

*****

يٰا رَبِّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ دَائِمًا

فِی هٰذِهِ الدُّنْيَا وَ بَعْثٍ ثَانٍ

باب دوم

ان روایات پر محاکمہ جو قتلِ شاتم وگستاخِ رسولؐ کے قائل اپنے موقف میں پیش کرتے ہیں

*****

اس باب میں مختلف کتب سے ایسی روایات لے کر ان پر حقیقت افروز بحث کی گئی ہے جو شتم و توہینِ رسولؐ کے قتل کی دلیل کے طور پر متفرق مصنّفین نے پیش کی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اِکّادُکّا روایات ایسی ہیں جنہیں اس لئے ترک کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی اندرونی خود تضادی و خود تردیدی اور پراگندگی کی شکار اور بے حوالہ و بے بنیاد ہیں۔ ان کے وضعی اور جعلی ہونے کی وہ خود ثبوت ہیں۔ مگر یہ روایات جو اس باب میں زیرِ بحث لائی گئی ہیں، وہ ہیں جو توہینِ رسالت کی سزا قتل کے قائل اس مسئلے میں بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان میں سے بھی بعض وہ ہیں جو واضح طور پر وضعی ہیں، بعض ایسی ہیں جن سے استدلال غلط کیا گیا ہے اور بعض ایسی ہیں جو کسی طرح بھی سبّ و شتم کے مسئلے میں نہیں لی جاسکتیں۔ مگر انہیں گھسیٹ کر اس مسئلے میں لایا گیا ہے۔ بہر حال ذیل میں رُخِ اسلام سے خون کے دھبوں کی صفائی، رسول اللہ ﷺ کی رحیم و کریم ذات کے ناموس کی حفاظت اور آپؐ کی پاک ذات کو آپؐ کی طرف منسوب کئے گئے جھوٹے خون سے پاک کرنے کے لئے ہر روایت پر دلائل اور وجوہات کے ساتھ تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

گستاخ و شاتمِ رسولؐ کے قتل کے سلسلے میں عموماً پہلے جو مثالیں یا دلیلیں پیش کی جاتی ہیں وہ دو یہودی سرداروں، کعب بن اشرفؔ اور دوسری ابو رافعؔ کی ہیں۔ تاریخ کے مستند ریکارڈ سے واضح ہے کہ یہ دونوں وہ یہودی لیڈر تھے جو اپنے اموال خرچ کر کے انفرادی طور پر بھی لوگوں کو اور عرب قبائل کو بھی اسلام کے خلاف بھڑکانے اور جنگ کے لئے انگیخت کرنے میں پیش پیش تھے۔

یہاں یہ مدّ نظر رہے کہ وہ زمانہ آج کے زمانے کی طرح نہیں تھا کہ جہاں منظّم، مستحکم اور معیّن حکومتیں قائم تھیں۔ نہ ایک حکومت کا دائرہ خاص طور پر ایک مخصوص رقبے یا علاقے پر جغرافیائی حدود میں منضبط تھا اور اس کے ساتھ ایک دوسری حکومت کا دائرہ ایک اور جغرافیائی حدود سے محدود و معیّن تھا۔ بلکہ اُس زمانے میں عرب سب قبائل و اقوام کا ایک مشترک ملک تھا۔ اس ملک میں علاقائی تقسیمیں بھی سیاسی و علاقائی تقسیمیں نہیں تھیں۔ بلکہ وہ محض قبائلی اور قومی تقسیمیں تھیں جو حکومتوں کے درمیان کوئی جغرافیائی یا نظریاتی حدیں نہیں کھینچتی تھیں۔ عرب میں سب ایک دوسرے کے حلیف بن کر باہمی دوستیوں کے معاہدوں اور دشمنوں کے خلاف اکٹھے اور متحد ہونے کے معاہدوں کی صورت میں رہتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانے میں اگر کوئی عہد شکنی کی جاتی تھی تو جس کے خلاف عہد شکنی کی جاتی تھی اسے بھی تمام اخلاقی اور مروّجہ قانونی بنیادوں کے تحت حق تھا کہ وہ اس کی سزا مقرر کرے یا عملاً سزا دے۔ اس کے اس حق پر کسی کو کوئی اعتراض کا حق نہیں تھا۔

آنحضرت ﷺ نے ان دونوں مذکورہ بالا سرغنوں کی مختلف سازشوں اور محاربانہ کارروائیوں کو انتہاء تک برداشت کیا۔ مگر وہ تھے کہ اسلام کے خلاف اپنی سازشوں میں کسی مقام پر رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ یہاں کوئی بھی انصاف پسند اگر تجزیہ کرے تو وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ

دنیا کے کسی بھی قانون کے تحت ان پر محاربت اور بغاوت کی فردِ جرم عائد ہوتی تھی۔ لہٰذا ان دونوں کے قتل کو آنحضرت ﷺ کی شان میں گستاخی یا آپؐ پر سبّ و شتم کے نتیجے میں قتل قرار دینا، حد سے بڑھی ہوئی حماقت ہے اور دشمنان اسلام کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے والی بات ہے۔ اس اجمالی بیان کے بعد اب ذیل میں ان واقعات کا فرداً فرداً محاکمہ پیش ہے۔

یہاں ایک وضاحت یہ بھی پیشِ خدمت ہے کہ آئندہ صفحات میں امام ابن تیمیہ کی طرف منسوب کتاب "الصارم المسلول علیٰ شاتمِ الرّسولؐ" کے حوالے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ یہ حوالے یا اقتباس اس کتاب سے لئے گئے ہیں جو ادارہ الدّرر السّنیۃ نے انٹرنیٹ پر مہیّا کی ہے۔ ہم نے صفحات کے ساتھ ابواب اور ذیلی عناوین کا حوالہ بھی دیا ہے تا کہ عبارت ڈھونڈھنے میں مشکل نہ ہو۔

*****

1: کعب بن اشرفؔ

مدینے کے ایک یہودی کعب بن اشرف کے قتل کے واقعے کو اس موقف کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ شتمِ رسولؐ یا توہینِ رسالت کی سزا قتل ہے۔ کیونکہ اسے اسی جرم کی سزا کے طور پر قتل کیا گیا تھا۔

اس واقعے کا پس منظر اور تفصیل یہ ہے کہ جنگ بدر میں اسلام کی فتح نے مدینے کے یہودیوں کی دلی عداوت کو پوری طرح ظاہر کر دیا تھا۔ مدینے کے یہودی قبیلے بنو قینقاع کی مبیّنہ فتنہ پردازیوں اور سرکشیوں کی وجہ سے انہیں وہاں سے جلا وطن کیا گیا۔ ان کی یہ جلاوطنی بھی مدینے کے دوسرے یہودی قبائل کو نہ عبرت دلا سکی اور نہ ہی انہیں اصلاح کی طرف مائل کر سکی۔ لہٰذا وہ اپنی شرارتوں اور فتنہ پردازیوں میں ترقی کرتے گئے۔ چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ سازشوں اور فتنہ پردازیوں کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

کعب گو مذہباً یہودی تھا لیکن یہودی النسل نہ تھا، بلکہ باپ کی طرف سے عرب تھا۔ اس کا باپ اشرفؔ قبیلہ بنو نبہان کا ایک ہوشیار اور چلتا پرزہ آدمی تھا جس نے مدینے آکر بنو نضیر کے ساتھ تعلقات پیدا کئے۔ وہ ان کا حلیف بن گیا اور بالآخر اس نے ان میں اتنا اقتدار اور رسوخ پیدا کر لیا کہ قبیلہ بنو نضیر کے رئیسِ اعظم ابو رافع بن ابی الحُقَیق نے اپنی لڑکی اُسے رشتے میں دے دی۔ (ابن ہشام، مقتل کعب بن اشرف۔ دار الکتب العلمیّہ، بیروت۔ ایڈیشن 2001ء) اسی لڑکی کے بطن سے کعب پیدا ہوا جس نے بڑے ہو کر اپنے باپ سے بھی بڑھ کر رتبہ حاصل کیا۔ حتیٰ کہ بالآخر اُسے یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ عرب کے یہودی اسے اپنا ایک سردار قرار دیتے تھے۔ کعب ایک قادر الکلام شاعر، نہایت دولت مند آدمی اور وجیہہ و شکیل شخص تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی قوم کے علماء اور دوسرے ذی اثر لوگوں کو اپنی مالی فیاضی سے اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ (زرقانی، قتل کعب بن

الاشرف، دار الکتب العلمیّہ، بیروت) مگر اخلاقی نقطۂ نگاہ سے وہ نہایت گندے اخلاق کا آدمی تھا اور خفیہ چالوں اور ریشہ دوانیوں کے فن میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنے والی ہے کہ آنحضرت ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو کعب بن اشرف نے دوسرے یہودیوں کے ساتھ مل کر اُس معاہدے میں شرکت کی جو آنحضرت ﷺ اور یہود کے درمیان باہمی دوستی اور امن وامان اور مشترکہ دفاع کے متعلق تحریر کیا گیا تھا۔(زرقانی، قتل کعب بن الاشرف، دار الکتب العلمیّہ، بیروت۔) لیکن حقیقت یہ ہے کہ کعب کے دل میں ایک طبعی منافقت اور حسد کی وجہ سے اندر ہی اندر بغض وعداوت کی آگ سلگنے لگی تھی۔ اس نے خفیہ چالوں اور مخفی ساز باز سے اسلام اور بانی اسلام ﷺ کی مخالفت شروع کر دی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ کعب ہر سال یہودی علماء ومشائخ کو بہت سی مالی معاونت کرتا تھا۔ آنحضرت ﷺ کی مدینے ہجرت کے بعد جب یہ لوگ اپنے سالانہ وظائف لینے کے لئے اس کے پاس گئے تو اس نے باتوں باتوں میں اُن کے پاس آپؐ کا ذکر شروع کر دیا اور اُن سے آپؐ کے متعلق مذہبی کتب کی بناء پر رائے دریافت کی۔ اُنہوں نے بتایا کہ بظاہر تو یہ وہی نبی معلوم ہوتا ہے جس کا ہمیں وعدہ دیا گیا تھا۔ کعب اس جواب پر بہت بگڑا اور اس نے انہیں سخت سست کہہ کر وہاں سے رخصت کر دیا اور جو مالی امداد وہ انہیں دیا کرتا تھا، وہ نہ دی۔ یہودی علماء کی جب روزی بند ہوئی تو کچھ عرصے کے بعد پھر کعب کے پاس گئے اور کہا کہ ہمیں علامات کے سمجھنے میں غلطی لگ گئی تھی۔ ہم نے دوبارہ غور کیا ہے دراصل محمد (ﷺ) وہ نبی نہیں ہے جس کا وعدہ دیا گیا تھا۔ اس جواب سے کعب کا مطلب حل ہو گیا اور اس نے خوش ہو کر ان کو سالانہ امداد دے دی۔ (زرقانی، قتل کعب بن الاشرف، دار الکتب العلمیّہ، بیروت) یہ تو محض ایک مذہبی مخالفت تھی جو چنداں قابل اعتراض نہیں ہو سکتی تھی اور نہ اس بناء پر کعب کو زیر الزام سمجھا جا سکتا تھا۔ مگر اس کے بعد

رسول اللہ ﷺ کے خلاف کعب کی مخالفت زیادہ خطرناک اور عملی صورت اختیار کرتی گئی اور بالآخر جنگ بدر کے بعد تو اس نے ایسا رویّہ اختیار کیا جو سخت مفسدانہ اور فتنہ انگیز تھا اور جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے لئے نہایت خطرناک حالات پیدا ہو گئے۔

اصل بات یہ تھی کہ بدر سے پہلے کعب یہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کا یہ جوشِ ایمانی ایک عارضی چیز ہے اور آہستہ آہستہ یہ سب لوگ خود بخود منتشر ہو کر اپنے آبائی مذہب کی طرف لوٹ جائیں گے ۔ لیکن جب بدر کے موقع پر مسلمانوں کو ایک غیر معمولی فتح نصیب ہوئی اور تقریباً تمام بڑے رؤسائے قریش مارے گئے تو اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ نیا دین یونہی مٹتا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ بدر کے بعد اس نے اسلام کے مٹانے میں اپنی پوری کوشش صَرف کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے دلی بغض و حسد کا سب سے پہلا اظہار اس موقع پر ہوا جبکہ بدر کی فتح کی خبر مدینے پہنچی۔ اس خبر کو سن کر کعب نے علی رؤس الاشہاد یہ اعلان کیا کہ یہ خبر بالکل جھوٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ محمد (ﷺ) کو قریش کے ایسے بڑے لشکر پر فتح حاصل ہو اور مکّے کے اتنے نامور رئیس خاک میں مل جائیں اور اگر یہ خبر سچ ہے تو پھر اس زندگی سے مرنا بہتر ہے۔ (ابن ہشام، مقتل کعب بن اشرف۔ دار الکتب العلمیّہ، بیروت۔ ایڈیشن 2001ء و ابن سعد، سریّۃ قتل کعب بن الاشرف، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت) پھر جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی اور کعب کو یہ یقین ہو گیا کہ واقعی بدر کی فتح نے اسلام کو وہ استحکام دے دیا ہے جس کا اُسے وہم و گمان بھی نہ تھا تو وہ غیض و غضب سے بھر گیا۔ اس نے فوراً مکّے کی راہ لی اور وہاں جا کر اپنی چرب زبانی اور شعر گوئی کے زور سے قریش کے دلوں کی سُلگتی ہوئی آگ کو شعلہ بار کر دیا۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خون کی نہ بجھنے والی پیاس پیدا کر دی اور اُن کے سینے جذباتِ انتقام و عداوت سے بھر دیئے۔ (ابو داؤد کتاب الخراج .... باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ نیز ابن ہشام، مقتل کعب بن الاشرف و ابن سعد، سریّۃ قتل کعب بن الاشرف) جب کعب کی اشتعال انگیزی سے اُن کے احساسات میں ایک انتہائی

درجے کی انگیخت پیدا ہو گئی تو اس نے ان کو خانہ کعبہ کے صحن میں لے جا کر اور کعبے کے پردے ان کے ہاتھوں میں دے دے کر اُن سے قسمیں لیں کہ جب تک اسلام اور بانیٔ اسلام کو سطحِ دنیا سے مٹا نہ دیں گے، اُس وقت تک چین نہ لیں گے۔ (فتح الباری، کتاب المغازی باب قتل کعب بن الاشرف) مکّے میں یہ آتش فشاں پیدا کر کے اس نے دوسرے قبائل عرب کا رُخ کیا اور قوم بقوم پھر کر انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ (زرقانی، قتل کعب بن الاشرف) اس نے واپس آکر مدینے میں مسلمان خواتین پر تشبیب کہی۔ یعنی اپنے جوش دلانے والے اشعار میں نہایت گندے اور فحش طریق پر مسلمان خواتین کا ذکر کیا۔ (ابن ہشام، مقتل کعب بن الاشرف) حتیٰ کہ خاندانِ نبوّت کی مستورات کو بھی اپنے ان بیہودہ اشعار کا نشانہ بنانے سے دریغ نہ کیا۔ (طبری، سن 3ھ، خبر کعب بن الاشرف و الرّوض الانف، مقتل کعب بن الاشرف) ملک میں ان اشعار کا چرچا کروایا۔ اس کی ان شاعرانہ تشبیبی کارروائیوں کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ آنحضرت ﷺ، اہل بیت کی تضحیک کرے، لوگوں کو مسلمانوں سے متنفّر کرے اور ان کے دلوں میں دشمنی بھرے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بالآخر اُس نے آپؐ کے قتل کی سازش کی۔ آپؐ کو کسی دعوت وغیرہ کے بہانے سے اپنے مکان پر بلا کر بعض نوجوان یہودیوں سے آپؐ کے قتل کا منصوبہ باندھا۔ مگر خدا کے فضل سے آپؐ کو وقت پر اس کی نیّت کی اطلاع ہو گئی اور اُس کی یہ سازش کامیاب نہیں ہوئی۔ (تاریخ الخمیس، سریّۂ محمد بن مسلمہ لقتل کعب بن الاشرف و زرقانی، قتل کعب بن الاشرف) جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور کعب کے خلاف عہد شکنی، بغاوت، تحریکِ جنگ، فتنہ پردازی، فحش گوئی اور سازشِ قتل کے الزامات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئے تب آنحضرت ﷺ نے اس کے خلاف فیصلے کا ارادہ فرمایا۔ آپؐ اس بین الاقوام معاہدے کی رُو سے جو مدینے میں آپؐ کی تشریف آوری کے بعد اہالیانِ مدینہ میں ہوا تھا، مدینے کی جمہوری سلطنت کے صدر اور حاکم اعلیٰ تھے۔ آپؐ نے کعب بن اشرف کو اس کی مذکورہ بالا محاربانہ اور باغیانہ کارروائیوں کی وجہ سے اپنے فیصلے میں قتل کا سزاوار قرار دیا۔

لہٰذا آپؐ نے بعض صحابہؓ کو ارشاد فرمایا کہ اُسے قتل کر دیا جائے۔(ابو داؤد کتاب الخراج......باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ و بخاری کتاب المغازی باب قتل کعب بن اشرف) آپؐ کا یہ فیصلہ محارب اور باغی کے بارے میں دونوں مذہبوں کی تعلیمات کے عین مطابق اور میثاق مدینہ کے عین موافق تھا۔ لیکن اُس وقت چونکہ کعب کی فتنہ انگیزیوں کی وجہ سے مدینے کی فضا ایسی ہو رہی تھی کہ اگر اس کے خلاف باضابطہ طور پر اعلان کر کے اسے قتل کیا جاتا تو مدینے میں ایک خطرناک خانہ جنگی شروع ہو جانے کا پورا پورا احتمال تھا۔ جس میں نہ معلوم کیسا کشت و خون ہوتا اور آنحضرت ﷺ کی فطرت ایسی تھی کہ آپؐ خود ہر ممکن اور جائز قربانی کر کے بین الاقوام کشت و خون کو روکنا چاہتے تھے۔ قرآن کریم میں عوام الناس کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم نازل فرمائی ہے ''فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ'' (التوبہ:12) کہ جب وہ اپنا معاہدہ توڑیں تو تم ائمۃ التکفیر سے قتال کرو۔ چنانچہ آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی کہ کعب کو سرِ عام قتل نہ کیا جاوے بلکہ چند لوگ خاموشی کے ساتھ کوئی مناسب موقع نکال کر اُسے قتل کر دیں تا کہ عامۃ الناس نہ بھڑک اٹھیں۔ لہٰذا یہ فریضہ آپؐ نے قبیلہ اوس کے ایک فدائی صحابی محمد بن مَسْلِمہؓ کے سپرد فرمایا۔ آپؐ نے انہیں تاکید فرمائی کہ جو طریق بھی اختیار کریں قبیلہ اوس کے رئیس سعد بن معاذؓ کے مشورے سے کریں۔ (زرقانی، قتل کعب بن اشرف) محمد بن مسلمہؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! قتل کے لئے اس سے کوئی بات تو کہنی ہوگی۔ یعنی کوئی عذر وغیرہ بنانا پڑے گا۔ جس کی مدد سے کعب کو اس کے گھر سے نکال کر کسی محفوظ جگہ پر قتل کیا جا سکے۔ آپؐ نے ان عظیم الشان اثرات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اس موقع پر ایک خاموش سزا کے طریق کو چھوڑنے سے پیدا ہو سکتے تھے فرمایا 'اچھا'۔ چنانچہ محمد بن مسلمہؓ نے سعد بن معاذؓ کے مشورے سے ابو نائلہؓ اور دو تین اور ساتھیوں کو اپنے ساتھ لیا اور کعب کے مکان پر پہنچے اور کعب کو اس کے اندرونِ خانہ سے بلا کر کہا: ''ہمارے صاحب (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ حال ہیں۔ کیا تم مہربانی کر کے ہمیں کچھ

قرض دے سکتے ہو؟"(یہ بات گو اس موقع کے لئے اختیار کی گئی ہو مگر اپنی جگہ درست تھی کیونکہ آنحضرت ﷺ واقعۃً اپنے صحابہؓ سے قومی ضروریات کے لئے چندے اور زکوٰۃ کا مطالبہ فرمایا کرتے تھے اور یہ بھی درست ہے کہ صحابہ عموماً نادار اور غریب تھے۔)

یہ بات سن کر کعب خوشی سے کود پڑا اور کہنے لگا، واللہ! ابھی کیا ہے، وہ دن دور نہیں جب تم اس شخص سے بیزار ہو کر اُسے چھوڑ دوگے۔ محمدؓ نے جواب دیا۔" خیر ہم تو محمد ﷺ کی اتباع اختیار کر چکے ہیں اور اب ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس سلسلے کا انجام کیا ہوتا ہے، مگر تم یہ بتاؤ قرض دوگے یا نہیں؟ کعب نے کہا" ہاں! مگر کوئی چیز رہن رکھو۔" محمدؓ نے پوچھا: "کیا چیز؟ "اس بدبخت نے جواب دیا: "اپنی عورتیں رہن رکھ دو" محمدؓ نے غصے کو دبا کر کہا: " یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے جیسے آدمی کے پاس ہم عورتیں رہن رکھ دیں۔" اُس نے کہا: "اچھا تو پھر بیٹے سہی ۔" محمدؓ نے جواب دیا : " یہ بھی ناممکن ہے۔ ہم سارے عرب کا طعن اپنے سر پر نہیں لے سکتے۔ البتہ اگر تم مہربانی کرو تو ہم اپنے ہتھیار رہن رکھ دیتے ہیں۔" کعب راضی ہو گیا اور محمد بن مسلمہؓ اور ان کے ساتھی رات کو آنے کا وعدہ دے کر واپس چلے آئے۔ جب رات ہوئی تو یہ پارٹی ہتھیار وغیرہ لے کر (کیونکہ وہ اجازت دے چکا تھا اور اب وہ برملا طور پر ہتھیار اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے) کعب کے مکان پر پہنچے اور اُسے اس کے گھر سے باتیں کرتے کرتے ایک طرف کو لے آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چلتے چلتے محمد بن مسلمہؓ یا اُن کے کسی ساتھی نے کسی بہانے سے کعب کے سر پر ہاتھ ڈالا اور نہایت پھرتی کے ساتھ اس کے بالوں کو مضبوطی سے قابو کر کے اپنے ساتھیوں کو آواز دی، مارو۔ ان کے ساتھیوں نے جو پہلے سے تیار اور ہتھیار بند تھے فوراً تلواریں چلا دیں۔ کعب قتل ہو کر گرا اور محمد بن مسلمہؓ اور اُن کے ساتھی وہاں سے نکل کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور آپؐ کو اس کے قتل کی اطلاع دی۔ (بخاری، کتاب المغازی باب

قتل کعب بن اشرف) مدینے میں جب کعب کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو شہر میں ایک سنسنی پھیل گئی اور یہود کا سخت جوش میں آجانا ایک طبعی بات تھی۔ چنانچہ صبح ان کا ایک وفد آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ ہمارا سردار کعب بن اشرف قتل کر دیا گیا ہے۔ آپؐ نے ان کی باتیں سن کر کہا کہ کیا تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ کعب کس کس جرم کا مرتکب ہوا ہے؟ اور پھر آپؐ نے اجمالاً اُن کو کعب کی عہد شکنی، تحریک جنگ، فتنہ انگیزی، فحش گوئی اور سازشِ قتل وغیرہ کی کارروائیاں یاد دلائیں۔ (ابو داؤد کتاب الخراج ..... باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ، نیز ابن سعد، سریۃ قتل کعب بن الاشرف) جس پر وہ لوگ سمجھ گئے کہ وہ ان قومی جرائم کی وجہ سے سزاوارِ قتل تھا۔ لہٰذا وہ خاموش ہو گئے۔ (فتح الباری، کتاب المغازی باب قتل کعب بن اشرف و زرقانی ، قتل کعب بن اشرف) اس کے بعد آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اُن سے فرمایا کہ تمہیں چاہئے کہ کم از کم آئندہ کے لئے ہی اَمن اور تعاون کے ساتھ رہو اور عداوت اور فتنہ وفساد کا بیج نہ بوؤ۔ چنانچہ یہود کی رضامندی کے ساتھ آئندہ کے لئے ایک نیا معاہدہ لکھا گیا اور یہود نے مسلمانوں کے ساتھ اَمن واَمان سے رہنے اور فتنہ فساد کے طریقوں سے بچنے کا از سرِ نو وعدہ کیا۔(ابو داؤد کتاب الخراج باب کیف کان اخراج الیھود و نیز ابن سعد، سریۃ قتل کعب بن اشرف) بعد از تحریر یہ عہد نامہ حضرت علیؓ کی سپردگی میں دے دیا گیا۔ (ابن سعد، سریۃ قتل کعب بن اشرف) سیرت ابن ہشام کے مطابق یہ قتل جمادی الآخرہ 3 ہجری میں ہوا تھا۔

پس روزِ روشن کی طرح یہ عیاں ہے کہ کعب اپنے کئی قومی جرموں خصوصاً بغاوت اور فتنہ گری وغیرہ کی وجہ سے قتل کیا گیا تھا۔ اس کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ یہود نے کعب کے قتل کو بعد میں کبھی مسئلہ نہیں بنایا۔ چنانچہ تاریخ میں کسی جگہ بھی مذکور نہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اس وضاحت کے بعد یہودیوں نے کبھی کعب بن اشرف کے قتل کا ذکر کر کے

مسلمانوں پر الزام قائم کیا ہو۔ کیونکہ ان کے دل محسوس کرتے تھے کہ وہ اپنے مستحق انجام کو پہنچا ہے۔ آپؐ نے یہود کے سامنے مذکورہ بالا وضاحت میں یہ بات بالکل بیان نہیں فرمائی کہ وہ آپؐ کی توہین بھی کیا کرتا تھا۔ بلکہ آپؐ نے اس کا ذکر تک نہیں فرمایا۔ یہ ایک قطعی شہادت ہے کہ آپؐ نے اپنی توہین کو موجبِ قتل قرار نہیں دیا۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ کعب بن اشرف آنحضرت ﷺ کے ساتھ باقاعدہ امن و امان کا معاہدہ کر چکا تھا اور مسلمانوں کے خلاف کاروائی کرنا تو درکنار، اُس نے تو اس بات کا عہد کیا تھا کہ وہ ہر بیرونی دشمن کے خلاف مسلمانوں کی امداد کرے گا اور مسلمانوں کے ساتھ دوستانہ تعلّقات رکھے گا۔ اُس نے اس معاہدے کی رُو سے یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ جس رنگ میں مدینے میں جمہوری سلطنت کا قیام کیا گیا ہے اُس میں آنحضرت ﷺ صدر رہوں گے اور ہر قسم کے تنازعات وغیرہ میں آپؐ کا فیصلہ سب کے لئے واجب القبول ہو گا۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اسی معاہدے کے ماتحت یہودی لوگ اپنے مقدّمات وغیرہ آپؐ کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور آپؐ ان میں فیصلے اوراحکام جاری فرماتے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے زنا کے ایک مقدّمے میں یہودی مرد اور اور یہودی عورت کو تورات کے حکم کے مطابق رجم کی سزا بھی سنوائی تھی۔ (بخاری کتاب الحدود باب رجم فی البلاط) اسی طرح ان کے اور بھی بہت سے تنازعات کا ذکر مستند روایات میں ملتا ہے جن کے فیصلے رسول اللہ ﷺ نے صادر فرمائے تھے۔ پس یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ کعب نے تمام عہد وپیمان کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں سے، بلکہ حق یہ ہے کہ حکومتِ وقت سے غدّاری کی اور مدینہ میں فتنہ و فساد کا بیج بویا، ملک میں جنگ کی آگ مشتعل کرنے کی بھرپور اور جارحانہ کوشش کی، مسلمانوں کے خلاف قبائلِ عرب کو خطرناک طور پر اُبھارا، مسلمان عورتوں پر اپنے جوش دلانے والے اشعار میں تشبیب کہی اور آنحضرت ﷺ کے قتل کے منصوبے کئے۔ نیز یہ

سب کچھ ایسی حالت میں کیا کہ مسلمان پہلے سے ہی چاروں اطراف سے مصائب میں گھرے ہوئے تھے اور عرب کے خونخوار درندے اُن کے خون کی پیاس میں دیوانے ہو رہے تھے۔ صحابہؓ کی ایسی حالت تھی کہ نہ دن آرام میں گزرتا تھا اور نہ رات۔ دشمن کے حملے کے خطرے اُن کی نیندوں کو حرام کر رہے تھے۔ ان حالات میں کعب کا جرم بلکہ بہت سے جرموں کا مجموعہ ایسا تھا کہ اس کے خلاف کوئی تعزیری قدم اُٹھایا جانا ناگزیر تھا۔ ان حالات میں قتل سے کم کوئی اور سزا نہ تھی جو یہود کی اس فتنہ پردازی کے سلسلے کو روک سکتی تھی۔

کتبِ احادیث اور تواریخ وسِیَر میں بیان شدہ اس حقیقت افروز تفصیل کے بعد کعب بن اشرف کے قتل کو توہین کی سزا قرار دینا ہر گز درست نہیں۔ یہ اس شخص کی عہد شکنی، بغاوت، تحریض جنگ، قتل کی سازش اور فساد کی سزا تھی جو رسول اللہ ﷺ نے معاشرے کو فتنہ وفساد اور کشت وخون سے بچانے کے لئے نہایت پُر حکمت طریق سے دی تھی۔ یہ آپؐ کی ایسی رحیمانہ کوشش تھی کہ جس سے ایک شخص کی جان کے اتلاف سے بیشمار جانیں بچ گئیں اور معاشرہ بدامنی سے محفوظ ہو گیا۔

*****

عرب شاعری:

مندرجہ بالا سطور میں چونکہ کعب کی شاعری کا ذکر ہوا تھا اس لئے ضروری ہے کہ قبل اس کے کہ ہم دیگر روایات کے تفصیلی تجزیئے میں داخل ہوں، اس معاشرے کے اس بنیادی عنصر کا بھی کچھ جائزہ لیتے جائیں جو توہینِ رسولؐ کے مسئلے میں اہم کردار کا حامل ہے۔ اس زمانے میں عرب میں شاعری ایک موئثر ذریعۂ ابلاغ تھا۔ آج اگر کسی خبر کی اشاعت کی ضرورت ہو تو اخبار، ریڈیو، ٹیلیویژن اور انٹرنیٹ وغیرہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ قدیم عرب میں بات کو پھیلانے کے لئے شاعری ایک موئثر ترین ذریعہ تھا۔ وہ لوگ اپنے پیغام یا مقصد کو شعروں میں ڈھال کر سنا دیتے تھے۔ ویسے بھی شعر یاد کرنا اور سنانا سب سے آسان اور کارگر طریق تھا۔ چنانچہ اس سے پیغام آناً فاناً زبانِ زدِ عام ہو جاتا تھا۔

زمانۂ جاہلیت کے شعراء کا کلام آج تک محفوظ ہے۔ اس کے اندر جو فصاحت و بلاغت، زور اور جوش و خروش، آزادگی، کھلا پن اور طبعی بہاؤ وغیرہ ایسی صفات ہیں جو کسی اور وقت یا زبان کی شاعری میں کم دکھائی دیں گی۔ اس زمانے کے شعراء میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے دلی خیالات کو نہایت بے تکلّفی کے ساتھ بالکل عریاں الفاظ میں کہہ جاتے تھے۔ کوئی تصنّع نہیں۔ کوئی بناوٹ نہیں۔ طبیعت پر کوئی زور نہیں۔ اسی لئے ان کا کلام، ان کے خیالات، جذبات، عادات اور ان کی شخصیّت کی پوری پوری ترجمانی کرتا تھا۔

عرب قوم اس خوبی کو خود بھی خوب سمجھتی تھی۔ چنانچہ ان کے شعراء گویا ایک پہلو سے ملک کے راہنما سمجھے جاتے تھے۔ انہیں یہ طاقت حاصل تھی کہ اپنے زورِ کلام سے دو قبائل کے درمیان جنگ کروا دیں اور علاقے میں آگ لگا دیں۔ عرب کے خاص خاص مقامات میں شعراء جمع ہو کر اپنے کلام کے جوبن دکھاتے تھے۔ عکاظ کا مقام جو نخلہ اور طائف کے درمیان مکّہ

سے مشرق کی طرف ایک شاداب جگہ ہے، ایسے میلوں کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا۔ یہاں ہر سال ماہِ ذیقعدہ میں میلہ لگتا تھا اور دور دراز سے لوگ جمع ہوتے تھے اور علاوہ دوسرے مشاغل کے مختلف عرب قبائل کے درمیان فصاحت و بلاغت اور شاعری کے مقابلے بھی ہوتے تھے۔

اگر یہ قادر الکلام شعراء حسّاس شاعرانہ جذبوں کے ساتھ دوسروں پر موئثر تھے تو خود ان کے اپنے حسّاس شاعرانہ دل بھی شعروں کے سوز و ساز سے مرتعش و متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے کہ بنو تمیم کا وفد 9ھ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور فصاحت اور شاعری کے مقابلے میں حضرت قیس بن ثابتؓ کی فصاحت اور حضرت حسّان بن ثابتؓ کی بے نظیر شاعری سے مات کھانے کی وجہ سے اسلام میں داخل ہو گیا۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ عرب کا مشہور شاعر عبد اللہ بن الزبعرٰی آنحضرت ﷺ کی ہجو کرتا تھا۔ وہ فتح مکّہ کے بعد اس ڈر سے نجران بھاگ گیا تھا کہ کہیں اسے قتل نہ کر دیا جائے۔ حضرت حسّانؓ نے اسے یہ ایک ہی شعر لکھ بھیجا:

لَا تَعْدَمَنْ رَجُلًا اَحَلَّكَ بُغْضُهُ　　نَجْرَانَ فِيْ عَيْشٍ اَحَذَّ لَئِيْمِ

کہ تو ایسے شخص سے مت محروم ہو جس کے بغض نے تجھے دور دراز نجران میں جاڈالا ہے۔ جہاں تو سب سے کٹ کر بُری زندگی گزار رہا ہے۔ (ابن ہشام، باب فتح مکّہ، اسلام ابن الزّبعرٰی) یہ شعر عبد اللہ بن الزّبعرٰی کے حسّاس شاعر دل کو اس حدّ تک گھائل کر گیا کہ وہ واپس آیا اور مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کے حلقۂ غلامی میں داخل ہو کر اسلام کا خادم بن گیا۔ اور پھر وہ آپؐ کی سیرت کے حسن و جمال کے مشاہدے کے بعد آپؐ کے قصیدے لکھنے لگا۔

کم و بیش ایسا ہی معاملہ کعب بن زُہَیر بن ابی سُلمٰی کے ساتھ ہوا۔ جب اس کے بھائی بُجَیر بن زہیر نے جو قبل ازیں مسلمان ہو چکا تھا، اسے اشعار میں مدینہ آنے اور معافی مانگنے کے پیغام بھیجے تو کعب کے دل کو ان اشعار کے جادو نے رام کر دیا تھا اور اسے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی طلب کرنے اور اسلام قبول کرنے پر مائل کر دیا تھا۔

ابن زبعرٰی اور کعب کے ساتھ شاعر ہُبَیرہ بن ابی وہب نے بھی ماضی میں جی بھر کے آنحضرت ﷺ کی ہجو کی تھی۔ مستند کتبِ تاریخ سے ثابت ہے کہ آپؐ نے ان کے قتل کا کوئی اعلان نہیں فرمایا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ خود مکہ سے بھاگ گئے تھے کہ ان کو بھی کہیں قتل نہ کر دیا جائے۔ (ابن ہشام ذکر کعب بن زہیر بعد الانصراف عن الطائف) ان واقعات سے ظاہر ہے کہ اگر توہین کی سزا قتل ہوتی تو یا تو بقول بعض فقہاء کے ان تینوں کی توبہ قبول نہ کی جاتی یا ان کو اسلام قبول کرنے سے قبل ہی قتل کر دیا جاتا۔

الغرض عرب میں شاعری ایک طاقتور ذریعہ تھا جو ایک طرح سے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہاں کے عام طریق کے مطابق ہجویہ شاعری بھی فریقین کا معمول اور مروّجہ دستور کا اہم حصّہ تھی۔ خصوصاً جنگوں اور لڑائیوں میں رزمیہ شعروں کے ساتھ ساتھ مخالف فریق کی ہجو بھی انتہاء کی کی جاتی تھی۔ چنانچہ جب مخالف سمت سے ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ بھی حضرت حسّانؓ کو مخاطب کر کے فرماتے: ''اُهْجُهُمْ وَ جِبْرِيْلُ مَعَكَ'' (بخاری کتاب بدء الخلق باب ذکر الملائکۃ) کہ دشمنوں کی ہجو کر۔ جبریل تیری مدد کرے۔ یعنی یہ طریق دونوں طرف متوازی رائج تھا۔ بلکہ مومنوں کی ہجو میں جبریلؑ کی مدد بھی شامل ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت حسّان بن ثابتؓ سردارِ قریش ابوسفیان بن حرب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: ؎

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَاَجَبْتُ عَنْهُ　　وَعِنْدَ اللّٰهِ فِيْ ذَاكَ الْجَزَاءُ

فَاِنَّ اَبِیۡ وَ وَالِدَہٗ وَ عِرۡضِیۡ لِعِرۡضِ مُحَمَّدٍ مِّنۡکُمۡ وِقَاءٗ

کہ تونے محمد (ﷺ) کی ہجو کی تو میں نے اس کا جواب دیا ہے۔ اور اس کی جزاء اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ پس میرا باپ، دادا اور میری آبرو تم لوگوں سے ناموسِ محمد (ﷺ) کے لئے ایک ڈھال ہے۔

اگر ہجو یعنی توہین کی سزا قتل ہوتی تو آپؐ حضرت حسّان بن ثابتؓ کو نہ فرماتے کہ اس کا جواب ہجو سے دو بلکہ کسی بہادر جنگجو صحابی کو بھیجتے کہ ہجو کرنے والے کی ہجو کا جواب تلوار سے دو۔ آپؐ کی اس تعلیم سے جو آپؐ نے اس سلسلے میں حضرت حسّانؓ کو دی، واضح ہے کہ زبان کا جواب دینا ضروری ہو تو تلوار سے نہیں بلکہ زبان سے دینا ہے اور تلوار کے جواب کی ضرورت ہو تو تلوار سے دینا ہے۔

بہر حال ابوسفیان کا ذکر چلا ہے تو یہ تو سب جانتے ہیں کہ یہ وہ شخص تھا جو رسول اللہ ﷺ کی نہ صرف ہجو و توہین کرنے والا تھا بلکہ مدینے پر بھی مسلسل خوف و ہراس طاری کرنے والا اور ان پر جنگیں مسلّط کر کے کثیر تعداد میں صحابہؓ کی شہادتوں کا بھی ذمہ دار تھا۔ وہ ایک مرتبہ مدینے میں آیا بھی تھا۔ مگر اسے قتل نہیں کیا گیا۔ اسے قتل نہ کرنے کی وجہ یہی تھی کہ اسلام میں ہجو و توہین اور ہتکِ رسولؐ وغیرہ کبھی بھی قابلِ تعزیر نہیں ٹھہرائے گئے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تو درگزر کرنے والے تھے۔ مگر ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ غیرت دکھائے اور توہین کرنے والے کو قتل کر کے دم لے۔ اگر ان کی اس بات کو درست سمجھا جائے تو آپؐ کے ارد گرد رہنے والے صحابہؓ نے ابوسفیان کے پہلو سے یہ ذمہ

داری کیوں ادا نہ کی۔ حتّٰی کہ آپؐ کی زوجہ مطہّرہ حضرت امّ حبیبہؓ نے بھی یہ ذمہ داری ادا نہیں کی۔

ان کے اس قول میں عجیب تضاد ہے۔ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رحمۃٌ للعالمین تھے۔ لہٰذا آپؐ اپنی توہین پر درگزر فرما دیتے تھے، یہ آپؐ کی رحمت کا تقاضا تھا۔ دوسری طرف یہ ہر جھوٹی ترین روایت کو بھی کھینچ کھینچ لاتے ہیں اور اس سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ توہین و تنقیص کرنے والے کو ضرور قتل کرواتے تھے۔ یہ دونوں پہلو ایک دوسرے سے متضاد و متصادم ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ شاتمِ رسولؐ کے قتل کا عقیدہ بے بنیاد ہے اور بعض مقاصد کے حصول کی خاطر اختیار کیا جاتا ہے۔

آج کا ایک دعویدار اگر یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور اس کی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ گستاخِ رسولؐ کو معاف نہ کرے اور اسے قتل کر کے ہی دم لے تو وہ حقیقت میں پھپھے کُٹنی بنتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے نام کی آڑ لے کر اپنے لئے ظلم و تشدّد کے جواز پیدا کرتا ہے۔ کیا صحابہؓ اپنے پیارے محبوب آقا کے لئے دنیا کے تمام مسلمانوں سے زیادہ غیرت رکھنے والے اور ناموسِ رسولؐ کی حفاظت کرنے والے نہ تھے؟ اسی کے لئے انہوں نے کیا کیا قربانیاں نہیں کیں۔ ان کے خون رسول اللہ ﷺ کی محبت میں سچائی کے باعث تلواروں تلے قربانیوں کے جانوروں کی طرح بہائے گئے۔ وہ اپنی محبت میں صدق و صفا رکھتے تھے اور آپؐ کے ناموس کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں پیش کرتے تھے۔ مگر آج دوسروں کی جانوں کے درپے یہ نام نہاد دعویدارانِ محبتِ رسولؐ اپنے نعروں میں وحشت و خونخواری رکھتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی ناموسِ رسولؐ کے حوالے سے صحابہؓ سے ایک ذرّہ بھر مشابہت کا نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ لوگ خود اپنی جانیں قربان کرنے والے تھے اور یہ دوسروں کی جانیں لینے والے ہیں۔

پس یہ حقیقت ہے کہ کسی جنگ میں اگر کسی ہجو گو مرد یا عورت کا قتل ہوا تھا تو وہ جنگ میں شمولیت کے باعث جنگی قتل تھا، وہ کشتۂ ہجو و توہین نہ تھا۔ اس کے علاوہ اگر کسی ایسے مرد یا عورت کا ذکر آتا ہے جس کے ساتھ ہجو یہ اشعار کا بھی ذکر تھا اور اس کے قتل کے لئے رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا۔ تو وہ لوگ لازماً ایسے تھے جو یا تو خود کسی سنگین جرم کے مرتکب تھے یا کسی محاربانہ یا باغیانہ کارروائیوں میں شامل تھے یا کسی ایسے گروہ کے رکن تھے۔ جیسا کہ ابن خطل یا اس کی داشتائیں تھیں۔ ایسے لوگ ہجو کی وجہ سے سزائے قتل کے مستحق نہ ٹھہرے تھے بلکہ کسی دوسرے جرم کی وجہ سے سزاوارِ قتل قرار پائے تھے۔

اس کے علاوہ بھی بعض افراد تھے جن کے قتل پر مشتمل روایات پیش کی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بدزبانی کی وجہ سے انہیں قتل کیا گیا تھا۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ چونکہ ان روایات سے آپؐ کے خلاف ایک ظاہری صورت اعتراض کی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے بعض معاندینِ اسلام اور مستشرقین نے حسبِ عادت نہایت ناگوار صورت میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ معاندین اسلام کو جو مواد مہیّا ہوا ہے وہ اسی قسم کی روایتوں کو درج کر کے '' اپنے ہی دوستوں '' نے مہیّا کیا ہے۔ ان روایات کی حیثیت کیا ہے اور ان میں مذکور واقعہ قتل کی وجوہات کیا تھیں، ایک حقیقت افروز تجزیہ قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

*****

2: ابو رافع

ابو رافع کا واقعہ بھی قتلِ شاتم کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس کا اصل نام سلام بن ابی الحُقَیق تھا۔ اپنی کنیت کی وجہ سے ابو رافع کہلاتا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا تاجر اور دولتمند یہودی رئیس تھا۔ اس کے قتل کو بھی توہینِ رسالت کی سزا قرار دیا جاتا ہے۔

اس کے قتل کی تفصیل اور پس منظر یہ ہے کہ جن یہودی رؤساء کی مفسدانہ انگیخت اور اشتعال انگیزی سے 5ھ کے آخر میں مسلمانوں کے خلاف جنگِ احزاب کا خطرناک فتنہ برپا ہوا تھا۔ ان یہودی سرداروں میں سے ایک سردار حُیَی بن اخطب تو بنو قریظہ کے ساتھ اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ لیکن ابو رافع خیبر کے علاقے میں اپنی فتنہ خیزی میں مصروف تھا۔ بلکہ جنگِ احزاب میں ذلت بھری ناکامی اور پھر بنو قریظہ کے بدانجام نے اُس کی عداوت کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ چونکہ قبائل غطفان کا مسکن نجد ایک جانب سے خیبر کے قریب تھا اور خیبر کے یہود اور نجد کے غطفانی قبائل آپس میں ہمسائے تھے، اس لئے اب ابو رافع نے نجد کے ان جنگجو قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اُکسانے کا دستورالعمل بنا لیا تھا۔ گویا رسول اللہ ﷺ کی عداوت میں وہ کعب بن اشرف کا پورا پورا مثیل تھا۔ (ابن ہشام، مقتل سلام بن ابی الحُقَیق) اس کی عداوت کی آگ مسلمانوں کے خون کی پیاسی تھی اور آنحضرت ﷺ کا وجود اُس کی آنکھوں میں مثلِ خار تھا۔ چنانچہ اس نے غطفانیوں کو آپؐ کے خلاف حملہ آور ہونے کے لئے کثیر اموال پیش کئے تھے۔ (فتح الباری، کتاب المغازی باب قتل ابی رافع عبد اللہ بن ابی الحقیق) تاریخ سے ثابت ہے کہ ماہ شعبان 6ھ میں قبیلہ بنو سعد کی طرف سے جو خطرہ مسلمانوں کو پیدا ہوا تھا اور اس کے سدِّباب کے لئے حضرت علیؓ کی کمان میں ایک فوجی دستہ مدینے سے روانہ کیا گیا تھا اُس کی پشت پر بھی خیبر کے یہود تھے۔ (ابن سعد جلد 2 صفحہ 56) وہ ابو رافع کی قیادت میں یہ شرارتیں کر رہے تھے۔ ابو رافع نے اسی پر بس

نہیں کی۔ اُس نے بالآخر نجد کے قبائلِ غطفان اور دوسرے قبیلوں کا پھر بھرپور دورہ کر کے انہیں مسلمانوں کے تباہ کرنے کے لئے جنگِ احزاب کی طرح ایک لشکرِ عظیم کی صورت میں جمع کرنا شروع کر دیا۔ (ابن سعد جلد 2 صفحہ 66) جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے پھر وہی احزاب والے منظر پھرنے لگ گئے تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں قبیلہ خزرج کے بعض انصاری حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اب اس فتنے کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کسی طرح اس فتنے کے بانی مبانی ابو رافع کا خاتمہ کر دیا جائے۔ (ابن ہشام، مقتل سلام بن ابی الحُقَیق) آپؐ نے اس بات کو سوچتے ہوئے کہ ملک میں وسیع کُشت و خون کی بجائے ایک مفسد اور فتنہ انگیز آدمی کا مارا جانا بہت بہتر ہے، ان انصار کو اجازت مرحمت فرمائی۔ آپؐ نے عبد اللہ بن عتیک انصاریؓ کی سرداری میں چار خزرجی انصار کو ابو رافع کی طرف روانہ فرمایا۔ مگر چلتے ہوئے تاکید فرمائی کہ کسی عورت یا بچے کو ہرگز قتل نہیں کرنا۔ (موطا کتاب الجہاد باب النھی عن قتل النساء والولدان فی الغزو) چنانچہ 6ھ کے ماہ رمضان میں یہ پارٹی روانہ ہوئی (ابن ہشام، مقتل سلام بن ابی الحُقَیق، ابن سعد) اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ اپنا کام کر کے واپس آگئی۔ اس طرح ایک جانب سے اس مصیبت کے بادل مدینے کی فضا سے ٹل گئے۔ اس واقعے کی تفصیل صحیح بخاری میں، جو اس معاملے میں صحیح ترین روایت ہے، مندرجہ ذیل صورت میں بیان ہوئی ہے:

"براء بن عازبؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہؓ کی ایک پارٹی ابو رافع یہودی کی طرف روانہ فرمائی اور اُن پر عبد اللہ بن عتیک انصاریؓ کو امیر مقرر فرمایا۔ ابو رافع کا قصہ یہ تھا کہ وہ آنحضرت ﷺ کو بہت دُکھ دیا کرتا تھا اور آپؐ کے خلاف لوگوں کو اُبھارتا تھا اور اُن کی مدد کیا کرتا تھا۔ عبد اللہ بن عتیکؓ اور اُن کے ساتھی ابو رافع کے قلعے کے قریب پہنچے۔ جب سورج غروب ہو گیا تو عبد اللہ بن عتیکؓ نے اپنے ساتھیوں کو پیچھے چھوڑا اور خود قلعے کے

دروازے کے پاس پہنچے اور اس کے قریب اس طرح چادر لپیٹ کر بیٹھ گئے جیسے کوئی شخص کسی حاجت کے لئے بیٹھا ہو۔ جب قلعے کا دروازہ بند کرنے والا شخص دروازے پر آیا تو اُس نے عبد اللہؓ کی طرف دیکھ کر آواز دی : " اے شخص! میں قلعے کا دروازہ بند کرنے لگا ہوں تم نے اندر آنا ہو تو جلد آجاؤ۔" عبد اللہؓ چادر میں لپٹے لپٹائے جلدی سے دروازے کے اندر داخل ہو کر ایک طرف کو چھپ گئے۔ دروازہ بند کرنے والا شخص دروازہ بند کر کے اور اُس کی کنجی ایک قریب کی کھونٹی سے لٹکا کر چلا گیا۔ اس کے بعد عبد اللہ بن عتیکؓ کا اپنا بیان ہے کہ:

"میں اپنی جگہ سے نکلا اور سب سے پہلے میں نے قلعے کے دروازے کا تالا کھول دیا تا کہ ضرورت کے وقت جلدی اور آسانی کے ساتھ باہر نکلا جا سکے ۔ اس وقت ابو رافع ایک چوبارے میں تھا اور اس کے پاس بہت سے لوگ مجلس جمائے بیٹھے تھے۔ جب یہ لوگ اُٹھ کر چلے گئے اور خاموشی ہو گئی تو میں ابو رافع کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ میں نے یہ احتیاط کی کہ جو دروازہ میرے راستے میں آتا تھا اُسے میں آگے گزر کر اندر سے بند کر لیتا تھا۔ جب میں ابو رافع کے کمرے میں پہنچا تو کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اُس وقت وہ چراغ بجھا کر سونے کی تیاری میں تھا۔ میں نے آواز دے کر ابو رافع کو پکارا۔ جس کے جواب میں اُس نے کہا۔ کون ہے ؟ بس میں اس آواز کی سمت کا اندازہ کر کے اُس کی طرف لپکا اور تلوار کا ایک زوردار وار کیا مگر اندھیرا بہت تھا اور میں اُس وقت گھبرایا ہوا تھا۔ اس لئے تلوار کا وار غلط پڑا اور ابو رافع چیخ مار کر چلایا جس پر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے پھر کمرے کے اندر جا کر اپنی آواز کو بدلتے ہوئے پوچھا۔ ابو رافع یہ شور کیسا ہوا تھا؟ اُس نے میری بدلی ہوئی آواز کو نہ پہنچانا اور کہا۔ تیری ماں تجھے کھوئے مجھ پر ابھی ابھی کسی شخص نے تلوار کا وار کیا ہے۔ میں یہ آواز سن کر پھر اُس کی طرف لپکا اور تلوار کا وار کیا۔ اس دفعہ وار کاری پڑا مگر وہ مرا پھر بھی نہیں۔ چنانچہ میں

نے اُس پر ایک تیسرا وار کر کے اُسے قتل کر دیا۔ اس کے بعد میں جلدی جلدی دروازے کھولتا ہوا مکان سے باہر نکل آیا، لیکن جب میں سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا تو ابھی چند سیڑھیاں باقی تھیں کہ میں سمجھا کہ میں سب قدم اُتر آیا ہوں۔ چنانچہ میں اندھیرے میں گر گیا اور میری پنڈلی ٹوٹ گئی (اور ایک روایت میں ہے کہ ٹانگ کا جوڑ اُتر گیا) مگر میں اُسے اپنی پگڑی سے باندھ کر گھسیٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ لیکن میں نے اپنے جی میں کہا کہ جب تک ابو رافع کے مرنے کا اطمینان نہ ہو جائے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ میں قلعے کے پاس ہی ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب صبح ہوئی تو قلعے کے اندر سے کسی کی آواز میرے کان میں آئی کہ ابو رافع تاجرِ حجاز فوت ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میں اُٹھا اور آہستہ آہستہ اپنے ساتھیوں میں آملا۔ پھر ہم نے مدینے میں آکر آنحضرت ﷺ کو ابو رافع کے قتل کی اطلاع دی۔" (بخاری کتاب المغازی باب قتل ابی رافع)

ابو رافع کی خون آشام کارروائیاں تاریخ کا ایک کھلا ہوا ورق ہیں۔ گزشتہ صفحات میں اس سے ملتے جلتے ایک واقعے میں ایک مفصّل بحث مدینہ کے یہودی کعب بن اشرف کے قتل کے بیان میں گزر چکی ہے۔ لہٰذا یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اصولاً اس قدر بیان کافی ہے کہ:

۱: اس وقت مسلمان نہایت کمزوری کی حالت میں چاروں طرف سے مصیبت میں مبتلا تھے اور ہر طرف مخالفت کی آگ شعلہ زن تھی۔ گویا سارا ملک مسلمانوں کو مٹانے کے لئے متحد ہو رہا تھا۔

۲: ایسے نازک وقت میں ابو رافع اس آگ پر تیل ڈال رہا تھا جو مسلمانوں کے خلاف مشتعل تھی اور اپنے اثر و رسوخ اور دولت سے عرب کے مختلف قبائل کو اسلام کے خلاف اُبھار رہا

تھا اور اس منصوبے پر تیاری کر رہا تھا کہ غزوۂ احزاب کی طرح عرب کے وحشی قبائل پھر متحد ہو کر مدینے پر دھاوا بول دیں۔

۳: عرب میں اُس وقت کوئی حکومت نہیں تھی کہ جس کے ذریعے دادرسی چاہی جاتی۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ آزاد اور مختار تھا۔ مدینے میں رسول اللہ ﷺ خود عوام کے سربراہ تھے۔ پس آپؐ کے فیصلے کے مطابق اپنی حفاظت کے لئے جو تدبیر کی گئی وہاں کے حالات کے مطابق اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں تھی۔

۴: یہود پہلے سے اسلام کے خلاف برسرپیکار تھے اور مسلمانوں اور یہود کے درمیان ایک نوع کی جنگ کی حالت قائم تھی۔

۵: اس وقت ایسے حالات تھے کہ اگر کھلے طور پر یہود کے خلاف فوج کشی کی جاتی تو اس سے بہت بڑا جانی اور مالی نقصان ہوتا اور یہ امکان بھی موجود تھا کہ جنگ کی آگ وسیع ہو کر ملک گیر تباہی کا رنگ پیدا کر دے۔

چنانچہ عملاً اور واقعاتی شہادتوں کے ساتھ یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ ایک فتنہ پرداز شخص کے قتل سے فریقین کے وسیع نقصان کی حفاظت ہو گئی۔

*****

3: عصماء بنت مروان

قائلین قتلِ شاتم نے مدینے کی ایک عورت عصماء بنت مروان کا واقعہ بھی اپنے موقف کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ واقدی اور بعض دوسرے موٴرّخین نے اسے جنگِ بدر کے بعد کے واقعات میں تحریر کیا ہے۔ مگر اس واقعے کا کتب حدیث اور صحیح مستند تاریخی روایات میں نشان نہیں ملتا۔ نیز اس واقعے پر درایت کی رُو سے بھی غور کیا جائے تو یہ درست ثابت نہیں ہوتا۔

یہ واقعہ یوں تراشا گیا ہے کہ مدینے میں ایک عورت عصماء نامی اسلام کی سخت دشمن تھی اور آنحضرت ﷺ کے خلاف بہت زہر فشاں تھی۔ وہ اپنے اشتعال انگیز اشعار میں لوگوں کو آپؐ کے خلاف بہت اُکساتی تھی اور آپؐ کے قتل پر انگیجنت کرتی تھی۔ (ابن ہشام اور واقدی نے بعض وہ اشتعال انگیز اشعار بھی نقل کئے ہیں جو عصماء نے آنحضرت ﷺ کے خلاف کہے تھے۔) (ابن ہشام، سریّۃ سالم ابن عمیر لقتل ابی عفک و کتاب المغازی للواقدی، ذکر سریّۃ قتل عصماء بنت مروان و ذکر سریّۃ قتل ابی عفک) آخر ایک نابینے صحابی عمیر بن عدی نے مشتعل ہو کر رات کے وقت اس کے گھر میں جبکہ وہ سو رہی تھی اسے قتل کر دیا اور جب آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے اس صحابی کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ ایک گونہ اس کے فعل کی تعریف کی۔ (ابن سعد، سریّۃ عمیر بن عدی و ابن ہشام، غزوۃ عمیر بن عدی الخطمی لقتل عصماء بنت مروان)

اس واقعے کو مستشرقین نے نہایت ناگوار صورت میں اپنی کتابوں کی زینت بنایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جرح اور تنقید کے سامنے یہ واقعہ درست ہی ثابت نہیں ہوتا۔ پہلی دلیل جو اِس کی صحت کے متعلق شبہ پیدا کرتی ہے، یہ ہے کہ کتبِ احادیث میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یعنی کسی حدیث میں قاتل یا مقتولہ کے نام کے ساتھ اس قسم کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا گیا۔

(ابو داؤد کتاب الحدود باب الحکم فی من سبّ، میں بیشک ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے جو عصماء کے قتل کے واقعے سے کچھ ملتا جلتا ہے۔ خصوصاً وہاں بھی عورت کا قاتل ایک نابینا ہے اور یہاں بھی۔ لیکن اوّل تو اس میں قاتل و مقتول کے نام بیان نہیں کئے گئے۔ دوسرے اس کی بعض تفصیلات بھی اس واقعے کی تفصیلات سے نہیں ملتیں۔ ابو داؤد کی یہ روایت بھی قتلِ شاتم کے ثبوت کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اس پر آئندہ صفحات میں الگ بحث کی جارہی ہے۔)

پھر عصماء کے واقعے کا حدیث ہونا تو دور کی بات ہے، اس کا تو بعض مؤرخین نے بھی ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ اگر حقیقت میں اس قسم کا واقعہ ہوا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ کتبِ حدیث اور بعض کتبِ تاریخ اس کے ذکر سے خالی ہوتیں۔

اس جگہ یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ چونکہ اس قسم کے واقعات سے بظاہر آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے خلاف ایک گونہ اعتراض وارد ہوتا تھا۔ اس لئے محدّثین اور بعض مؤرخین نے ان کا ذکر ترک کر دیا ہو گا۔ اس کی اوّل وجہ تو یہ ہے کہ اُن حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے جن میں وہ وقوع پذیر ہوئے، یہ واقعات قابل اعتراض نہیں ہیں۔ دوسرے جو شخص حدیث و تاریخ کا معمولی مطالعہ بھی رکھتا ہے، اس سے یہ بات مخفی نہیں ہو سکتی کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے جامع اور مستند ترین محدّث سے لے کر واقدی اور عبد الرزّاق جیسے وضّاعوں تک مسلمان محدّثین و مؤرخین نے کبھی کسی روایت کے ذکر کو محض اس بناء پر ترک نہیں کیا کہ اس سے اسلام اور بانیٔ اسلام پر بظاہر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مسلّمہ طریق تھا کہ جس بات کو بھی از روئے روایت صحیح پاتے یا سمجھتے تھے اُسے نقل کرنے میں وہ اس کے مضمون کی وجہ سے قطعاً کوئی تأمل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اُن میں سے بعض محدّثین اور اکثر مؤرخین کا تو یہ طریق تھا کہ آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کے متعلق جو بات بھی انہیں

پہنچتی تھی خواہ وہ روایت و درایت دونوں لحاظ سے کمزور اور ناقابلِ اعتماد ہوتی تو بھی وہ اُسے اپنے مجموعے میں جگہ دے دیتے تھے۔ وہ اس بات کا فیصلہ مجتہد علماء پر یا بعد میں آنے والے محققین پر چھوڑ دیتے تھے کہ وہ اصولِ روایت و درایت کے مطابق صحیح و سقیم کا خود فیصلہ کر لیں۔ ایسا کرنے میں اُن کی نیت یہ ہوتی تھی کہ کوئی بات جو آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی طرف منسوب ہوتی ہے خواہ وہ درست نظر آئے یا غلط، وہ ذخیرے میں شامل ہونے سے نہ رہ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کی ابتدائی کتابوں میں ہر قسم کے رطب و یابس کا ذخیرہ جمع ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ سب قابل قبول ہیں۔ بلکہ اب ہر اس محبّ و عاشقِ رسولؐ کا کام ہے جو تحقیق کی صلاحیّت رکھتا ہے کہ وہ قرآن کریم کو حَکَم بنا کر اس غبار کو جو ایسی غلط اور منفی روایات نے محسنِ انسانیت ہمارے آقا و مولیٰ رحمۃٌ للعالمین حضرت محمد مصطفی ﷺ کے پاک اور حسین چہرے پر ڈالا ہے، صاف کرنے کے لئے ان میں سے غلط کو صحیح، منفی کو مثبت اور کمزور کو مضبوط سے جدا کر دے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے مظہرِ اتمّ، انسانیت اورانسانی خون کے محافظ رسول اللہ ﷺ کی طرف غلط، منفی اور کمزور باتیں منسوب ہوں۔

بہر حال اس بات میں ذرّہ بھر بھی گنجائش نہیں ہے کہ کسی مسلمان محدّث یا مؤرّخ نے کبھی کسی روایت کو محض اس بناء پر ردّ کیا ہو کہ وہ بظاہر آنحضرت ﷺ یا صحابہؓ کی شان کے خلاف ہے یا یہ کہ اس کی وجہ سے آپؐ پر یا اسلام پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ چنانچہ کعب بن اشرف اور ابو رافع یہودی کے قتل کے واقعات جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے، نفسِ مضمون کے لحاظ سے عصماء اور اس قسم کے دیگر مزعومہ واقعات سے بالکل ملتے جلتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ حدیث اور تاریخ کی تمام کتابوں میں وہ پوری صراحت اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور کسی مسلمان راوی، محدّث یا مؤرّخ نے ان کو ترک نہیں کیا۔

اندریں حالات عصماء کے قتل کا ذکر کسی حدیث میں نہ پایا جانا، بلکہ ابتدائی مؤرّخین میں سے بعض مستند مؤرّخین کا بھی اس کے متعلق خاموش ہونا اس بات کو ایک حدّ تک یقینی بنا دیتا ہے کہ یہ قصہ بناوٹی ہے اور کسی طرح بعض روایتوں میں راہ پا کر تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔

پھر اگر اس کہانی کی تفصیلات کا جائزہ لیا جائے تو اس کے اندرونی تضادات و اختلافات سے اس کا وضعی ہونا اور بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تاریخ ابن سعد وغیرہ کی روایت میں عصماء کے قاتل کا نام عمیر بن عدی بیان کیا گیا ہے۔ سیرت کی کتاب 'الشفاء' میں عمیر بن عدی کو عصماء کی قوم (بنی خطمہ) کا ایک شخص قرار دیا ہے۔ (شرح الشفاء جلد 2 صفحہ 406 باب الاوّل فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ او نقص) لیکن اس کے مقابلہ میں ابن درؔید کی روایت میں قاتل کا نام عمیر بن عدی نہیں بلکہ غشیر ہے۔ (زرقانی، قتل عمیرٍ العصماءَ) سُہَیلی ان دونوں ناموں کو غلط قرار دے کر یہ کہتا ہے کہ دراصل عصماء کو اس کے خاوند نے قتل کیا تھا۔ (الرّوض الانف، غزوات علی ابن طالب الی الیمن) جس کا نام روایتوں میں یزید بن یزید بیان ہوا ہے۔ (ابن ہشام، غزوۃ عمیر بن عدی الخطمی لقتل عصماء بنت مروان) اور پھر بعض روایتوں میں یہ آتا ہے کہ مذکورہ بالا لوگوں میں سے کوئی بھی عصماء کا قاتل نہیں تھا بلکہ اس کا قاتل ایک نامعلوم الاسم شخص تھا جو اسی کی قوم میں سے تھا۔ (زرقانی، زرقانی، قتل عُمیرٍ العصماءَ) مقتولہ کا نام ابن سعد وغیرہ نے عصماء بنت مروان بیان کیا ہے، لیکن علّامہ عبد البرؒ کا یہ قول ہے کہ وہ عصماء بنت مروان نہیں تھی بلکہ دراصل عمیر نے اپنی بہن بنت عدی کو قتل کیا تھا۔ (الاستیعاب، عمیر بن عدیٍ الخطمیّ) قتل کا وقت ابن سعد نے رات کا درمیانی حصہ لکھا ہے لیکن زرقانی کی روایت سے دن یا زیادہ سے زیادہ رات کا ابتدائی حصہ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مقتولہ اُس وقت کھجوریں بیچ رہی تھی۔ (زرقانی، قتل عمیرٍ العصماءَ) الغرض قاتل اور مقتولہ کے اسماء، جملہ تفصیلات، کوائف، واقعات اور اوقات میں اس

قدر واضح اختلافات اس قصّہ کے وضعی اور جعلی ہونے پر کافی سے زیادہ مواد اور ثبوت مہیّا کرتے ہیں۔

چنانچہ ایسے اختلافات و تضادات سے پُر واقعات کو کسی عقیدے یا قانون کی بنیاد کے طور پر پیش کرنا نہ صرف انصاف کا خون کرنا ہے بلکہ نعوذ باللہ، رسول اللہ ﷺ کے مقدّس، رحیم و کریم، حسین اور پاک چہرہ کو داغدار کرنے کی جسارت ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اوّل تو عصماء کے قتل کا واقعہ روایتاً یا درایتاً درست ہی ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن بالفرض اگر اسے درست سمجھا بھی جائے تو یہ قتل کسی مسلمان کا انفرادی فعل تھا جو کسی انگیخت کے باعث اُس سے ذاتی طور پر سرزد ہوا تھا۔ شتم و توہینِ رسولؐ سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ نیز یہ کہ جیسا کہ ابن سعد کے بیان سے یقینی طور پر ثابت ہے، آنحضرت ﷺ نے اُن کے متعلق حکم نہیں دیا تھا۔ (ابن سعد، سریۃ عمیر بن عدی)

*****

4: ابو عفکؑ

مدّعیان قتلِ شاتم نے ابو عفک کے قتل کا واقعہ بھی اپنی دلیل کے طور پر درج کیا ہیں۔ عصماء کے واقعے کی طرح اسے بھی واقدی اور بعض دوسرے موؤخین نے جنگِ بدر کے بعد کے واقعات میں تحریر کیا ہے۔اس واقعہ کا بھی کتب حدیث اور صحیح تاریخی روایات میں نشان نہیں ملتا۔اور درایت کے لحاظ سے بھی یہ واقعہ درست ثابت نہیں ہوتا۔

اس فرضی واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بوڑھا یہودی ابو عفک نامی مدینہ میں رہتا تھا۔ یہ بھی آنحضرت ﷺ کے خلاف اشتعال انگیز شعر کہتا تھا۔ کفار کو آپؐ کے خلاف جنگ کرنے اور آپؐ کو قتل کر دینے کے لئے اُبھارتا تھا۔ آخر اُسے بھی ایک دن ایک صحابی سالم بن عمیر نے رات کے وقت اُس کے صحن میں قتل کر دیا۔(ابن سعد، سریۃ عمیر بن عدی و ابن ہشام، غزوۃ عمیر بن عدی الخطمی لقتل عصماء بنت مروان)اور ابن ہشام اور واقدی نے اس کے بھی وہ اشتعال انگیز اشعار تحریر کئے ہیں جو اس نے آنحضرت ﷺ کے خلاف کہے تھے۔ (ابن ہشام، سریۃ سالم ابن عمیر لقتل ابی عفک و کتاب المغازی للواقدی، ذکر سریۃ قتل عصماء بنت مروان و ذکر سریۃ قتل ابی عفک)اس واقعے کو بھی مستشرقین نے حسبِ معمول نہایت ناگوار صورت میں اپنی کتابوں کی زینت بنایا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جرح اور تنقید کے سامنے یہ واقعہ بھی عصماء کے واقعے کی طرح درست ثابت نہیں ہوتا۔

پہلی بات جو اِس کے وضعی ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے، یہ ہے کہ کتبِ احادیث میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔یعنی کسی حدیث میں قاتل یا مقتول کا نام لے کر اس قسم کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ابو عفک کے واقعے کو کسی طور پر بھی حدیث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس واقعہ کا تو یہ حال ہے کہ بعض موؤخین نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ حالانکہ اگر یہ واقعہ درحقیقت رونما ہوا ہوتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ کتبِ حدیث اور بعض کتبِ تاریخ میں اس کا ذکر

موجود نہ ہوتا۔ پس اس کے قتل کا ذکر حدیث کی کسی کتاب میں نہ پایا جانا، بلکہ ابتدائی مؤرّخین میں سے بعض مستند مؤرّخین کا بھی اس کے درج کرنے سے پہلو تہی کرنا اس بات کو گونہ یقینی بنا دیتا ہے کہ یہ قصہ بناوٹی ہے اور کسی طرح بعض روایتوں میں راہ پا کر تاریخ کا حصہ بن گیا ہے۔ الغرض اس قصّے کی جملہ تفصیلات، کوائف، واقعات اور زمانے میں اس قدر واضح اختلافات اس قصّہ کو وضعی اور جعلی ثابت کرتے ہیں۔

جیسا کہ ابن سعد اور واقدی وغیرہ نے ابوعفک کے قاتل کا نام سالم بن عمیر لکھا ہے لیکن بعض روایتوں میں اس کا نام سالم بن عمرو بیان ہوا ہے۔ (زرقانی، قتل ابوعفک الیہودی) اور ابن عقبہ نے سالم بن عبد اللہ بیان کیا ہے۔ (الاصابہ و الاستیعاب ذکر سالم بن عمیر) اسی طرح ابوعفک مقتول کے متعلق ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ یہودی تھا، لیکن واقدی اسے یہودی نہیں لکھتا۔ (کتاب مغازی للواقدی، سریّۃ قتل ابی عفک) پھر ابن سعد اور واقدی دونوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سالم نے خود جوش میں آکر ابوعفک کو قتل کر دیا تھا، لیکن ایک روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے آنحضرت ﷺ کی ہدایت سے قتل کیا گیا تھا۔ (ابنِ ہشام، سریّۃ سالم بن عمیر لقتل ابی عفک) زمانہ قتل کے متعلق بھی ابن سعد اور واقدی اسے عصماء کے قتل کے بعد رکھتے ہیں لیکن ابن اسحاق اور ابو الربیع اسے عصماء کے قتل سے پہلے بیان کرتے ہیں۔ (ابنِ ہشام، سریّۃ سالم بن عمیر لقتل ابی عفک وزرقانی، قتل عمیرٍ العصماء) الغرض یہ جملہ اختلافات رہنمائی کرتے ہیں کہ یہ قصہ جعلی اور وضعی ہے یا اگر اس قتل کی کوئی حقیقت یا وجہ ہے تو وہ ایسی مستور ہے کہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے۔

ایک اور دلیل عصماء اور ابوعفک کے قتل کے ان واقعات کے غلط ہونے کی یہ ہے کہ ان دونوں قصوں کا زمانہ وہ بیان کیا گیا ہے جس کے متعلق جملہ مؤرّخین کا اتفاق ہے کہ اس وقت

تک ابھی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی جھگڑا یا تنازعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ تاریخ میں غزوۂ بنی قینقاع کے متعلق یہ بات مسلّم طور پر بیان ہوئی ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان یہ پہلی لڑائی (اواخر 2ھ) تھی جو وقوع میں آئی اور یہ کہ بنو قینقاع وہ پہلے یہودی تھے جنہوں نے اسلام کی عداوت میں عملی کاروائی کی تھی۔ (ابنِ سعد، غزوۃ بنی قینقاع و ابنِ ہشام، امر بنی قینقاع و طبری سن 2ھ غزوۃ بنی قینقاع) پس یہ کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے کہ اس غزوے سے پہلے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس قسم کا قتل و خون ہو چکا تھا۔ پھر اگر غزوۂ بنو قینقاع سے قبل ایسے واقعات ہو چکے تھے تو یہ ناممکن تھا کہ اس غزوے کی وجوہات وغیرہ کے بیان میں ان واقعات کا ذکر نہ آتا۔ کم از کم اتنا تو ضروری تھا کہ یہودی لوگ جو اِن واقعات کی بناء پر مسلمانوں کے خلاف ایک ظاہری رنگ اعتراض کا پیدا کر سکتے تھے کہ انہوں نے ان کے ساتھ عملی چھیڑ چھاڑ کرنے میں پہل کی ہے۔ چنانچہ وہ ان واقعات کے متعلق واویلا کرتے۔ اگر کسی تاریخ میں حتّٰی کہ خود ان موٴرخین کی کتب میں بھی جنہوں نے یہ قصے روایت کئے ہیں قطعاً یہ ذکر نہیں ہے کہ مدینے کے یہود نے کبھی کوئی ایسا اعتراض کیا ہو۔ اگر کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو کہ شاید اُنہوں نے اعتراض اُٹھایا ہو مگر مسلمان موٴرخین نے اس کا ذکر نہ کیا ہو تو یہ ایک غلط اور بے بنیاد خیال ہو گا۔ کیونکہ جیسا کہ گزشتہ واقعے کے ذکر میں بیان کیا جا چکا ہے کبھی کسی مسلمان محدّث یا موٴرخ نے مخالفین کے کسی اعتراض پر پردہ نہیں ڈالا، چنانچہ مثلاً جب سریہ نخلہ والے قصے میں مشرکینِ مکہ نے مسلمانوں کے خلاف حرمت والے مہینوں کی بے حرمتی کا الزام لگایا تو مسلمان موٴرخین نے کمال دیانتداری سے اُن کے اس اعتراض کو اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔ پس اگر اس موقع پر بھی یہود کی طرف سے کوئی اعتراض ہوا ہوتا، تو تاریخ اس کے ذکر سے خالی نہ ہوتی۔ الغرض جس جہت سے بھی دیکھا جائے یہ قصے صحیح ثابت نہیں ہوتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو کسی مخفی دشمنِ اسلام یا ”اپنے ہی دوستوں“ نے کسی مسلمان کی طرف منسوب کر کے یہ قصے بیان کر

دیئے تھے اور پھر وہ مسلمانوں کی روایتوں میں دخل پا گئے۔ یا پھر کسی کمزور مسلمان نے اپنے قبیلے کی طرف یہ جھوٹا فخر منسوب کرنے کے لئے کہ اس سے تعلق رکھنے والے آدمیوں نے بعض موذی شریروں کو قتل کیا تھا، یہ روایتیں تاریخ میں داخل کر دیں۔ واللہ اعلم

الغرض اوّل تو ابو عفک یہودی کے قتل کا واقعہ عصماء کے واقعہ کی طرح روایتاً یا درایتاً درست ثابت ہی نہیں ہوتا اور اگر بالفرض اسے صحیح تسلیم کر بھی لیا جاوے تو یہ قتل بہر حال کسی مسلمان کا انفرادی فعل تھا جو کسی انگیخت کے باعث اُس سے سرزد ہوا۔ ابن سعد کے بیان سے یقینی طور پر ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس بارے میں کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ (بن سعد، سریّۃ عمیر بن عدی)

*****

5: عقبہ بن ابی معیط

قریشِ مکّہ میں سے آنحضرت ﷺ کے دشمنِ بغیض عُقبہ بن ابی مُعیط کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ غزوۂ بدر کے قیدیوں میں تھا۔ چونکہ اس نے آپؐ کی توہین کی تھی، لہٰذا آپؐ نے اسے قتل کروا دیا تھا۔ چنانچہ سپین کے قاضی عیاض نے اپنی کتاب ''الشفا'' میں لکھا ہے کہ عقبہ بن ابی معیط کے بارہ میں بزّار نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ عقبہ بلند آواز سے پکارا کہ اے قریش مجھے کیوں قتل کیا جارہا ہے جبکہ میں تمہارے پاس محبوس ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تیرے کفر کی وجہ سے اور رسول اللہ پر افتراء کی وجہ سے۔

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مستند روایت نہیں ہے۔ چنانچہ اس روایت پر ملّا علی القاریؒ نے لکھا ہے کہ بزّار نے یہ روایت ابن عباس کی طرف ضعیف سند کے ساتھ منسوب کی ہے۔ (شرح الشفا: القسم الرابع فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ او نقص صفحہ 405)

علاوہ ازیں معمولی سی تحقیق سے اس روایت کی حقیقت کھل جاتی ہے کہ یہ روایت وضعی ہے۔ اس واقعے کی حقیقی اور اصل تفصیل یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں ستّر کفار کو قیدی بنایا گیا تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو آنحضرت ﷺ کی تکفیر، تکذیب، آپؐ پر افتراء، آپؐ پر ظلم و تشدّد اور آپؐ کی شدید اور کھلی کھلی ہتک و توہین کے مرتکب تھے۔ جنگِ بدر میں بھی وہ آپؐ کے قتل کے لئے ہی مکہ سے آئے تھے۔ اس لحاظ سے ان سب قیدیوں پر ایک ہی فردِ جرم یکساں عائد ہوتی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان سب کو کیوں قتل نہ کیا گیا؟ ان میں سے صرف ایک کو کیوں قتل کیا گیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ قصّہ ہی جھوٹا اور وضعی ہے۔ غزوۂ بدر میں عقبہ بن ابی معیط قید ہی نہ ہوا تھا۔ لہٰذا ممکن ہی نہ تھا کہ وہ قیدیوں میں شامل ہوتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مستند ترین اور صحیح ترین مرفوع متصل روایات سے ثابت شدہ حقیقت یہ ہے کہ عقبہ بن ابی معیط بدر کی لڑائی کے دوران میدانِ طور پر قتل ہوا اور وہ ان مقتولوں میں سے تھا جنہیں بدر میں ہی ایک ہی گڑھے میں اکٹھا دبا دیا گیا تھا۔ صحیح اور مکمل سند کے ساتھ صرف بخاری ہی میں یہ روایت تین مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ (بخاری کتاب الوضوء باب اذا القی علی ظھر المصلّی قذر و کتاب الصلٰوۃ باب المرأۃ تطرح عن المصلّی شیئاً من الاذی و کتاب الجزیۃ باب طرح جیف المشرکین....... وابن سعد)

پس یہ قصّہ نہ روایت کے اعتبار سے درست ثابت ہوتا ہے، نہ درایت کے لحاظ سے، اور نہ ہی مستند تاریخی حقائق کے آئینے میں۔ پس اس کی جنگی حالت کو شتمِ رسولؐ کی سزا کے طور پر پیش کرنا رسول اللہ ؐکی پاک سیرت سے بد دیانتی ہے۔

*****

6: زینب بنت الحارث

ایک واقعہ اُس یہودیہ کے قتل کا پیش کیا جاتا ہے جس نے خیبر میں آنحضرت ﷺ کو زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی بلکہ عملاً زہر دے دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گستاخِ رسول ؐ تھی اس لئے اسے قتل کر دیا گیا۔

تفصیل اس واقعے کی یہ ہے کہ فتح خیبر کے بعد وہاں کے مقامی لوگوں کو خیبر میں رہنے کی اجازت کے ساتھ عام آزادی مل چکی تھی اور ان کے روز مرّہ کے کام کاج اب معمول پر آنے لگے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی ابھی وہیں قیام فرما تھے۔ اس دوران یہودیوں نے آپؐ کے قتل کی انتہائی مجرمانہ سازش تیّار کی۔ اس کے لئے انہوں نے باقاعدہ مشورہ کر کے زینب بنت الحارث کو تیار کیا۔ یہ خیبر کے مشہور جنگجو پہلوان مرحب کی بہن تھی اور ایک یہودی سردار سلّام بن مِشکَم کی بیوی تھی۔ اس نے حسبِ سازش انتہائی اخلاص ظاہر کیا اور آپؐ کے لئے اور آپؐ کے صحابہؓ کے لئے بکری کا بُھنا ہوا گوشت بھجوانے کی درخواست کی جسے آپؐ نے قبول فرمایا۔ اس نے یہ پتہ کر لیا تھا کہ آپؐ کو بکری کی دستی (یعنی اگلی ٹانگ کے اوپر والے حصے) کا گوشت مرغوب ہے۔ چنانچہ اس نے وہ گوشت بھونا اور اس میں زہر ملایا اور خصوصاً دستی کو خوب زہر آگیں کیا۔ (زرقانی وابنِ ہشام بقیۃ امر خیبر امر الشاۃ المسمومۃ)

نماز مغرب کے بعد جب آنحضرت ﷺ اپنے خیمے کو لوٹے تو اس کو دروازے پر انتظار کرتے پایا۔ آپؐ نے وجہ پوچھی تو اس نے عرض کی کہ وہ آپؐ کے لئے اور صحابہؓ کے لئے بکری کا بھنا ہوا گوشت لائی ہے۔ آپؐ نے حسبِ وعدہ اس کی اس پیشکش کو قبول فرمالیا۔ (ابنِ ہشام بقیۃ امر خیبر امر الشّاۃ المسمومۃ وواقدی) جب سب اکٹھے ہو کر کھانے کے لئے بیٹھے تو آپؐ نے اس گوشت سے ایک لقمہ لیا۔ اسی لمحے دیگر صحابہؓ نے بھی اس گوشت کی طرف ہاتھ بڑھائے

اور بعض نے لقمے منہ میں بھی ڈال لئے۔ حضرت بِشر بن البراءؓ جو آپؐ کے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بھی لقمہ لیا اور کھالیا۔ آنحضرت ﷺ نے لقمہ ابھی تھوڑا ہی چبایا تھا کہ آپؐ کو زہر کا علم ہو گیا۔ آپؐ نے فوراً سب صحابہؓ کو اس گوشت سے ہاتھ کھینچ لینے کا ارشاد کرتے ہوئے فرمایا: ''دستی کی ہڈی مجھے بتا رہی ہے کہ اسے زہر میں بجھایا گیا ہے۔''لیکن قبل اس کے کہ آپؐ اسے کھانے سے منع فرماتے، حضرت بِشرؓ لقمہ نگل چکے تھے۔(زرقانی و ابنِ ہشام بقیۃ امر خیبر امر الشاۃ المسمومۃ)

یہ بالکل واضح تھا کہ آنحضرت ﷺ کو قتل کرنے کی یہ ایک کھلی کھلی کوشش تھی۔ چنانچہ آپؐ نے اس عورت کو بلوایا جس نے اس سازش کو عملی جامہ پہنایا تھا اور اس سے اس جرم کی وجہ دریافت فرمائی۔ اس نے یہ عذر پیش کیا کہ آپؐ نے ان کی قوم کا جو حال کیا ہے، وہ آپؐ سے مخفی نہیں۔ اس لئے انہوں نے سوچا کہ اگر آپؐ نبی ہیں تو آپؐ کو کوئی ضرر نہیں پہنچے گا اور اگر آپؐ بادشاہ ہیں تو وہ آپؐ سے نجات پا جائیں گے۔ آنحضرت ﷺ نے اسے درگزر فرمایا اور اس سے کوئی انتقام نہ لیا۔(ابو داؤد کتاب الدّیات باب فیمن سقی رجلاً سمّاً......)

ابو داؤد اور دیگر کتب میں مذکور روایات میں یہ کثرت سے مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس یہودیہ سے درگزر فرمایا اور اس سے کوئی انتقام نہ لیا۔ آپؐ کی مستقل سنّت سے بھی یہی ثابت ہے کہ آپؐ نے ہمیشہ ظلم کا انتقام عفو سے لیا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کسی نے آپؐ کو تکلیف بھی پہنچائی تو بھی آپؐ نے کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہاں جب کسی قابلِ احترام مقام یا چیز کی ہتک اور بے حرمتی کی جاتی جسے اللہ تعالیٰ نے حرمت بخشی ہو تو آپؐ اللہ تعالیٰ کی خاطر انتقام لیتے۔(مسلم کتاب الفضائل باب مباعدتہ امن الاثام و اختیارہ) اسی طرح آپؐ نے تعزیری کارروائی صرف اس شخص پر کی جو کوئی عادی مجرم تھا اور اس کی طرز ایسی تھی کہ وہ آئندہ بھی ایسے جرم کا اعادہ

کرنے والا تھا اور اس کا وجود لازماً بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا تھا۔ ان حقائق کے پیشِ نظر یہی بات صحیح ہے کہ آپؐ نے اس کو کوئی سزا نہیں دی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کئی ایک روایات میں یہ ذکر بھی موجود ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ مثلاً ابو داؤد میں ہی ایسی دونوں روایتیں ایک ساتھ مذکور ہیں اس کے لئے دیکھیں ابو داؤد کتاب الدّیات باب ماجآء فی من سقی رجلاً سمًّا........۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے اس سے پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا تو وہ کہنے لگی کہ یہودی آپؐ کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: " اللہ تعالیٰ تمہیں ہرگز ایسا نہیں کرنے دے گا۔" اس نے کہا کہ کیا وہ آپؐ کو قتل نہیں کر سکتے؟ آپؐ نے فرمایا: " نہیں۔" (مسلم کتاب السلام باب السّم) حضرت بِشر بن البراءؓ اس زہر کے اثر سے جانبر نہ ہو سکے۔ اور جامِ شہادت نوش کر گئے۔

اگر بظاہر متضاد ان دونوں روایات کو بیک وقت درست تسلیم کر لیا جائے تو ان میں پیدا شدہ تضاد کا حل یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے اسے معاف کیا تو اس وقت حضرت بِشرؓ زندہ تھے۔ اس لئے اگر اسے اس وقت سزا دی جاتی تو یہ سزا آپؐ کو زہر دینے کی وجہ سے آپؐ کی طرف سے انتقام سمجھی جاتی۔ لیکن آپؐ نے اپنی رحیمانہ سنّت کے تحت اس سے عفو و درگزر کا سلوک کیا اور اسے کچھ نہ کہا اور آئندہ بھی اسے کچھ نہ کہا جاتا لیکن اس کے بعد جب حضرت بِشرؓ کی وفات ہو گئی تو پھر اسے قصاص کے طور پر قتل کر دیا گیا۔ واللہ اعلم

یہ تو اس واقعہ کی حقیقت اور تفصیل تھی مگر سوال یہ ہے کہ اس پورے واقعہ میں ہتکِ رسولؐ کا کون سا موقع اور کون سا محل ہے؟ اس واقعہ کا سبّ و شتمِ رسولؐ سے دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر قاری خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ توہینِ رسولؐ کا معاملہ تھا یا ایک کھلی کھلی محاربت

تھی اور اس میں رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کا کھلا کھلا اور ثابت شدہ اقدام تھا۔ پس اس یہودیہ کو شاتمِ رسولؐ قرار دینا اور اس کا اگر بطور قصاص قتل ہوا بھی تھا تو اسے گالی کا انتقام قرار دینا آپؐ پر افتراء ہے۔ آپؐ کی طرف ایک ایسا فعل منسوب کرنے کی جسارت ہے جو آپؐ نے نہیں کیا۔

*****

7: گالیاں دینے والی ایک عورت

روایت ہے کہ ایک عورت حضور ﷺ کو گالیاں دیتی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: مَنْ یَکْفِیْنِیْ عَدُوِّی۔ کہ میرے لئے میرے دشمن کو کون کفایت کرے گا؟ حضرت خالدؓ نے عرض کی یارسول اللہ: "میں۔ اس پر آپؐ نے اجازت دی اور انہوں نے اسے قتل کر دیا۔" اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"وَ رُوِیَ اَیْضًا اَنَّ امْرَأَۃً کَانَتْ تَسُبُّہُ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ فَقَالَ مَنْ یَکْفِیْنِیْ عَدُوِّی فَخَرَجَ اِلَیْھَا خَالِدُ بْنُ الْوَلِیْدُ فَقَتَلَھَا۔" (شرح الشفا: القسم الرابع فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ اونقص صفحہ 406) ترجمہ: اور یہ روایت کی گئی ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتی تھی۔ آپؐ نے فرمایا! کون ہے جو میرے لئے میرے دشمن کے مقابل پر کافی ہو گا۔ اس کے لئے خالد بن ولیدؓ روانہ ہوئے اور اسے قتل کر دیا۔

کوئی ایک لمحے کے لئے ذرا سوچے تو سہی کہ وہ لوگ جو بدر، احد، احزاب، خیبر، حنین اور موتہ جیسے غزوات میں طاقت و تعداد میں اپنے سے کئی گنا زیادہ افواج سے ٹکرانے والے تھے اور سلطنتوں کو فتح کرنے والے تھے، ایک عورت کی گالیوں سے پریشان ہو رہے تھے!!

اس جملۂ معترضہ کے بعد عرض ہے کہ جیسا کہ واضح ہے یہ روایت صحاح ستّہ میں سے کسی مجموعے میں نہیں ہے، احادیث کے دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے مجموعوں میں بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے اسی محوّلہ بالا کتاب کے حاشیے میں ملّا علی القاریؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ روایت بھی مصنف عبد الرزّاق کی ہے۔

(امام ہمام) عبد الرزّاق کے بارے میں آگے ذکر آئے گا کہ وہ روایات وضع کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا اور اسے ائمّۂ فنِّ حدیث واقدی سے بھی پرلے درجے کا کذّاب ثابت کر چکے ہیں۔ لہٰذا یہ روایت کلّیۃً وضعی اور قطعی طور پر جھوٹی ہے۔

اس روایت کی ابتداء ہی میں لفظ ' رُوِیَ' بتا رہا ہے کہ اس کا راوی مجہول و نامعلوم ہے۔ لہٰذا واضح طور پر یہ غیر مستند ثابت ہوتی ہے۔ یعنی اس روایت کا نہ کوئی راوی ہے اور نہ ہی اس عورت کا نام اور اتا پتا معلوم ہے جو قتل کی گئی۔ پس اپنے جملہ کوائف کے نامعلوم اور مفقود ہونے کے باعث یہ روایت وضعی اور جعلی ہونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہٰذا ایک جنبشِ قلم ردّ ہو جاتی ہے۔ ایسی روایات پر عقائد کی بنیاد رکھنا پانی کی لہروں پر تحریر جمانے کی کوشش سے کم نہیں ہے۔

*****

8: ایک شاتم یہودیہ

آنحضرت ﷺ کو گالیاں دینے والی ایک یہودیہ کا قتل بھی عقیدہ قتلِ شاتم کے اثبات میں پیش کیا جاتا ہے۔

تحقیق ثابت کرتی ہے کہ روایت قطعی طور پر جھوٹی ہے۔ چنانچہ ملاّ علی قاریؒ نے ایسی ہی بے بنیاد ایک اور روایت بھی درج کی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس قسم کی بے بنیاد اور من گھڑت روایتیں جابجا نظر آتی ہیں۔ وہ روایت یہ ہے کہ

''وَ رَوَی ابْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ عَنِ الشَّعْبِیِّ اَنَّ رَجُلاً مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ کَانَ یَأْوِیْ اِلَی امْرَأَۃٍ یَھُوْدِیَۃٍ تُطْعِمُہٗ وَ تُحْسِنُ اِلَیْہِ وَلَا تَزَالُ تُؤْذِیْہِ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَتَلَھَا فِیْ لَیْلَۃٍ مِّنَ اللَّیَالِیْ خَنْقًا فَرَفَعَ ذٰلِکَ لَہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ فَأَخْبَرَہُ الرَّجُلُ بِأَنَّھَا کَانَتْ تُؤْذِیْہِ فِیْہِ وَ تَسُبُّہٗ وَ تَقَعُ فِیْہِ فَقَتَلَھَا لِذٰلِکَ اَھْدَرَ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَسَلَّم دَمَھَا۔'' (شرح الشفا: القسم الرابع فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ او نقص صفحہ 406) کہ ایک مسلمان شخص ایک یہودیہ کے ہاں پناہ گزیں تھا جو اسے روٹی پانی دیتی تھی اور اس پر مہربان تھی مگر ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اسے اذیت دیتی تھی۔ چنانچہ ایک رات اس شخص نے اسے گلا گھونٹ کر مار دیا۔ پھر اس نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ وہ عورت آپؐ کو گالیاں دے کر اسے اذیت دیتی تھی۔ لہٰذا اس نے اسے قتل کر دیا۔ اس پر آپؐ نے اس کا خون رائیگاں قرار دیدیا۔

اس روایت میں ایک راوی ابن ابی شیبہ ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے کہ ''وَلَہٗ اَوْھَامٌ'' کہ وہ خود ہی کوئی بات سوچ لیتا تھا یا وہ وہمی تھا یا لوگ اس کے بارے میں وہم رکھتے تھے یعنی وہ کوئی مستند شخص نہ تھا۔ پھر اس قصّے میں نہ مقتول یہودیہ کے نام کا ذکر ہے، نہ قاتل مسلمان

کی کوئی شناخت مذکور ہے۔ کس علاقے میں وہ پناہ گزین تھا اور چھپنے کی وجہ کیا تھی وغیرہ وغیرہ ایسے سوالات ہیں جن کا اس روایت سے کوئی جواب نہیں ملتا۔ ایسی مبہم اور مجہول الحال روایت کس طرح کسی عقیدے یا قانون کی تقویت کا باعث بن سکتی ہے۔ بلکہ ایسی روایت تو عقائد کی بنیاد کو کمزور اور کھوکھلا کرتی ہے۔

اس کہانی میں مذکور واضح اندرونی تضاد کو محسوس کرنا بھی ضروری ہے کہ ایک تو وہ عورت اسے پناہ دے رہی ہے اور دوسرے رسول اللہ ﷺ کو گالیاں بھی دے رہی ہے۔ اگر وہ آپؐ کی دشمن اور بدخواہ تھی تو وہ یہ جانتے ہوئے کہ وہ آپؐ کا پیروکار ہے، اس کو پناہ کس طرح دے سکتی تھی؟

علاوہ ازیں قاتل کا یہ فعل کوئی قابلِ تعریف تو نہیں ہے کہ اسے اسلام کی عظمت کے طور پر پیش کیا جائے کہ ایک مہمان مردرات کی تاریکی میں (غالباً سوئی ہوئی) عورت کا گلا گھونٹ دے۔ یہ تو اس شخص کی بزدلی پر دلیل اور مذہب پر داغ لگانے والی بات ہے۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ دیگر جو قصّے عورتوں کے قتل پر مشتمل ہیں، تقریباً ان سب میں بھی ایسی ہی غفلت کی حالت میں ان کو قتل کرنے کی کہانی موجود ہے۔ جس سے ایک یقینی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ قصّے وضعی اور خود تراشیدہ ہیں۔

اُس مسلمان کا عمل حسبِ ذیل فرمانِ خدا کے مطابق یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ ایسی گستاخ عورت کو قتل کرنے کی بجائے اس کے گھر کو چھوڑ جاتا اور ایک لمحے کے لئے بھی وہاں نہ ٹھہرتا۔ چنانچہ ایسی صورتحال کے بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَذَّبَ بِهِ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ قُل لَّسْتُ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍo لِّكُلِّ نَبَإٍ مُّسْتَقَرٌّ وَسَوْفَ تَعْلَمُونَo وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوضُونَ فِيْ آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّى يَخُوضُواْ فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلاَ تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ(الانعام:67 تا69)

ترجمہ : اور تیری قوم نے اس کو جھٹلا دیا ہے حالانکہ وہی حق ہے۔ تو کہہ دے کہ میں تم پر ہرگز نگران نہیں ہوں۔ ہر پیش خبری کا ایک وقت اور ایک جگہ مقرر ہے اور عنقریب تم جان لوگے۔ اور جب تو دیکھے اُن لوگوں کو جو ہماری آیات سے تمسخر کرتے ہیں تو پھر ان سے الگ ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ اور اگر کبھی شیطان تجھ سے اس معاملہ میں بھول چوک کروادے تو یہ یاد آجانے پر ظالم قوم کے ساتھ نہ بیٹھ۔

*****

دشمن کے لئے کافی ہونا اور خون کا اکارت جانا:

ایسی روایات میں ہر قاری دیکھ سکتا ہے کہ انہیں گھڑنے والے ٹکسالی کے یہ دو جملے مسلسل لکھتے چلے گئے ہیں کہ ” مَنْ يَكْفِيْنِيْ عَدُوِّی “ کہ میرے لئے کون میرے دشمن سے نپٹے گا اور ’فَاَهْدَرَدَمَهٗ‘ یا ’دَمَهَا‘ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا خون رائیگاں قرار دے دیا۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہو گی کہ فقرہ ”مَنْ يَكْفِيْنِيْ عَدُوِّی “ صحاح ستّہ میں ایک جگہ بھی مذکور نہیں ہے۔ نہ مؤطا امام مالک میں موجود ہے جو کہ سب سے پہلا اور آنحضرت ﷺ سے سب سے قریبی زمانہ کا مجموعہ ٔ احادیث ہے۔ پس ان اوّلین اور مستند ترین مجموعوں کی روایات میں ایسے فقرے کا نہ ہونا اور مستند ریکارڈ میں نہ آنا ایک

حیرت انگیز معمّہ ہے۔ اگر ایسا کہنا رسول اللہ ﷺ کی عادت یا سنّت ہوتی جو بار بار ظاہر ہوتی تھی تو کم از کم ایک آدھ مرتبہ ہی یہ فقرہ کسی مستند روایت میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا بالکل نہیں ہوا۔ پس اس معمّے کا بظاہر حل یہی دکھائی دیتا ہے کہ ایسی روایات وضعی اور جھوٹی ہیں لہٰذا قابلِ ردّ ہیں۔ اس نتیجے تک پہنچنے اور اس کے ثبوت کو بپایہ یقین تک پہنچانے کے لئے عبد الرّزّاق اور عکرمہ مولیٰ ابن عباس کا نام کافی ہے۔ اس میں اگر کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے تو وہ بیہقی بھی پوری کر دیتا ہے۔

جہاںتک فقرہ 'فَاَھْدَرَدَمَہٗ' یا 'دَمَھَا' کا تعلق ہے، تو یہ راوی کا بیان ہے جس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ کو گالی دیتا تھا یا دیتی تھی اور اسے کوئی قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون رائیگاں قرار دے دیا جاتا تھا۔ یہ رسول اللہ ﷺ پر ایک مفتریانہ جسارت ہے۔ اس فقرے کا مطلب قاتل اور وقوعے کا واقعۂ قتل کی نوعیت کے پیشِ نظر یہ ہے کہ چونکہ اس مقتول یا مقتولہ کا کوئی وارث نہیں تھا یا قاتل کے سوا کوئی اور شاہد نہیں تھا۔ لہٰذا اس مقتول یا مقتولہ کا خونبہا کسی کو ادا کرنا ممکن نہ تھا۔ ایسے مقدمے میں اگر فیصلہ اس طرح ہوا تھا تو یہ اس مقدمے کی اپنی ایک منفرد نوعیت تھی، کسی مستقل قانون کی حیثیت نہ تھی۔ مگر 'اپنے ہی دوستوں' نے اس فقرے کو ہر وضعی اور جعلی روایت کے ساتھ منسلک کر کے اسے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک

* * * * *

9: شاتم یہودیہ۔ایک اور روایت

سنن ابی داوٗد میں ہے:" حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِیْ شَیْبَۃَ وَ عَبْدُ اللّٰہِ بْنِ الْجَرَّاحِ عَنْ جَرِیْرٍ عَنْ مُغِیْرَۃَ عَنِ الشَّعْبِیِ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّ یَھُوْدِیَۃً کَانَتْ تَشْتُمُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَ تَقَعُ فِیْہِ فَخَنَقَھَا رَجُلٌ حَتّٰی مَاتَتْ فَاَبْطَلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم دَمَھَا۔"(ابو داوٗد کتاب الحدود باب الحکم فیمن سبّ النبی ﷺ) کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی عورت آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی، آپؐ کی بدگوئی اور آپؐ پر ذمّ کرتی تھی۔ ایک شخص نے اس کا گلا گھونٹ دیا یہاں تک کہ وہ مرگئی تو رسول اللہ ﷺ نے اس کا خون باطل قرار دے دیا۔ (یعنی اس کا بدلہ نہ دلوایا)

یہ روایت صحاح ستّہ میں سے سنن ابی داوٗد میں مذکور ہے۔ مگر یہ گزشتہ روایات میں مذکور انہی کوائف کے نہ ہونے کے باعث محلِّ نظر ہے۔ یعنی نہ مقتولہ کے نام اور جگہ کا علم ہے نہ قاتل کے نام و شناخت کا ذکر ہے۔ کس علاقے میں کب یہ واقعہ ہوا، اس کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس میں لکھا ہے "کَانَتْ تَشْتُمُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم "کہ وہ آنحضرت ﷺ کو گالیاں دیا کرتی تھی۔ یعنی یہ اس کی مستقل عادت تھی۔ اگر ایسا تھا تو اسے اتنی مہلت کیوں دی گئی؟ اتنا انتظار کیوں کیا گیا؟ اگر گالیوں کی سزا قتل تھی تو شروع ہی میں اسے قتل کر دیا ہوتا۔

یہ روایت اپنے تمام کوائف کے ساتھ اسی واقعے کی نشاندہی کرتی ہے جس کا ذکر گزشتہ روایت میں گزر چکا ہے۔ اس میں فرق صرف یہ ہے کہ یہ روایت سنن ابی داوٗد میں مذکور ہے اور اس کی سند بھی موجود ہے۔

جہاںتک اس کی سند اور احوالِ رواۃ کا تعلق ہے تو اس روایت کا ایک راوی مغیرہ ہے جسے تدلیس سے متّہم کیا گیا ہے۔ یعنی وہ خود روایات گھڑ تا ہے۔ ابن حبّان نے اسے مدلِّس قرار دیا ہے یعنی اس روایت میں ملاوٹ یا تحریف کی گئی ہے۔ اس روایت میں ابن ابی شیبہ کا نام بھی آتا ہے۔ اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ " وَلَہُ اَوْھَامٌ " کہ وہ وہمی تھا۔ تیسرا راوی عبد اللہ بن الجرّاح ہے۔ جس کے متعلق لکھا ہے کہ "یُخْطِئُ" وہ خطا کار ہے۔ ابو حاتم الرّازی نے اسے "کَثِیْرُ الْخَطَاءِ" یعنی کثرت سے غلطیاں کرنے والا قرار دیا ہے۔ پس ایسے مشکوک اور کمزور راویوں والی روایت کسی عقیدے یا قانون کے لئے بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

شاتم عورت کے قتل پر مبنی مذکوہ بالا روایات ایک ہی طرح کی ہیں۔ کچھ معمولی تبدیلی کے ساتھ مختلف کتب میں مختلف راویوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ درج ہوئی ہیں۔ اسی طرح یہ سب روایات بنیادی طور پر ابتداء میں بیان شدہ روایت بابت عصماء بنت مروان سے ملتی جلتی ہیں۔ ان کے راویوں میں اور نفسِ واقعہ میں واضح طور پر اضطراب کا پایا جانا ان کے غیر مستند ہونے کی کافی دلیل ہے۔

*****

10: زندیق سوزی

شاتمِ رسولؐ کی سزا قتل ہے،اس کی تائید میں یہ بھی بار بار کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایسے لوگوں کو جلا دیا تھا۔ اس کے تحت جس روایت کا ذکر کیا جاتا ہے،اس کا مکمل متن حسبِ ذیل ہے:

''عَنْ عِكْرِمَةَ قَالَ: أُتِيَ عَلِيٌّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ بِزَنَادِقَةٍ۔ فَأَحْرَقَهُمْ۔ فَبَلَغَ ذٰلِكَ ابْنَ عَبّاسٍ، فَقَالَ: لَوْكُنْتُ اَنَا لَمْ اُحْرِقْهُمْ۔ لِنَهْىِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ، لَا تُعَذِّبُوْا بِعَذَابِ اللّٰهِ، وَلَقَتَلْتُهُمْ لِقَوْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم ''مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ''(صحیح بخاری کتاب الجہاد والسیر باب لَا يُعَذَّبُ بِعَذَابِ اللّٰهِ)

عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس کچھ زندیق پیش کئے گئے۔ آپؓ نے ان کو جلا دیا۔ یہ خبر جب ابن عباسؓ کو پہنچی تو آپؓ نے فرمایا : اگر میں ہوتا تو انہیں نہ جلاتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا عذاب دینے سے منع فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ خود دیتا ہے۔ البتہ آپؐ کے اس قول کے مطابق میں انہیں لازماً قتل کرتا کہ جو اپنا دین بدلے اسے قتل کردو۔(جب یہ واقعہ ہوا،اس وقت حضرت ابن عباسؓ بصرہ میں حضرت علیؓ کے مقرر کردہ امیر تھے۔)

زندیق وہ ہوتا ہے جو ظاہر میں تو اپنا اسلام دِکھائے مگر دل کا کفر چھپائے۔ کہتے ہیں کہ یہ فارسی فقرے'' زندہ کردای'' سے معرّب (یعنی اسے عربی بنایا گیا) ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کثرت استعمال سے کردای کا 'ک' زندہ کے ساتھ لگا رہ گیا اور اگلے حروف کالعدم ہو گئے اور 'زندک' پھر مستقل زندیق شکل اختیار کر گیا(واللہ اعلم)۔ اس کے معنے ہیں۔ زندہ کرنا۔ اس سے اصطلاحاً ملحد مراد ہے، کہ يَدَّعِي اَنَّهُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً اٰخَرَ۔ وہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود قرار دیتا

ہے۔ پس سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس روایت میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ وہ زندیق تھے اور اس روایت میں ایک ذرّہ بھر بھی یہ ذکر نہیں ہے کہ وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے شاتم تھے یا آپؐ کی توہین کرتے تھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ جب یہ روایت کتاب الجہاد والسیر میں لائے ہیں تو وہاں اس سے پہلے آنحضرت ﷺ کا وہ ارشاد بھی لائے ہیں جس میں آپؐ نے اللہ تعالیٰ کا حوالہ دے کر کسی کو جلانے سے قطعی طور پر منع فرمایا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہمیں دو آدمیوں کے لئے بھجوایا کہ اگر تم فلاں اور فلاں کو پاؤ تو انہیں آگ میں جلا دو۔ جب ہم روانہ ہونے لگے تو آپؐ نے فرمایا: ''اِنِّی اَمَرْتُکُمْ اَنْ تُحْرِقُوْا فُلَاناً فُلَاناً وَاِنَّ النَّارَ لَا یُعَذِّبُ بِهَا اِلَّا اللّٰهُ فَاِنْ وَجَدْتُمُوْهُمَا فَاقْتُلُوْهُمَا۔'' کہ میں نے فلاں فلاں کو جلانے کا کہا تھا مگر آگ سے تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی عذاب نہیں دیتا۔ لہٰذا اگر تم انہیں پاؤ تو انہیں قتل کر دینا۔

یہاں امام بخاریؒ نے اس باب کے عنوان اور اس کی پہلی روایت کے ذریعے بتا دیا ہے کہ اس کے تحت وہ روایت جس میں لوگوں کو جلانے کا ذکر ہے، اگر اس سے مراد زندوں کو جلانا ہے تو یہ آنحضرت ﷺ کے واضح حکم اور اللہ تعالیٰ کے فرمان سے متصادم ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ پھر یہ روایت کتاب استتابۃ المرتدّین والمعاندین و قتالھم بالحکم المرتدّ والمرتدّۃ واستتابتھم میں بھی لائے ہیں۔ اس روایت سے پہلے آپؒ نے حسبِ ذیل آیات اس طریق اور اس ترتیب پر پیش فرمائی ہیں:

''وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی (کَیْفَ یَهْدِیْ اللّٰهُ قَوْماً کَفَرُواْ بَعْدَ إِیْمَانِهِمْ وَشَهِدُواْ أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءهُمُ الْبَیِّنَاتُ وَاللّٰهُ لاَ یَهْدِیْ الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ ○ أُوْلَـئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَیْهِمْ

لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلآئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ Oخَالِدِيْنَ فِيْهَا لاَ يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلاَ هُمْ يُنظَرُونَ Oإِلاَّ الَّذِيْنَ تَابُواْ مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُواْ فَإِنَّ اللّٰه غَفُورٌ رَّحِيْمٌ Oإِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُواْ بَعْدَ إِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُواْ كُفْراً لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُوْلَـئِكَ هُمُ الضَّآلُّونَO)

وَقَالَ(يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوَاْ إِن تُطِيْعُواْ فَرِيْقاً مِّنَ الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيْمَانِكُمْ كَافِرِيْنَO)

وَقَالَ(إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ ثُمَّ كَفَرُواْ ثُمَّ آمَنُواْ ثُمَّ كَفَرُواْ ثُمَّ ازْدَادُواْ كُفْراً لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلاَ لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلاًO)

وَقَالَ(مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِيْنِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِيْنَO)

وَقَالَ(مَن كَفَرَ بِاللّٰهِ مِن بَعْدِ إِيْمَانِهِ إِلاَّ مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالإِيْمَانِ وَلَـكِن مَّن شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْراً فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ Oذَلِكَ بِأَنَّهُمُ اسْتَحَبُّواْ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الآخِرَةِ وَأَنَّ اللّٰهَ لاَ يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِيْنَOأُولَـئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ وَأُولَـئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَOلاَ جَرَمَ (يَقُوْلُ حَقًّا) أَنَّهُمْ فِي الآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرونَ) اِلٰى (لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ)

وَقَالَ) وَلاَ يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىَ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُواْ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُوْلَـئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ وَأُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَO)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:(بھلا کیسے اللہ ایسی قوم کو ہدایت دے گا جو اپنے ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہوں اور وہ گواہی دے چکے ہوں کہ یہ رسول حق ہے، اور ان کے پاس کھلے کھلے دلائل آ چکے ہوں۔ اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی جزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی۔ وہ اس میں لمبا عرصہ رہنے والے ہیں۔ ان سے عذاب کو ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ وہ کوئی مہلت دیئے جائیں گے۔ سوائے ان کے جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بہت بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ یقیناً وہ لوگ جنہوں نے اپنے ایمان لانے کے بعد کفر کیا پھر کفر میں بڑھتے گئے، ان کی توبہ ہر گز قبول نہ کی جائے گی اور یہی وہ لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔)(اٰل عمران 87 تا 91)

اور فرمایا: (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم نے ان لوگوں میں جنہیں کتاب دی گئی، کسی گروہ کی اطاعت کی تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد ایک دفعہ پھر کافر بنا دیں گے۔)(اٰل عمران:101)

اور فرمایا: (یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے پھر انکار کر دیا پھر ایمان لائے پھر انکار کر دیا پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے، اللہ ایسا نہیں کہ انہیں معاف کر دے اور انہیں راستہ کی ہدایت دے۔)(النساء:138)

ان آیات میں کسی جگہ بھی انہیں قتل کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو اس کے بار بار ایمان لانے اور کفر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

اور فرمایا: (تم میں سے جو اپنے دین سے مرتد ہو جائے تو ضرور اللہ اس کے بدلے ایک ایسی قوم لے آئے گا جس سے وہ محبت کرتا ہو اور وہ اس سے محبت کرتے ہوں۔ مومنوں پر وہ بہت مہربان ہوں گے (اور) کافروں پر بہت سخت۔ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہ رکھتے ہوں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ اس کو جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بہت وسعت عطا کرنے والا (اور) دائمی علم رکھنے والا ہے۔)(المائدہ:55)

اور فرمایا: (لیکن وہ جو شرح صدر سے کفر پر راضی ہو گئے، ان پر اللہ کا غضب ہو گا اور ان کے لئے ایک بڑا عذاب مقدّر ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے آخرت پر ترجیح دیتے ہوئے دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا اور اس وجہ سے بھی ہے کہ اللہ ہرگز کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے۔ اور یہی ہیں جو غافل لوگ ہیں۔ کوئی شک نہیں) وہ بالکل سچ فرماتا ہے کہ (آخرت میں یقیناً یہی لوگ گھاٹا پانے والے ہوں گے) سے (وہ بہت بخشنے والا، بار بار رحم کرنے والا ہے۔) تک (النحل: 107 تا 111)

اور فرمایا: (اور وہ لوگ تم سے ہمیشہ جنگ کرتے رہیں گے یہانتک کہ اگر ان میں طاقت ہو تو تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کر دیں۔ اور تم میں سے جو بھی اپنے دین سے برگشتہ ہو جائے پھر اس حال میں مرے کہ وہ کافر ہو تو یہی وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا میں بھی ضائع ہو گئے اور آخرت میں بھی اور یہ وہ لوگ ہیں جو آگ والے ہیں۔ اس میں وہ لمبا عرصہ رہنے والے ہیں۔) (البقرہ 218 :)

ان تمام آیات کو پیش فرما کر امام بخاریؒ نے ان کے نیچے یہ مذکورہ بالا روایت رکھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا طریق یہ ہے کہ آپؒ روایت کے اوپر باب کا نام یا عنوان ایسا لاتے ہیں جو اس کے تحت دی گئی روایات کو خوب کھول دیتا ہے اور اس میں موجود مسئلے کا حل

سامنے لے آتا ہے۔ چنانچہ یہاں آپؒ نے چن چن کر وہ آیات پیش کر دی ہیں جو پکار پکار کر منادی کرتی ہیں کہ محض ارتداد اختیار کرنے والے کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا ہر ایسی روایت کی ان آیات کے ساتھ حتّی الامکان تطبیق کی جائے گی یا غیر جانبدارانہ تحقیق کر کے اس کی حقیقی تأویل کی جائے گی۔ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تعلیم یا اُسوے کے خلاف نہ کھڑی ہو۔ہاں اگر اس کی تأویل یا تطبیق نہ ہو سکے تو ردّ کر دی جائے گی کیونکہ وہ مذکورہ بالا آیات کے خلاف ہو گی۔

چوتھی بات اس ضمن میں یہ ہے کہ جہاںتک زیرِ بحث روایت میں مذکور تفصیلات کا تعلق ہے۔اس روایت کی تشریح میں شرح فتح الباری میں لکھا ہے کہ عمّار الدھنی جو اس واقعے میں موجود تھے اور اس کے عینی شاہد ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ان زندیقوں کو جلایا نہ تھا بلکہ گڑھا کھود کر ان (مقتولوں) کو ایک دوسرے کے اوپر ڈال دیا تھا اور (دبانے کے بعد) اوپر آگ جلادی تھی۔

شرح فتح الباری میں امام ابن حجر العسقلانیؒ نے کتاب الملل والنحل کے حوالے سے اس بارے میں تفصیلاً لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ رافضی لوگ تھے اور حضرت علیؓ کو الوہیّت کے مقام پر رکھتے تھے اور اپنی مسجد میں آپؓ کو خالق اور رازق قرار دیتے ہوئے دعا کرتے تھے۔ ان کا بڑا سردار ابن الاسود عبد اللہ بن سبا تھا جو یہود میں سے بظاہر مسلمان ہوا تھا۔(تاریخ گواہ ہے کہ یہ شخص حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں عالمِ اسلام میں بڑے بڑے فتنوں کا بانی مبانی اور سرغنہ تھا۔)

پھر وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے انہیں تین دن مسلسل تنبیہہ کی اور ان پر خوب واضح کیا کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ وہ اپنی اس

فتنہ پردازی سے نہ رکے تو ایک گڑھا کھدوایا اور انہیں پھر تنبیہہ کی۔ وہ اپنی اس حرکت پر مصرّ رہے تو بالآخر انہیں قتل کیا گیا اور گڑھے میں دبا کر اوپر آگ جلادی۔

روایت اور اس کی سند: فتح الباری شرح صحیح بخاری میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ روایت، جس میں انہیں جلانے کا واقعہ بیان ہوا ہے منقطع روایت ہے۔ یعنی اس روایت کی سند میں راوی صحابی کے علاوہ کوئی راوی درمیان سے غائب ہے جس کی وجہ سے سند کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے۔ لہٰذا یہ ایک منقطع یعنی کمزور روایت ہے۔

یہ روایت چونکہ صحاح ستہ میں بخاری کے ساتھ دیگر اور کتب میں بھی آئی ہے۔ اس لئے اس کی تہہ تک پہنچنا ضروری ہے۔ اس کے لئے ایک تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ چنانچہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ روایات کو پرکھنے کا سب سے بڑا اور اوّل اصول یہ ہے کہ اسے قرآن کریم پر پرکھا جائے۔ چونکہ یہ روایت قرآن کریم کے مسلّمہ تعلیمات اور اصولوں کے خلاف ہے جن کی نشاندہی خود امام بخاریؒ نے اس کے اوپر آیات پیش کر کے کر دی ہے۔ اس کی روشنی میں زندہ جلانے کے واقعہ کو کسی صورت میں تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے روایات جمع کرنے میں گو بہت محتاط اور کڑے اصول رکھے تھے مگر بعض روایات جو درحقیقت درست نہ تھیں کسی طور سے ان اصولوں کی چھلنی میں سے بھی گزر گئی ہیں لیکن امام بخاریؒ کی نظرِ بصیرت سے اوجھل نہیں ہوئیں۔ لہٰذا آپؒ نے انہیں ہرگز تنہا نہیں چھوڑا۔ آپؒ نے ان پر انتہائی بصیرت کے ساتھ باب کا جو عنوان باندھا ہے اس میں اس روایت کا یا تو حل پیش کر دیا ہے یا قاری کو متوجہ کر دیا ہے کہ اسے اصل حَکَم یعنی قرآن کریم کے مطابق پرکھ لو۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ں پر تین جھوٹوں

کے الزام والی روایت پر آپؒ نے جو عنوان باندھا ہے وہ آیت قرآنیہ " وَاتَّخَذَ اللّٰهُ إِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلاً" (النساء:126)"إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيْفاً "(النحل:121) اور"إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيْمٌ"(التوبہ:115)ہے ۔یعنی اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا۔ آپؑ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبر دار اور اس کی طرف جھکے رہنے والے تھے۔ آپؑ بہت نرم دل اور بُردبار تھے۔یعنی آپؒ نے ہر قاری کو یہ پیغام دیا ہے کہ تین جھوٹوں والی اس روایت کو ان مذکورہ آیات کی روشنی میں پرکھ لو۔ ممکن ہو تو قرآن کریم سے اس کی تطبیق کرو یا تحقیق کا حق ادا کرکے اس کی قرآنی آیات کے مطابق اچھی تأویل کرو ورنہ اسے ترک کر دو کیونکہ قرآن کریم مقدّم ہے اور ہر روایت پر حَکَم ہے۔ یہاں بھی آپؒ نے زیرِ بحث روایت پر تفصیلی آیات کا گلدستہ رکھ کر محقق کے لئے تحقیق کے دروازے کھول دیئے ہیں تاکہ وہ ان آیاتِ قرآنیہ کے تحت اپنی تحقیق یا تأویل کو ڈھال لے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اس روایت کو ردّ کر دے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہاں ایک عجیب اور دلچسپ پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کے ذریعے امام بخاریؒ کے کھولے ہوئے تحقیق کے ان دروازوں میں داخل ہوتے ہی اس روایت کے بنیادی راوی عکرمہ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ عکرمہ خود ایک بدعقیدہ خارجی شخص تھا۔ لہٰذا اس سے حضرت علیؓ کے حق میں کسی خیر کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ پس اس کے تعارف کے بعد اس روایت کے جھوٹ میں کسی اور تحقیق کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم عکرمہ کے تعارف میں اتریں، یہ ذکر بھی کرتے چلیں کہ روایات اور ان کی اسناد کی جرح و تعدیل پر مشہور محقق مولانا عبد الحئی لکھنوی اپنی مایہ ناز کتاب "الرفعُ والتکمیلُ فی الجرح والتعدیل" میں تحریر کرتے ہیں کہ.......اسی لئے امام بخاریؒ نے ان لوگوں میں سے بھی بہتوں سے بغیر جرح کے دلیل لی ہے۔ مثلاً عکرمہ مولیٰ ابن عباس، اسماعیل

بن ابی اویس، عاصم بن علی اور عمرو بن مرزوق وغیرہ اور امام مسلمؒ نے سوید بن سعید سے دلیل لی ہے اور دیگر کئی ایک سے بھی جن پر طعن کیا گیا تھا۔ کتاب " الرفع والتکمیل....... "کی اصل عبارت یہ ہے:

"......، وَ لِذٰلِكَ احْتَجَّ الْبُخَارِيُّ بِجَمَاعَةٍ سَبَقَ مِنْ غَيْرِ الْجَرْحِ فِيْهِمْ كَعِكْرَمَةَ مَوْلَى ابْنِ عَبَّاسٍ،وَ كَاِسْمَاعِيْلَ بْنِ اَبِي اُوَيْس، وَعَاصِمِ بْنِ عَلِيٍّ، وَ عَمْرِو بْنِ مَرْزُوْقٍ وَ غَيْرِهِمْ۔وَاحْتَجَّ مُسْلِمٌ بِسُوَيْدِ بْنِ سَعِيْد،وَجَمَاعَةٍ اِشْتَهَرَ الطَّعْنُ فِيْهِمْ۔"(باب المرصد الاوّل، فیما یقبل من الجرح والتعدیل ومایقبل منھا وتفصیل المفسّر والمتّھم فیھما۔ صفحہ 93۔ الطبعۃ الثامنۃ۔ بیروت 2004ء)

چونکہ حضرت امام بخاریؒ نے ان بعض مطعون لوگوں کی روایات بھی درج کی ہیں اس لئے بعد میں آنے والے دیگر ائمّہ حدیث نے بھی بغیر تحقیق اور چھان بین کی ضرورت سمجھے ان کی ہر روایت قبول کرلی۔ ان مطعونوں میں ایک عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ بھی ہے۔ مگر جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت امام بخاریؒ نے محض روایت نہیں لی بلکہ دونوں ابواب میں اس روایت کو قرآن کریم کے مطابق اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور ہدایات کے مطابق پرکھنے کے لئے ہر صاحبِ علم اور محقق کے لئے رہنما آیات اور روایات پیش کر دی ہیں تاکہ روایت کو اس کی درایت کے مطابق بھی پرکھنے اور اس کے سچا یا جھوٹا ہونے کا فیصلہ ہو سکے۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ایک زمانہ روایات کے جمع کرنے کا تھا۔ اس وقت جمع کرنے والوں نے اپنے اپنے اصولوں اور معیاروں کے مطابق روایات جمع کیں۔ بعد میں آنے والوں نے ایک طرف جہاں ان روایات کو بغیر چھان بین کے لیا ہے وہاں اس کے بالمقابل بعد میں آنے والے محققین نے ان روایات پر خاطر خواہ جرح بھی کی ہے۔ انہوں نے روایات کو پرکھنے اور ان کی چھان پھٹک کرنے کے اصول بھی وضع کئے ہیں اور راویوں کے حال احوال،

کردار اور شخصیت وغیرہ پر بھی تفصیلی مواد جمع کر دیا ہے تا حق کے متلاشی اور تحقیق کے جویاں کسی روایت کو اخذ کرنے میں غلطی نہ کھائیں۔ لہٰذا ان روایات کو استعمال کرنے والوں کا فرض تھا کہ وہ بنیادی اصولوں پر قائم رہ کر ان روایات کی جانچ پڑتال کرتے اور صحیح اسلامی عقائد کے خلاف روایات کو استعمال نہ کرتے بلکہ ایسی روایات کو ترک کرتے جو قرآن کریم، سنّتِ رسول ااور احادیثِ صیحہ کے منافی وضع کی گئی تھیں۔ مگر افسوس ہے کہ قرونِ ماضیہ میں بسا اوقات روایات کے ظاہر پر ہی انحصار کر کے توہینِ رسالت اور قتلِ مرتد وغیرہ جیسے ظالمانہ عقائد کی جی بھر کر ترویج کی گئی۔

عکرمہ (بربری): یہ حضرت عبداللہ ابن عبّاسؓ کا غلام تھا اور زیرِ بحث روایت کا بنیادی راوی یہی عکرمہ بربری ہے۔ بلکہ بہت سی روایات جو اس طرز کی سزاؤں اور کشت و خون پر مشتمل ہیں ان میں اکثر جگہ یہی شخص کار فرما نظر آتا ہے۔ جیسا کہ قارئین آئندہ بھی بعض روایات میں اس سے ملاقات کریں گے۔ یہ شخص کون تھا؟ اس کا مقام کیا تھا؟ اس کی حیثیت اور حقیقت کیا تھی؟ وغیرہ وغیرہ امور درجِ ذیل تعارفی سطور میں ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابنِ حجر عسقلانیؒ اپنی کتاب تہذیب التہذیب میں اسی عکرمہ کے تعارف میں تحریر فرماتے ہیں:

ا: یحیٰ بن معین کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے عکرمہ سے صرف اس وجہ سے روایت نہیں لی کہ وہ صفریہ فرقے کا رُکن تھا۔

ابراہیم بن المنذر نے معن بن عیسیٰ اور دوسرے لوگوں سے روایت کی ہے کہ امام مالکؒ اسے غیر ثقہ قرار دیتے تھے اور اس سے روایت نہ کرتے تھے۔

۲:　ابن لہیعہ، ابو الاسود سے عکرمہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ قلیل العقل تھا۔ مَا اَکْذَبَہٗ کمال کا جھوٹا شخص تھا۔ المغرب (مراکش) کے صفریہ فرقہ کے خیالات رکھتا تھا۔ یحیٰ بن معین نے بھی اسے صفریہ خیالات والا قرار دیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ صفری تھا۔

۳:　عطاء کا کہنا ہے کہ وہ اباضیہ فرقہ سے منسلک تھا۔

۴:　مصعب الزبیری کا کہنا ہے کہ وہ خارجی تھا۔

۵ :　حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اپنے غلام نافع کو کہتے تھے کہ اے نافع تیرا بھلا ہو۔ مجھ پر اس طرح تو جھوٹ نہ باندھو جس طرح ابن عباسؓ کی طرف عکرمہ جھوٹ منسوب کرتا تھا۔

بعینہٖ یہی الفاظ حضرت سعید بن المسیّبؒ نے اپنے غلام سے کہے تھے۔

۶:　یحیٰ بن سعید الانصاری کہتے ہیں کہ عکرمہ کذّاب تھا۔

۷:　104ھ میں عکرمہ کی موت مدینے میں ہوئی۔ اس کا جنازہ مسجد میں لایا گیا مگر کسی نے اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ (یعنی کسی شخص کے مردود ہونے کی یہ انتہاء ہے کہ لوگ اس کی نمازِ جنازہ بھی نہ پڑھیں)

اس کتاب میں ان مذکورہ بالا معلومات کے علاوہ بھی عکرمہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ (تہذیب التہذیب۔ الجزء الخامس۔ حرف العین، عکرمہ البربری ابو عبد اللہ المدنی مولیٰ ابن عبّاسؓ۔ لعلامہ ابن حجر العسقلانیؒ۔ دار الفکر للطباعۃ والنشر والتوزیع)

امام محمد بن احمد عثمان الذّہبی اپنی کتاب میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

ا: وہیب بیان کرتے ہیں کہ یحیٰ بن سعید الانصاری کہتے ہیں کہ عکرمہ کذّاب تھا۔

۲: عبد اللہ بن الحارث بیان کرتے ہیں کہ میں علی بن عبد اللہ بن عباس کے ہاں گیا تو دیکھا کہ عکرمہ حضرت حسن کے دروازے کے سامنے باندھا ہوا ہے۔ میں نے علی سے کہا: کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ خبیث میرے والد پر جھوٹ بولتا ہے۔ یعنی جھوٹی روایات ان کی طرف منسوب کرتا ہے۔

۳: الصلت ابو شعیب بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام محمد بن سیرین سے عکرمہ کے بارے میں دریافت کیا تو وہ کہنے لگے کہ.......وہ درحقیقت کذّاب ہے۔

۴: مطرف بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ عکرمہ کے ذکر سے بھی کراہت کرتے تھے۔

۵: یعقوب الحضرمی اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ عکرمہ مسجد کے دروازے میں کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ اس میں موجود سب کافر ہیں۔ وہ اباضیہ خیالات رکھتا تھا۔

۶ : ابن مدینی نے کہا ہے کہ وہ نجدہ حروری تھا۔(میزان الاعتدال فی نقد الرجال از امام شمس الدین ابو عبد اللہ الذہبی ایڈیشن 1963ء الناشر دار المعرفۃ والنشر بیروت۔ جلد 3۔ عکرمہ مولیٰ ابن عبّاسؓ)

(نجدہ، اباضیہ اور صفریہ وغیرہ، عقائد کے جزوی فَرقوں کے ساتھ خوارج کے فرقے ہیں۔ نجدہ فرقہ 38ھ میں ظاہر ہوا۔ اس کا بانی نجد بن عامر حنفی تھا۔ اباضیہ فرقہ کی 58ھ میں عبد اللہ بن اباض التمیمی نے بنیاد رکھی۔ فرقہ صفریہ کا بانی مخلد بن کہداد تھا۔ جو بربری قبائل سے تھا۔ یہاں ان کے جزوی عقائد کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ جنگِ صفین میں امیر معاویہؓ کی فوجوں کے خلاف جو لوگ حضرت علیؓ کے ہمراہ تھے، ان میں سے ایک گروہ تحکیم کے واقعہ کے بعد حضرت علیؓ کو یہ کہہ کر آپؓ سے الگ ہو گیا کہ آپؓ حق پر

نہیں۔ پھر انہوں نے آپؐ پر کفر کا فتوٰی صادر کر کے آپؐ سے جنگ کی اور ہزاروں مسلمانوں کا خون کیا۔ یہ خارجی تھے۔)

ان مذکورہ بالا کتابوں میں عکرمہ کے قطعی طور پر غیر ثقہ ہونے، جھوٹا اور مردود ہونے اور روایات وضع کرنے جیسی اور بہت سی تفصیلات ہیں۔ اسی طرح علامہ ابو جعفر محمد بن عمرو العقیلی المکی کی کتاب " الضعفاء الکبیر" مطبوعہ 1984ء۔ دارالمکتبۃ العلمیہ بیروت، میں بھی عکرمہ کے بارے میں کافی مواد موجود ہے جو اس کے پرلے درجے کے جھوٹے ہونے کے قطعی ثبوت فراہم کرتا ہے۔

اگر حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عکرمہ کا فتنہ ذوالخویصرہ والے فتنوں کا ایک شاخسانہ ہے جس کی نشاندہی رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی۔ یہ فتنہ ایسا ہے کہ جس نے نعوذ باللہ نہ صرف آپؐ کی ذات کو ظالم ثابت کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ عالمِ اسلام میں تشدّد پسندی اور دہشت گردی کے طوفان کھڑے کر دیئے ہیں۔ جس خدشے کا اظہار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ لوگ باتیں کریں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرواتے ہیں، ان لوگوں نے یہ ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ آپؐ یقینا اپنے ساتھیوں کو مروادیتے تھے۔

الغرض مذکورہ بالا اس تحقیق سے ان مصنّفین کو توجہ دلانی مقصود ہے جو اندھا دھند ایک ایسے عقیدے کو رائج کرنے کی سعی میں مصروف ہیں جس کی تمامتر عمارت جھوٹ کی بنیاد پر استوار ہے۔ کیونکہ اسلام ایک سچائی ہے۔ اس کے سارے عقائد ازلی سچائی پر استوار ہیں اور رسول اللہ ﷺ کا ہر فعل اور ہر قول بھی انہی ابدی سچائیوں پر قائم ہے۔ ان میں سے ایک قول

یا ایک فعل بھی ایسا نہیں ہے جس میں ایک ذرّہ بھر بھی ظلم کا شائبہ ہو۔ لہٰذا قتلِ شاتم اور قتلِ مرتد جیسے ظالمانہ عقائد کا اسلام کے عقائد سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

مرتدین اور ان کا قتل!! اگر اُس دَور اور زمانے کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لفظِ مرتد یا ارتداد عام استعمال کے لحاظ سے ان لوگوں پر بولا جاتا رہا ہے جو مرتد ہو کر بغاوت پر اتر آئے تھے۔ جس طرح آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری ایّام میں اور آپؐ کے وصال کے بعد بعض قبائل اور سرداروں نے ایسا ارتداد اختیار کیا جو دراصل مدینے کی حکومت کے خلاف کھلی کھلی بغاوت کا اعلان تھا۔ اسود عنسی، مسیلمہ کذّاب اور طلیحہ الاسدی اور دیگر کئی ایسے لوگ تھے جنہوں نے اعلانِ بغاوت کیا تو چونکہ یہ بنیادی طور پر دین سے بھی ارتداد تھا اس لئے ان کے لئے ارتداد یا مرتد کا لفظ عام استعمال کے طور پر جاری ہو گیا۔ مگر ان سے جنگ اور قتال کی حقیقی وجہ ان کی بغاوت تھی نہ کہ ان کا ارتداد۔ چنانچہ جو شخص صرف دین کو چھوڑتا ہے اور کسی قسم کی باغیانہ، محاربانہ یا فساد و تفرقہ والی کوئی کارروائی نہیں کرتا اسے قتل کرنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ تاریخ اسلام میں رسول اللہ ﷺ یا خلفائے راشدین کا تائید یافتہ یا تسلیم شدہ ایسا کوئی واقعہ موجود نہیں ہے کہ جس میں کسی کو محض اس وجہ سے قتل کیا گیا تھا کہ اس نے دینِ اسلام چھوڑنے کا اعلان کیا تھا۔

دین بدلنا: یہاں اس روایت کا آخری حصہ ’’ مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ‘‘ کہ جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو، قابلِ غور ہے۔ اس کا واضح اور آزادانہ مطلب یہ ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں، کوئی بھی اپنا دین بدلے، خواہ وہ عیسائی ہو، یہودی ہو، مجوسی ہو یا کسی اور مذہب کا پیروکار، تو وہ اس اصول کے تحت قتل ہونا چاہئے۔ چنانچہ وہ لوگ جو اپنا دین بدل کر مسلمان ہوئے، انہیں بھی قتل کر دینا چاہئے تھا۔ مگر عملاً اور واقعۃً ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پس اس منظر میں یہ بے قید اور بے

لگام بیان ہے جو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا کہ جس سے آپؐ کسی کو اپنا دین بدل کر اسلام میں آنے سے روک رہے ہوں۔

یہ درست ہے کہ بعض نے "دِینَہٗ" سے مراد اسلام لیا ہے یعنی جو اسلام چھوڑ کر کوئی اور دین اختیار کرے اسے قتل کر دو۔ ظاہر ہے کہ یہ شرح گزشتہ صفحات میں مذکور آیاتِ قرآنیہ سے کھلی کھلی متصادم ہے۔ نیز اسوۂ و سنّتِ رسول ﷺ سے بھی مخالف ہے۔ آپؐ نے کبھی کسی کے قتل کا حکم صرف اس وجہ سے نہیں دیا کہ وہ دینِ اسلام سے مرتد ہو گیا تھا۔ خلفائے راشدین کی زندگیاں بھی اسی قرآنی تعلیم اور اسوۂ رسول ﷺ کے عین مطابق تھیں۔ انہوں نے بھی کسی کو اسلام سے نکل جانے کی وجہ سے قتل کیا نہ اس کے قتل کا حکم دیا۔ پس یہ تشریح درست نہیں ہے کہ "دِینَہٗ" سے مراد دین اسلام ہے۔

حضرت امام بخاریؒ نے یہ روایت درج کی ہے مگر ساتھ آیاتِ قرآنیہ بھی رکھ دی ہیں جو اس کو رد کرتی ہیں۔ اسی طرح مذکورہ بالا دیگر قطعی حقائق بھی رہنمائی کرتے ہیں کہ یہ روایت قابلِ قبول نہیں ہے۔

* * * * *

11: مرتدّسوزی

ایک روایت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ " مصنّف عبد الرزّاق روایت کرتے ہیں: خالد بن ولیدؓ نے کچھ مرتدّوں کو آگ میں جلا دیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کی اے ابو بکرؓ! آپ نے خالدؓ کو کھلا چھوڑ دیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا میں اللہ کی تلوار کو نیام میں نہیں ڈال سکتا۔" (مصنّف جلد پنجم حدیث 9412)

جہاںتک اس روایت کا تعلق ہے، فتح الباری شرح صحیح بخاری 'کتاب الجہاد والسیر باب لا یعذّب بعذاب اللہ' میں بھی ایک بحث کے سلسلے میں درج کی گئی ہے۔ مگر وہاں صرف مرتدّوں کو جلانے کا ذکر ہے، باقی تفصیلات نہیں ہیں۔ اسی روایت کی شرح میں حضرت ابو بکرؓ کا باغیوں کو جلانا بھی مذکور ہے۔

جہاںتک حضرت ابو بکرؓ کے باغیوں کو جلانے کا ذکر ہے تو یہ قصّہ سِرے سے ہی جھوٹا ہے۔ فتح الباری میں یہ روایت کسی سند اور مأخذ کے ذکر کے بغیر درج ہے۔ نیز یہ کہ ایسے وضعی قصّوں کا کسی صحیح روایت اور احادیث کے کسی مستند مجموعے میں ذکر نہیں ملتا جو اُن کے غیر مستند بلکہ وضعی ہونے کا قطعی ثبوت ہے۔ لیکن بفرضِ محال ایک لمحہ کے لئے اگر ان روایات کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اوّل تو ان روایات سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ان میں جن کی بات ہو رہی ہے وہ مرتدّ تھے ۔ ان کے ذکر کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پر سبّ و شتم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یعنی یہ ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے آپؐ کو گالی گلوچ کی اور آپؐ کی کوئی توہین و تنقیص کی۔ ہاں یہ واضح ہے کہ بغاوت کی تھی جس کو کچلنے کے لئے حضرت ابو بکرؓ کی طرف سے حضرت خالدؓ مأمور تھے۔

اسی طرح حضرت ابو بکرؓ کے حوالے سے جو روایت ہے وہ بھی بتا رہی ہے کہ وہ لوگ باغی تھے۔ آپؓ کا دَور انہی بڑی بڑی بغاوتوں کے قلع قمع کا دور تھا۔ پس یہ تو واضح ہے کہ یہ لوگ آنحضرت ﷺ پر سبّ و شتم کرنے والے نہیں تھے بلکہ مرتد ہو کر بغاوت پر اترے ہوئے باغی تھے اور مدینے کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا ارادہ رکھنے والے کھلے کھلے محارب تھے۔ اس لئے ان کو لڑائی کے ماحول میں قتل کرنا ہر جنگی اصول کے عین مطابق تھا۔

باقی رہا حضرت ابو بکرؓ کا حضرت خالدؓ کو سزا نہ دینا یا کم از کم تنبیہہ نہ کرنا تو یہ یقیناً اس وجہ سے نہ تھا کہ آپؓ مرتدّوں کو جلانے کے قائل تھے یا ان کے قتل کے قائل تھے۔ بلکہ اس روایت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپؓ کو صورتحال کا پوری طرح علم تھا کہ جن کو حضرت خالدؓ نے قتل کیا ہے وہ باغی مرتد تھے۔ بغاوت کو کچلنے کے لئے دنیا کے ہر ملک اور قوم کے اس بنیادی قانون کے مطابق یہ ضروری بلکہ لازمی تھا۔ نیز حضرت ابو بکرؓ کا یہ کہنا کہ میں اللہ کی تلوار کو نیام میں نہیں کر سکتا، اس وجہ سے تھا کہ آپؓ کو واقعات کی حقیقت کا علم تھا۔ حضرت خالدؓ آپؓ کے حکم سے بغاوتوں کو کچلنے اور باغیوں کی سرکوبی کے لئے مامور تھے اور انتہائی کامیابی کے ساتھ یہ فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

گزشتہ صفحات میں بیان شدہ حضرت ابو ہریرۃؓ والی روایت کے مطابق زندہ انسانوں کو آگ میں جلانا بنیادی طور پر شریعت کے خلاف ہے۔ لہٰذا حضرت ابو بکرؓ ایسی کارروائی کی پشت پناہی نہیں کر سکتے تھے جس کے نہ کرنے کی رسول اللہ ﷺ نے خود وضاحت فرمائی تھی۔ روایات کے تمام مناظر کے مطابق حضرت خالدؓ نے کسی دشمن کو زندہ نہیں جلایا۔ کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہوتا کہ آپؓ نے زندوں کو جلایا تھا۔ غالب امکان ہے کہ آپؓ نے اگر جلانے کی ایسی کوئی کارروائی کی تھی تو اس میں باغیوں کو نہیں بلکہ ان کے سازشی اڈوں کو جلایا ہو گا جس کا

حضرت ابو بکرؓ کو علم تھا۔ سازشی اڈوں کو جلانے کی یہ کارروائی بعینہٖ اسی طرح کی ہوگی جس طرح رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے لئے روانگی سے قبل مدینہ میں سوَیلم یہودی کے گھر کو جلوایا تھا جہاں آپؐ، صحابہؓ، صحابیاتؓ اور اسلام کے خلاف سازشیں تیار کی جاتی تھیں۔ واللہ اعلم

اس زیرِ بحث خود تراشیدہ روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کے کہنے پر حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالدؓ کو کوئی تنبیہہ نہیں کی۔ ورنہ ایک خلافِ شریعت عمل پر کسی بہانے سے تنبیہہ نہ کرنا تو نعوذ باللہ واضح طور پر خلیفۃ الرسولؐ کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے اور ایسی کمزوری منصبِ خلافت کے منافی ہے۔ خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابو بکرؓ تو دین کی حفاظت کے لئے وہ آہنی عزم و ارادے والے مردِ حق تھے کہ انتہائی کمزور اور نازک حالات میں بھی بپھرے ہوئے باغیوں کے سامنے ایک چٹان بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ایسے قوی الارادہ شخص کے بارے میں یہ بات تراش لینا کہ آپؓ ایک خلافِ شریعت عمل پر ایک ذرّہ بھر بھی سرزنش نہیں کرتے، ایک انتہائی ظالمانہ خیال ہے۔ پس یا یہ واقعہ دراصل کچھ اور ہے جس کی تفصیل روایات میں مذکور نہیں ہے یا یہ روایت جعلی اور وضعی ہے۔

اس روایت کو وضعی اور جعلی تسلیم کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زندہ آگ میں جلنے یا جلانے، دونوں ہی سے منع فرمایا ہے۔ جلانے والی روایات کے بارے میں تفصیلی وضاحت پہلے گزر چکی ہے۔ مگر اس پر درجِ ذیل واقعے سے بھی اصولی طور پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ واقعہ یوں ہے کہ

ربیع الآخر 9ھ کو آنحضرت ﷺ کو خبر ملی کہ اہلِ حبشہ میں سے کچھ لوگ جدّے کے ساحل پر اترے ہیں۔ آپؐ نے حضرت علقمہؓ کو تین سو افراد کی کمان دے کر ان کی طرف بھجوایا۔ حبشیوں کو ان کی آمد کا علم ہوا تو وہ اپنی کشتیوں پر سوار ہو کر سمندر میں فرار ہو گئے۔

حضرت علقمہؓ نے ایک جزیرے تک ان کا پیچھا کیا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کرتے ہیں: ''میں بھی اس مہم میں اس لشکر کے ساتھ تھا۔ جب یہ مہم ختم ہو گئی تو بعض افراد نے واپس جانے کی اجازت طلب کی۔ ان میں حضرت عبد اللہ بن حذافہ السہمیؓ بھی تھے۔ حضرت علقمہؓ نے ان کو ان واپس جانے والوں پر امیر مقرر کر دیا۔ حضرت عبد اللہ بن حذافہؓ کی طبیعت میں مزاح تھا۔ راستے میں ایک جگہ انہوں نے کھانا پکانے کے لئے آگ جلائی۔ حضرت عبد اللہ بن حذافہؓ کو مذاق سوجھا۔ آپؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''کیا تم پر میری اطاعت فرض نہیں؟ ''انہوں نے جواب دیا : ''کیوں نہیں۔'' آپؓ نے کہا: ''پھر میں جو حکم دوں گا تم پر اس کا بجالانا فرض ہو گا۔'' انہوں نے کہا: ''بے شک۔'' آپؓ نے کہا: ''پھر میں تم پر اپنے اس حقِّ اطاعت کی وجہ سے حکم دیتا ہوں کہ اس آگ میں کود جاؤ۔'' اس حکم کے بعد آپؓ نے دیکھا کہ ان میں سے بعض اس آگ میں کودنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں اور ان کا عزم بتاتا ہے کہ وہ اس میں عملاً کود بھی جائیں گے۔ چنانچہ آپؓ نے انہیں روکا اور کہا: '' میں تو تم لوگوں سے مذاق کر رہا تھا۔ ''

جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو یہ تمام واقعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ذکر کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''مَنْ أَمَرَكُمْ مِنْهُمْ بِمَعْصِيَّةٍ فَلَا تُطِيْعُوْهُ'' کہ اگر کوئی ایسا حکم دے جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو اس کی اطاعت نہ کرو۔ (ابنِ ماجہ کتاب الجہاد باب لا طاعۃ فی معصیۃ اللہ وزرقانی سریۃ علقمۃ الیٰ طائفۃ من الحبشۃ وابنِ سعد سریۃ علقمہ بن مُجزِز الی الحبشۃ)

بخاری میں یہی واقعہ کتاب المغازی میں سریۃ عبد اللہ بن حذافہ السہمی وعلقمۃ کے باب میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہاں لکھا ہے کہ جب یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: '' لَوْ دَخَلُوهَا مَا خَرَجُوا مِنْهَا اِلیٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ،اَلطَّاعَةُ فِي

الْمَعْرُوْفِ" کہ اگر وہ اُس (امیر کے حکم کو مان کر آگ) میں اتر جاتے تو اس سے قیامت تک نہ نکل سکتے کیونکہ اطاعت صرف معروف میں ہوتی ہے۔

ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: " لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ" (تاریخ الخمیس بعث علقمہ بن مُجزّز الی الحبشۃ) کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں اطاعت جائز نہیں، اطاعت معروف میں لازمی ہے۔

اس روایت سے اظہر من الشمس ہے کہ آگ میں کسی کو جلانا یا خود سوزی معصیّت الٰہی ہے۔ اگر حضرت خالدؓ نے واقعۃً ایسا کیا تھا تو اس فعل پر حضرت ابو بکرؓ کا حضرت خالدؓ کو تنبیہہ نہ کرنا آپؓ کو ملزم ثابت کرنا ہے۔ چونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ خلیفۃ الرسولؐ ملزم ہو لہٰذا یہ قصہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ پس یہ زیرِ بحث روایت لازماً وضعی، جعلی اور جھوٹی ہے۔ ایسی روایت پر شتمِ رسولؐ کی سزا قتل کے عقیدہ کو قائم کرنا ایک جھوٹی جسارت ہے۔

اس روایت کے جھوٹا ہونے کا ایک قطعی ثبوت اور بہت بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ یہ روایت مصنف عبد الرزّاق سے لی گئی ہے۔ مصنف عبد الرزّاق کی حیثیت کیا تھی، درجِ ذیل شہادتوں کو ملاحظہ فرمائیں۔ ان کے مطالعے سے آپ قطعی نتیجے پر پہنچیں گے کہ ایسی روایت تراش کر اسلام، رسول اللہ ﷺ اور خلافتِ راشدہ کے مخفی دشمنوں نے یا جھوٹے دوستوں نے حضرت ابو بکرؓ کی پاک ذات پر ظلم کیا ہے۔

عبد الرزّاق: ان کا پورا نام 'ابو بکر عبد الرزّاق بن ہمام الصنعانی' ہے جو 126 ہجری میں پیدا ہوئے اور 211ھ میں وفات پائی۔ ان کا تیار کردہ مجموعہ ٔروایات 'مصنّف عبد الرزّاق' کے نام سے مشہور ہے۔ متعدّد روایتیں عبد الرزّاق کی اس کتاب سے لی گئی ہیں، جن پر شاتمِ رسولؐ کی

سزا قتل کے عقیدے کی بناء کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے احوال کی حقیقت کا علم ہونے کے بعد عملاً باقی روایتوں پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ رُواۃ کے حالات اور ان کی چھان پھٹک پر مشتمل ایک بنیادی اور مستند کتاب ' تہذیب التہذیب' میں ان کے متعلق لکھا ہے: ''وَقَالَ العَبَّاسُ الْعَنْبَرِیُّ اَنَّہٗ لَکَذَّابٌ وَالْوَاقِدِیُّ اَصْدَقُ مِنْہُ'' کہ عبّاس العنبری کہتے ہیں کہ یہ ایسا جھوٹا ایسا کذّاب انسان ہے کہ واقدی بھی اس کے مقابل پر بہت سچا دکھائی دیتا ہے۔ واقدی وہ موٴرّخ ہے جس نے بے تحاشا زیادہ رطب ویابس تاریخ اسلام کے حوالے سے اکٹھا بھی کیاہے اور اپنی طرف سے نیا تراشا بھی ہے۔ اسی لئے مغربی مصنف اسے سب سے زیادہ چاہتے ہیں اور اس سے اخذ کرتے ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور اسلام پر حملوں کے لئے جو منفی طرز کا مواد انہیں درکار ہے، وہ اُنہیں واقدی سے مل جاتا ہے۔ چنانچہ علّامہ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں کہ عبّاس العنبری کہتے ہیں کہ یہ عبد الرّزّاق، جس کی یہ روایتیں ہیں اتنا جھوٹا انسان ہے کہ واقدی کو اس کے مقابل پر دیکھو تو واقدی سچا دکھائی دیتا ہے۔ پھر زید ابن المبارک کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ ''کَانَ عَبْدُ الرَّزَّاقُ کَذَّاباً یَسْرِقُ الْحَدِیْثَ'' (تہذیب التہذیب، الجزء الخامس صفحہ 216 حرف العین۔ من اسمہ' عبد الرزاق) کہ وہ صرف کذّاب ہی نہیں تھا بلکہ دوسروں کی حدیثیں بھی چوری کیا کرتا تھا اور انہیں اپنی طرف سے منسوب کر دیا کرتا تھا۔

عبد الرّزّاق اور واقدی جیسے جعلسازوں اور وضّاعوں کے مجموعوں سے جہاں دشمنانِ اسلام مواد لے کر رسول اللہ ﷺ، اور اسلام پر جی بھر کے بے دریغ حملے کرتے ہیں، وہاں انہی وضعی اور جعلی روایات کو آج کے متشدّد مسلمان علماء توہینِ رسولؐ کے مرتکب کے قتل کے حق میں فتووٴں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ سارا منبع ہی جھوٹا اور وضعی ہے، جو عملاً اسلام کے حسین چہرے اور رسول اللہ ﷺ کی پاک سیرت پر خون کے دھبے لگانے والا

ہے۔اسے ترک کر کے عجز و انکسار، رحمت و محبت اور عفوو در گزر کی راہ پر چلنا ہی اللہ تعالیٰ اور رسول مقبول ﷺ کی مرضی ہے۔یہی اسلام کی بقا اور انسان کی اپنی روحانی زندگی کی فلاح کی اساس ہے۔

واقدیؒ: کتب اسماء الرّجال میں عبد الرّزّاق کو چونکہ واقدی سے بڑھ کر جھوٹا قرار دیا گیاہے، اس لئے واقدی کے حالات کا جائزہ بھی قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ تاکہ موازنہ کر کے ہر قاری یہ اندازہ کر سکے کہ مصنف عبد الرّزّاق کو جس شخص سے زیادہ جھوٹا قرار دیا جاتا ہے، وہ خود کیسا تھا؟ کیا اس کی پیش کردہ خلافِ قرآن و سنّتِ رسولؐ روایات کو قبول کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان پر کسی عقیدے یا قانون کی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے؟ اور اگر ان وضعی روایات پر کسی عقیدے یا قانون کی بنیاد رکھی جائے تو کیا وہ عقیدہ یا قانون سچا کہلا سکتا ہے؟ ان سوالوں کا ایک ہی جواب ہو گا کہ نہیں اور ہر گز نہیں۔

واقدیؒ کا نام محمد بن عمر الواقدی تھا۔اس کا زمانہ 130ھ سے 207ھ ہے۔اس کے بارے میں امام بخاریؒ نے فرمایا: ''مَتْرُوْكُ الْحَدِيْثِ'' واقدی اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کوئی روایت لی جائے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: ''هُوَ كَذَّابٌ يُّقَلِّبُ الْحَدِيْثَ'' واقدی پرلے درجہ کا جھوٹ بولنے والا شخص ہے جو روایتوں کو بگاڑ بگاڑ کر بیان کرتا ہے۔

ابو احمد عبد اللہ بن محمد المعروف بابن عدی: ''اَحَادِيْثُهُ غَيْرُ مَحْفُوْظَةٍ وَالْبَلَاءُ مِنْهُ'' واقدی کی روایتیں قابلِ اعتبار نہیں ہیں اور یہ خرابی خود اس کے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔

ابو حاتم محمد بن ادریس: ''یَضَعُ الْحَدِیْثَ'' واقدی اپنے پاس سے جھوٹی حدیثیں بنا بنا کر بیان کرتا تھا۔

علی بن عبد اللہ بن جعفر المعروف بابن المدینی: ''یَضَعُ الْحَدِیْثَ لَا اَرْضَاہُ فِیْ شَیئٍ'' واقدی جھوٹی روایتیں بناتا تھا۔ میرے نزدیک وہ کسی جہت سے بھی قابلِ قبول نہیں۔

امام علی بن محمد الدّار قطنیؒ: ''فِیْہِ ضُعْفٌ'' واقدی کی روایتیں ضعیف ہیں۔

اسحاق بن ابراہیم المعروف بابن راہویہ: ''ھُوَ عِنْدِیْ مِمَّنْ یَضَعُ الْحَدِیْثَ'' میرے نزدیک واقدی جھوٹی روایتیں گھڑنے والوں میں سے ایک تھا۔

امام شافعیؒ: ''کُتُبُ الْوَاقِدِی کُلُّھَا کِذْبٌ کَانَ یَضَعُ الْاَسَانِیْدَ'' واقدی کی سب کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں۔ وہ اپنے پاس سے جھوٹی سندیں گھڑ لیا کرتا تھا۔

امام ابو داؤدؒ: ''لَا اَکْتُبُ حَدِیْثَہُ۔ اِنَّہُ کَانَ یَفْتَعِلُ الْحَدِیْثَ'' میرے نزدیک واقدی کی روایات مقبول نہیں۔ وہ اپنے پاس سے حدیثیں گھڑ لیا کرتا تھا۔

امام نسائی ؒ: ''اَلْوَاقِدِی مِنَ الْکَذَّابِیْنَ الْمَعْرُوْفِیْنَ بِالْکِذْبِ'' واقدی ایسے جھوٹے لوگوں میں سے تھا جن کا جھوٹ ظاہر اور عیاں ہے اور اسے سب جانتے ہیں۔

امام نوویؒ: ''ضَعِیْفٌ بِاِتِّفَاقِھِمْ'' واقدی سب محققین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف الروایت ہے۔

علامہ ذہبی: ”اِسْتَقَرَّ الْاِجْمَاعُ عَلَى وَهْنِ الْوَاقِدِى“سب محققین نے واقدی کے کمزور ہونے کے متعلق اجماع کیا ہے۔

علامہ ابن خلقان: ”ضَعَفُوْهُ فِى الْحَدِيْثِ وَ تَكَلَّمُوْا فِيْهِ“ محققین نے واقدی کو ضعیف قرار دیا ہے اور اس پر بہت اعتراض کئے ہیں۔

علامہ زرقانی: ”اَلْوَاقِدِى لَا يَحْتَجُّ بِهِ اِذَا انْفَرَدَ فَكَيْفَ اِذَا خَالَفَ“واقدی اگر کسی بات کے بیان کرنے میں اکیلا ہو تو محققین کے نزدیک اس کی روایت قابلِ حجت نہیں ہے۔ پھر اس پر خود قیاس کر لو کہ ایسی بات میں اس کی روایت کا کیا وزن ہو سکتا ہے جو دوسری روایات کے خلاف ہو۔

یہ شہادتیں ہیں جو متقدّمین اور متأخّرین نے واقدی کے بارہ میں پیش کی ہیں۔ ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو واقدی کے ہمعصر ہیں اور اس کے حالات کے عینی شاہد ہیں۔ الغرض خلاصہ یہ ہے کہ واقدی سب محققین کے نزدیک بالاتفاق ضعیف الرّوایت ہے۔ اس قابل نہیں کہ اس سے کوئی روایت لی جائے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں کتب ’میزان الاعتدال‘ ، ’تہذیب التہذیب‘، ’وفیات الاعیان‘ اور ’شرح مواہب اللّدنّیہ‘ وغیرہا۔

* * * * *

12: آنحضرت ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے والا

''وَ رُوِیَ اَنَّ رَجُلاً کَذَبَ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ فَبَعَثَ عَلِیّاً وَ الزُّبَیْرَ اِلَیْہِ لِیَقْتُلَاہُ''

کہ یہ روایت کی گئی ہے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی طرف جھوٹ منسوب کیا۔ اس پر آپؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ کو بھیجا تا کہ اسے قتل کر دیں۔

اس روایت کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں اس شخص کے رسول اللہ ﷺ پر افتراء کا ذکر ہے، کسی سبّ و شتم اور توہین و تنقیص کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس لئے اسے توہینِ رسولؐ کے مسئلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ روایت نہ صحاح ستّہ میں ہے اور نہ ہی کتبِ حدیث کے دوسرے یا تیسرے درجے کی کتب میں ہے۔ پھر رُوِیَ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ اس کا راوی مجہول ہے۔ یعنی نہ اس کے نام کا ذکر ہے نہ اس کی کسی اور شناخت کا۔ یا اس کا راوی ہے ہی کوئی نہیں، یعنی یہ خود تراشیدہ روایت ہے۔ نیز اس روایت کے جھوٹا ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ یہ روایت مبیّنہ طور پر مصنف عبد الرّزّاق سے لی گئی ہے۔ (شرح الشفا: القسم الرابع فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ او نقص صفحہ 406)

بعینہٖ اس سے ملتی جلتی ایک اور من گھڑت روایت بیہقی میں بھی درج ہے کہ انصار کی بستیوں میں سے ایک شخص کسی بستی میں آیا اور اس نے لوگوں سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فلاں عورت سے شادی کرنے کا کہا ہے۔ یہ بات آپؐ کو معلوم ہوئی تو آپؐ نے علیؓ اور زبیرؓ سے کہا کہ جاؤ اور اسے پاؤ تو قتل کر دو اور تم اسے ضرور پالوگے۔ پس وہ دونوں نکلے تو انہوں نے اسے اس حالت میں پایا کہ اسے سانپ ڈس کر مار چکا تھا۔ (شرح الشفا: القسم الرابع فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ او نقص صفحہ 406)

پس بالکل واضح ہے کہ یہ بیہقی اور مصنّف عبد الرّزّاق کے کرشمے ہیں کہ وضعی اور جھوٹی روایتیں گھڑتے یا جمع کرتے چلے جاتے ہیں۔اور آج انسانی خون سے کھیلنے والے ایسی روایت کو اپنے جھوٹے عقیدے کی تائید میں پیش کرکے اپنے عقیدوں کے جھوٹا ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

کتاب 'الصارم.......' میں اس روایت کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا : ''مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔'' کہ جو جھوٹے طور پر جان بوجھ کر میری طرف کوئی بات منسوب کرے تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے۔('الصارم المسلول......'زیر عنوان 'سبب تعین قتل السابّ' صفحہ:117)

اس کے بعد لکھا ہے کہ انہوں نے اسے جلا دیا۔یعنی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اس قول کا یہ مطلب تھا کہ اس مرے ہوئے شخص کو جلا دیا جائے۔

یہ ایک عجیب استدلال ہے کہ ' آگ میں ٹھکانے ' سے مراد یہ ہے کہ مردہ کو جلا دیا جائے۔ اگر یہ استدلال درست تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کریم میں مثلاً آتا ہے کہ ''وَالَّذِيْنَ كَفَرواْ وَكَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا أُولَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ''(البقرۃ:40) کہ جنہوں نے کفر کیا اور ہمارے نشانات کو جھٹلایا، یہ آگ میں جھونکے جانے والے ہیں،وہ اس میں لمبا عرصہ رہیں گے۔ان تمام کفار اور آیات کی تکذیب کرنے والوں کو زندہ یا ان کے مرنے کے بعد جلا دینا چاہئے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے سب لوگ ہمیشہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارد گرد رہے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا انکار،رسولؐ کا انکار اور آیات کی تکذیب آپؐ پر جھوٹ باندھنے سے بڑے جرم ہیں۔لیکن تاریخِ اسلام کا سچا اور مستند ریکارڈ گواہ ہے کہ ان پر انہیں مار کر جلایا نہیں گیا۔بلکہ کسی ایک کے ساتھ بھی یہ سلوک نہیں کیا گیا۔ایسے لوگ جب جنگ بدر میں مقتولین کی صورت میں

میدان بدر میں ملے تو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے انہیں جلایا نہیں بلکہ قلیبِ بدر میں دفنا دیا۔ پس اس کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ 'آگ میں ٹھکانے' سے جو مراد کتاب 'الصارم........' میں لی گئی ہے، قرآن کریم اور سنت و عملِ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے خلاف ہے۔ اس لئے قابلِ ردّ ہے۔

اگر ایک وضعی روایت پر بنا کر کے اس کی تائید میں آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ایک فرمان پیش کیا گیا ہے اور آپؐ پر جھوٹ باندھنے والے کو 'مار کر جلانا' اس کے معنے قرار دیئے گئے ہیں تو پھر قرآن کریم میں جو بیسیوں جگہ آگ کے ٹھکانے والوں کا ذکر ہے، ان سب کو ان کی موت کے بعد جلا دینا چاہئے تھا۔ مگر ایسا کبھی بھی نہیں کیا گیا اور ایک بار بھی نہیں کیا گیا۔ پس یہ ایک حتمی ثبوت ہے کہ "الصارم...... " کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔

یہ تو قرآنِ کریم کے حوالے سے اس بحث کا ایک علمی اور واقعاتی پہلو تھا۔ مگر اس مذکورہ بالا استدلال کے بعد 'الصارم۔۔۔' میں اگلی روایت یہ درج کی گئی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جس آدمی کو قتل کرنے اور جلانے کے لئے بھیجا تھا، اسے واپس بلا کر پھر یہ فرمایا تھا: " اِنِّیْ قَدْ اَمَرْتُكَ اَنْ تَضْرِبَ عُنُقَهُ وَاَنْ تَحْرِقَهُ بِالنَّارِ، فَاِنْ اَمْكَنَكَ اللّٰهُ مِنْهُ فَاضْرِبْ عُنُقَهُ، وَلَا تُحْرِقْهُ بِالنَّارِ، فَاِنَّهُ لَا يُعَذِّبُ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ، وَلَا اَرَاكَ اِلَّا قَدْ كُفِيْتَهُ۔ "کہ میں نے تمہیں اس کی گردن اڑانے اور اسے آگ میں جلانے کا حکم دیا تھا تو اگر اللہ تجھے اس پر قدرت عطا کرے تو اس کی گردن اڑا دینا اور اسے آگ میں مت جلانا، اس لئے کہ آگ کا عذاب صرف وہ ذات دیتی ہے جو آگ کی مالک ہے اور میرا خیال ہے کہ تمہاری جان اس سے چھوٹ جائے گی۔

یہ دونوں روایتیں اکٹھی درج کی گئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ پہلی روایت میں آگ میں جلانے کا حکم ہے اور دوسری میں تردید ہے۔ یہ دونوں ایک دوسری سے متصادم ہیں۔ اس لئے ان میں سے بہر حال ایک درست ہے اور دوسری نہیں ہے۔

اگر ان میں سے موئخر الذّکر روایت کو درست گمان کیا جائے تو دیگر روایات جو آگ میں جلانے کا ذکر کرتی ہیں وہ تمام اس سے متصادم ہونے کی وجہ سے خود بخود ردّ ہو جاتی ہیں۔ یہ حقیقت بہر حال ثابت شدہ ہے کہ آگ میں نہ جلانے والی موئخر الذّکر روایت قرآن کریم اور سنّتِ رسولؐ سے پوری طرح موافق ہونے کی وجہ سے درست قرار پاتی ہے۔

ایک اوراہم پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ۔" صحیحین میں تقریباً دس مرتبہ مذکور ہے۔ان میں کسی جگہ بھی یہ قولِ رسولؐ اس جھوٹ بولنے والے شخص کے واقعے کے ساتھ درج نہیں ہے۔ مگر کتاب "الصارم......" میں لکھاہے کہ " فَعِنْدَ ذٰلِكَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم "کہ " اس موقع پر آپؐ نے یہ فرمایا"۔پس یہ ایک بہت بڑا ظلم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اس وعید کو پیش کر کے اسی کے تحت یہ روایت وضع کی گئی ہے اور آپؐ کی طرف ایک جھوٹا واقعہ منسوب کیا گیاہے۔ونعوذ باللہ من ذٰلک

* * * * *

13: حضرت زبیرؓ کا ایک شخص کو قتل کرنا

اس روایت کے الفاظ ہیں: ''اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم سَبَّہُ رَجُلٌ، فَقَالَ مَنْ یَکْفِیْنِیْ عَدُوِّی فَقَالَ الزُّبَیْرُ: اَنَا، فَبَارَزَہٗ فَقَتَلَہُ الزُّبَیْرُ۔'' (مصنف عبد الرزّاق کتاب الجہاد باب من ذمّی وجہ النبیؐ۔ حدیث 9649 و الشفاء صفحہ 222 و شرح الشفا: القسم الرابع فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ او نقص صفحہ 406)

کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک شخص نے گالی دی۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ میرے لئے میرے اس دشمن کو کون نپٹے گا۔ اس پر زبیرؓ نے کہا: میں۔ چنانچہ زبیرؓ نے اسے مقابلہ کے لئے للکارا اور قتل کر دیا۔

یہ مصنف عبد الرزّاق صاحب ہیں جو حدیثیں گھڑ گھڑ کے پیش کئے چلے جا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کو کسی نے گالی دی۔ آپؐ نے فرمایا: '' مَنْ یَکْفِیْنِیْ عَدُوِّی '' کون ہے جو مجھے میرے دشمن سے بچائے؟ ٹکسالی کا یہ فقرہ تو ہر جگہ چلایا جا رہا ہے۔ ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور اس گالی دینے والے کو قتل کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں اس روایت میں حضرت زبیرؓ کو آگے لائے ہیں کہ انہوں نے اس کو قتل کر دیا۔

جہانتک اس زیرِ بحث روایت کے مندرجات، ماحول اور منظر کا تعلق ہے تو حضرت زبیرؓ والا یہ واقعہ غزوہ احزاب کا معلوم ہوتا ہے جب عین لڑائی کے دوران کفّار کے لشکر میں سے نوفل بن عبد اللہ آنحضرت ﷺ کے قتل کے لئے آگے بڑھا تو حضرت زبیرؓ بن العوام نے آگے بڑھ کر اسے ڈھیر کر دیا۔ (زرقانی شرح المواہب اللدنّیہ: غزوہ احزاب) یعنی یہ دورانِ جنگ مبارزت کا منظر ہے نہ کہ سبّ و شتم کا۔

اِسی روایت میں فَبَارَزَہ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی جنگ کا موقع ہے اور مبارزت کا منظر ہے۔ اس زمانے میں جب جنگ ہوتی تھی تو ابتداء میں ایک ایک کر کے دشمن کا بہادر پہلوان نکلتا تھا اور اپنے مقابل پر آنے کے لئے وہ آواز دیتا تھا تو اِدھر سے بھی اس سے مقابلے کے لئے ایک بہادر جانباز نکلتا تھا۔ چنانچہ اس زیرِ بحث روایت میں وہی منظر پیش ہوا ہے کہ اس وقت ایک دشمنِ اسلام نے جنگ کے دوران نکل کر للکارا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا اور یہی آپؐ کا دستور تھا کہ آپؐ اعلان فرماتے تھے کہ اس دشمن سے نپٹنے کے لئے کون نکلے گا؟ چنانچہ اس وقت آپؐ کی آواز پر لبّیک کہتے ہوئے حضرت زبیرؓ نکلے اور انہوں نے اس بالمقابل دشمن کو قتل کر دیا۔

اس مبارزت والے واقعے کو غزوۂ احزاب سے منسلک تسلیم کیا جائے تو اسے درست قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی اسے توہینِ رسولؐ کے ضمن میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اِس مسئلے سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس روایت کا مصنّف جھوٹا اور اوّل درجے کا جھوٹا ہے، ایسا جھوٹا کہ واقدی کا چہرہ بھی اس کے سامنے سچا دکھائی دے۔

احادیثِ صحیحہ اور مستند تاریخی روایات کے مطالعے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور مستند صحیح واقعہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں ایسا دکھائی نہیں دیتا جس میں حضرت زبیرؓ نے کسی کو عام حالات میں آپؐ کے رُوبرو قتل کیا ہو۔

اگر اس واقعے کے ساتھ روایتیں بنانے والوں نے تراش خراش کی ہے تو الگ بات ہے مگر اصل واقعے کے مطابق تو میدان کارزار میں دشمن کا دفاع کرنا اور دفاع میں اس کا قتل کرنا کسی قسم کے اعتراض کے تحت نہیں آتا۔ یہ تو لڑائی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ مگر اس کو بدل

کر اس طرح پیش کرنا کہ گویا آنحضرت ﷺ باقی ہر حرکت برداشت کر لیتے تھے مگر اپنے اوپر کسی گالی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے اور جب تک اس بدزبان شاتم کو قتل نہ کروا لیتے نعوذ باللہ آپؐ کا غیظ و غضب فرو نہ ہوتا تھا۔اِنَّا للہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ دورانِ جنگ مبارزت میں کسی کے قتل کے واقعے کو سبّ و شتمِ رسولؐ کی ذیل میں لانا ہی بتاتا ہے کہ تکلّف کے ساتھ اور کھینچ تان کر ایک خود تراشیدہ جھوٹے مسئلے کو تقویت دی جا رہی ہے جس کا اسلام کی تعلیم سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔

اس روایت پر ملا علی قاریؒ نے یہ تبصرہ تحریر کیا ہے کہ عبد الرزّاق نے یہ روایت عکرمہ سے مرسل ذکر کی ہے۔ یعنی اس کی سند میں راویوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہے۔ اور سند صحابی تک نہیں پہنچتی۔ یعنی یہ روایت ہرگز قابلِ استناد و اعتبار نہیں ہے۔ ہاں یہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس روایت کی سند صحابیؓ تک تو نہیں پہنچتی مگر ان راویوں تک پکّی ہے جو روایتیں گھڑنے میں مشہور معروف ہیں اور جھوٹے ہیں۔

حضرت زبیرؓ والی جو روایت کتاب 'الشّفاء' میں ہے۔ اس کی شرح میں لکھا ہے کہ اس کا راوی عکرمہ ہے۔ (شرح الشفا: القسم الرابع فی بیان ماھو فی حقہ علیہ السلام سبّ او نقص صفحہ 406) یعنی نہلے پر دہلا ہے۔ ایک تو کتاب کا مصنّف عبد الرزّاق ہے اور اوپر سے روایت کا راوی ہے عکرمہ۔ لہٰذا مسئلہ دو دو چار کی مانند حل ہو جاتا ہے کہ یہ قطعی طور پر وضعی روایت ہے۔ عملاً غزوۂ احزاب کے علاوہ اور ایسا کوئی واقعہ تاریخ اسلام میں رُو پذیر نہیں ہوا۔

* * * * *

14: نابینا اور اس کی بیوی

’’عَنْ عِکْرِمَةَ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عَبَّاسٍ اَنَّ اَعْمٰی کَانَتْ لَهُ اُمُّ وَلَدٍ تَشْتُمُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَتَقَعُ فِیْهِ فَیَنْهَاهَا فَلَا تَنْتَهِیْ وَیَزْجُرُهَا فَلَا تَنْزَجِرُ، قَالَ: فَلَمَّا کَانَتْ ذَاتَ لَیْلَةٍ جَعَلَتْ تَقَعُ فِی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَ تَشْتُمُهُ فَاَخَذَ الْمِغْوَلَ فَوَضَعَهُ فِیْ بَطْنِهَا وَاتَّکَأَ عَلَیْهَا فَقَتَلَهَا فَوَقَعَ بَیْنَ رِجْلَیْهَا طِفْلٌ فَلَطَّخَتْ مَا هُنَاكَ بِالدَّمِ، فَلَمَّا اَصْبَحَ ذُکِرَ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَجَمَعَ النَّاسَ فَقَالَ: اَنْشُدُ اللّٰهَ رَجُلاً فَعَلَ مَا فَعَلَ، لِیْ عَلَیْهِ حَقٌّ اِلاَّ قَامَ فَقَامَ الْاَعْمٰی یَتَخَطَّی النَّاسَ وَهُوَ یَتَزَلْزَلُ حَتّٰی قَعَدَ بَیْنَ یَدَیِ النَّبِیِّ فَقَالَ: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ :اَنَا صَاحِبُهَا کَانَتْ تَشْتُمُكَ وَتَقَعُ فِیْكَ فَاَنْهَاهَا فَلَا تَنْتَهِیْ وَاَزْجُرُهَا فَلَا تَنْزَجِرُ وَلِیْ مِنْهَا ابْنَانِ مِثْلُ اللُّؤْلُؤَتَیْنِ وَکَانَتْ بِیْ رَفِیْقَةً فَلَمَّا کَانَتْ الْبَارِحَةَ جَعَلَتْ تَشْتُمُكَ وَتَقَعُ فِیْكَ فَاَخَذْتُ الْمِغْوَلَ فَوَضَعْتُهُ فِیْ بَطْنِهَا وَاتَّکَأْتُ عَلَیْهَا حَتّٰی قَتَلْتُهَا فَقَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم: اَلَا اشْهَدُوْا اَنَّ دَمَهَا هَدَرٌ۔‘‘(ابو داؤد کتاب الحدود الحکم فیمن سبّ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)

کہ عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عبّاسؓ نے بیان فرمایا کہ ایک نابینا تھا جس کی امّ الولد تھی۔(یعنی وہ لونڈی جو اس شخص کے بچے کی ماں تھی)جو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو گالیاں دیا کرتی تھی۔وہ اسے منع کرتا تھا مگر وہ رُکتی نہ تھی۔وہ اسے ڈانٹتا تھا لیکن وہ باز نہ آتی تھی۔ایک رات وہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو برا بھلا کہنے اور گالیاں دینے لگی۔تو اس نے خنجر لیا اور اس کے پیٹ میں اتار دیا اور خود اس پر ٹیک لگا دی حتّٰی کہ اسے قتل کر دیا۔اس حالت میں اس کی ٹانگوں میں اس کا بچہ بھی آ گیا جو خون میں لت پت ہو گیا۔جب صبح ہوئی تو یہ واقعہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں ذکر کیا گیا۔آپؐ نے لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا: میں ایسا کرنے والے کو اللہ

کی اور اپنے حق کی جو میرا اس پر ہے، قسم دیتا ہوں کہ وہ کھڑا ہو جائے۔ اس پر وہ نابینا کھڑا ہوا اور لوگوں کو پھاندتا ہوا، کانپتا ہوا آگے آیا حتّٰی کہ نبی کریم ﷺ کے قدموں میں بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ وہ اس کا خاوند ہے، وہ آپؐ کو گالیاں دیتی اور بُرا بھلا کہتی تھی۔ اس نے اسے منع کیا مگر وہ نہ رُکی۔ اس نے اسے ڈانٹا لیکن وہ باز نہ آئی۔ اس سے اس کے دو موتیوں جیسے بیٹے ہیں۔ وہ اس کی رفیقۂ حیات تھی مگر رات جب اس نے آپؐ پر گالی گلوچ کی تو اس نے خنجر لیا اور اس کے پیٹ میں اتار دیا اور خود اس پر ٹیک لگادی حتّٰی کہ اسے قتل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: گواہ رہو اس کا خون رائیگاں ہے۔

جہاں تک وقوعے کے منظر کا تعلق ہے، چونکہ اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے، اس مقدّمے میں مزعومہ قاتل جو نابینا ہے، خود مجرم بھی ہے، مدّعی بھی اور اگر وقوعے کا کوئی گواہ ہے تو وہ بھی وہ خود ہی ہے۔ لہٰذا اس پر ذرا غور کیا جائے تو حسبِ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثلاً

یہ ذاتی غصہ تھا یا کیا تھا؟ کسی کو علم نہیں ہے۔ اس کا بھی کوئی گواہ نہیں ہے۔

روایت میں واضح طور پر درج ہے کہ گھر میں سبّ و شتم کا سلسلہ تھا یعنی مقتولہ گالی گلوچ کی عادی تھی۔ خاوند مسلسل تنبیہہ کرتا تھا مگر وہ سنتی نہ تھی۔ یعنی وہ تُو تکار والی بدزبان عورت تھی اور اگر رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتی تھی تو اپنے خاوند کو کیوں نہ دیتی ہو گی۔ پس واضح ہے کہ اس کی زبان درازی کی وجہ سے ان کا آپس میں جھگڑا رہتا تھا۔ اس موقع پر خاوند نے طیش میں آکر اسے قتل کر دیا۔ یعنی غالب امکان ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ پر سبّ و شتم وجہ قتل نہ ہو بلکہ ان کا اپنا جھگڑا اور فساد ہو، کوئی ذاتی انگیخت ہو جس میں بوڑھے نے مغلوب الغضب ہو کر اسے قتل کر دیا۔

راوی نے تو یہ بیان کیا ہے کہ اس رات اس نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف بدزبانی کی تھی مگر وہ راوی خود وقوعے کا گواہ تو نہیں ہے۔ راوی اور قاتل کے بیان سے اگر ہٹ کر دیکھا جائے تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس موقع پر درحقیقت کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔

اس مقدّمے میں مزید چند امور ایسے ہیں جن سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ مثلاً اگر نابینا قاتل مان بھی لیا جائے تو مقتولہ ایسی امّ الولد تھی جس کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ لہٰذا قصاص کس نے لینا تھا؟ دیت کس کو دینی تھی؟ جب قصاص یا دیت کے لئے مدّعی ہی کوئی نہیں تھا تو اس نابینے قاتل کو کیونکر قصاص میں قتل کیا جاتا؟

یہ ایسا کیس تھا جو کسی بھی عدالت میں دیا جائے تو دعوٰی، شہادت، ثبوت یا دلائل وغیرہ مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہ عدالت سے لازماً خارج ہو گا۔ اس صورتِ حال میں یہی معنے دَمُھَا ھَدَرٌ کے ہیں کہ اس کا خون رائیگاں چلا گیا۔ اس کا کوئی والی وارث نہ تھا جو اس کے خونبہے کا مطالبہ کرتا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا 'دَمُھَا ھَدَرٌ' کہ اس کا خون معاف ہے یا رائیگاں ہے۔ حیرت ہے کہ اس سے یہ ظالمانہ مطلب کس طرح اخذ کیا گیا ہے کہ آپؐ پر سبّ و شتم کرنے والے کو جو چاہے قتل کر دے۔ اس مقتول شاتم کا خون رائیگاں سمجھا جائے گا۔ یہاں کوئی عام قانون تو بیان نہیں ہوا۔ بلکہ اس زیرِ نظر معیّن اور منفرد مقدّمے پر اس کی اپنی ایک الگ نوعیت کے باعث رسول اللہ ﷺ کا ایک معیّن اور مخصوص فیصلہ ہے کہ یہ مقتولہ، جس کا کوئی والی وارث نہیں، کوئی قصاص کا مطالبہ کرنے والا نہیں، کوئی دیت کا طلبگار نہیں۔ کسی کو اس کا خونبہا ادا کرنا ممکن نہیں ہے عملاً وہ رائیگاں چلا گیا ہے۔ یہ ہے اس فیصلے کا اصل منظر اور پس منظر۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس واقعے کے نامکمل اور نامعلوم کوائف کے پیشِ نظر آنحضرت ﷺ نے اس کا خون رائیگاں قرار دے دیا۔ مگر واضح ہو کہ اس میں آپؐ نے ہر گز کوئی مستقل قانون نہیں بنایا کہ جو آپؐ کو گالی دے اسے قتل کر دیا جائے تو اس کا خون اکارت جائے گا۔ نہ ہی آپؐ نے یہ قانون بنایا ہے کہ جو چاہے اٹھے اور اپنی کسی انگیخت کی بناء پر کسی کو قتل کر دے اور پھر دعویٰ کر دے کہ اس نے آپؐ کو گالی دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسی بدلگامی کی اجازت کبھی بھی نہیں دی۔

اس روایت پر کتاب 'بلوغ المرام فی احادیث الاحکام' کے حوالے سے یہ کہنا کہ "یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ نبی ﷺ کو برا کہنے والا قتل کیا جائے گا اور مسلمان ہونے کی صورت میں مرتد ہو جائے گا اور اس سے توبہ بھی قبول نہیں کی جائے گی۔" (ناموس رسول اور قانون توہین رسالت صفحہ 182) ایک انتہائی ظالمانہ بات ہے۔ اس روایت میں آنحضرت ﷺ کا کسی قسم کا کوئی حکم نہیں ہے کہ شاتمِ رسولؐ کو قتل کیا جائے گا یا اگر وہ مسلمان ہے تو وہ مرتد ہو جائے گا۔ یہ شرح کرنے والوں کی اپنی وحشیانہ ذہنیّت سے جنم زدہ الفاظ ہیں۔ مذکورہ بالا حادثہ تو ایسا تھا کہ جس کی تفصیلات یا حقائق کا سوائے مزعومہ قاتل کے کسی کو علم نہ تھا۔ اس کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ لہٰذا جو بیان قاتل نے دیا وہ کسی چشم دید شاہد کا بیان تو نہیں تھا، وہ تو ایک قاتل کا بیان تھا۔ اس سے اس طرح اصول وضع کرنے کی جسارت کرنا اور آنحضرت ﷺ کی طرف انہیں منسوب کرنا بذاتِ خود آپؐ کے بلند تشریعی مقام کی تنقیص ہے۔

مزید پہلو: جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس روایت میں مارنے والے کا نام مذکور نہیں ہے، اور نہ ہی مقتولہ کا نام مذکور ہے۔ یعنی مزعومہ قاتل بھی مجہول ہے اور مقتولہ بھی۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ایسی روایت جس پر ایک عقیدے یا قانون کی بنیاد پڑ رہی ہو، اس کے

مرکزی کردار کے نام کا نہ تو روایت کرنے والے کسی راوی کو علم ہو اور نہ ہی صحابہؓ میں سے کسی ایک کو۔

اس میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ عکرمہ نے یہ حضرت ابن عبّاسؓ سے روایت کی ہے۔ یہ درست ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ایک بہت بڑے عالمِ دین اور صاحبِ زہد و اتقاء صحابی تھے۔ مگر یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ آپؓ کے ساتھ ظلم یہ کیا گیا ہے کہ آپؓ کی طرف ایسی روایات منسوب کر دی گئی ہیں جو آپؓ نے بیان نہیں کیں۔ (اس حقیقت کا ذکر عکرمہ کے تعارف میں گزر چکا ہے۔) مگر آپؓ صرف روایات کے پہلو سے ہی مظلوم نہیں ہیں، بلکہ تفاسیر کے پہلو سے بھی 'اپنے ہی دوستوں' نے آپؓ پر ہمیشہ تبر چلائے ہیں اور آپؓ کی طرف آیاتِ قرآنیہ کی غلط تفسیریں منسوب کی ہیں۔ چنانچہ امام جلال الدّین سیوطیؒ نے لکھا ہے:

"هٰذِهِ التَّفَاسِيْرُ الطِّوَالُ الَّتِي اَسْنَدُوْهَا اِلَى ابْنِ عَبَّاسٍ غَيْرُ مَرْضِيَّةٍ وَ رُوَاتُهَا مَجَاهِيْلُ۔" (الاتقان: جلد 2 باب النوع الثامن فی طبقات المفسّرین۔ صفحہ 188۔ الناشر دار الندوۃ الجدیدہ بیروت)

کہ یہ لمبی تفسیریں جن کو مفسّرین نے حضرت ابن عبّاسؓ کی طرف منسوب کیا ہے، ناپسندیدہ / ناقابلِ قبول ہیں اور ان کے راوی مجہول ہیں۔

علّامہ شوکانیؒ نے بھی یہ بات بڑی کھول کر بیان فرمائی ہے۔ آپؒ لکھتے ہیں:

"وَمِنْ جُمْلَةِ التَّفَاسِيْرِ الَّتِي لَا يُوْثَقُ بِهَا تَفْسِيْرُ ابْنِ عَبَّاسٍ فَاِنَّهٗ مَرْوِيٌّ مِّنْ طَرِيْقِ الْكَذَّابِيْنَ"۔ (الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ از علّامہ الشّوکانی صفحہ 111، ومطبوعہ در مطبع محمدی لاہور 1303ھ صفحہ 104) کہ وہ تمام تفسیریں میں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، تفسیر ابن عبّاس بھی ہے کیونکہ وہ جھوٹوں کی راہ (اسناد) سے روایت ہوئی ہیں۔

جیسا کہ واضح ہے، زیرِ بحث روایت کا راوی بھی وہی عکرمہ بربری خارجی ہے۔ اسے جہاں بھی موقع ملا ہے، حضرت ابن عباسؓ کی آڑلے کر اپنا کام کر گیا ہے۔ پس اس کی بیان کردہ روایات پر جنہوں نے اپنے ظالمانہ عقائد یا قانون کی بنیاد رکھی ہے، ان کی دلیل کی اصلیت اَلَم نَشۡرَح ہے۔ پس ان حقائق کے پیش نظر اس روایت کو کسی طرح بھی صحیح حدیث تو کیا ایک عام صحیح بات کے طور پر بھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

جھوٹے راویوں نے اس طرح کی اکثر روایات حضرت ابن عبّاسؓ کی طرف منسوب کی ہیں اور وہ آپؓ ہی کے نام سے کتب احادیث میں درج ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس نوع کی بعض روایات پر گزشتہ صفحات میں کسی قدر بحث ہو چکی ہے۔ یہ سب خود ثابت کرتی ہیں کہ یہ واقعات خود بنائے گئے ہیں۔ ایسی سب روایات کا جزوی اختلاف بھی انہیں قطعی طور پر وضعی ثابت کرتا ہے۔

* * * * *

15: یہ حق رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کے لئے نہیں ہے

حسبِ ذیل روایت بھی اس مؤقف کے لئے پیش کی جاتی ہے کہ شاتمِ رسولؐ کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

"عَنْ اَبِی بَرْزَۃَ الْاَسْلَمِیِّ قَالَ: اَغْلَظَ رَجُلٌ لِاَبِی بَکْرٍ الصِّدِّیْقِ، فَقُلْتُ، اَقْتُلُہُ فَانْتَہَرَنِیْ، وَقَالَ، لَیْسَ ھٰذَا لِاَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم۔" (سنن النسائی کتاب تحریم الدّم باب الحکم فیمن سبّ رسول اللہ ﷺ و باب ذکر اختلاف علی الاعمش فی ھذا الحدیث) کہ ابو برزہ الاسلمی کی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابو بکرؓ پر سخت کلامی کی۔ اس پر میں نے عرض کی: میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر آپؓ نے مجھے منع کرتے ہوئے فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہیں ہے۔

دوسری روایات میں حضرت ابو بکرؓ کے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں: "لَمْ تَکُنْ لِاَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اور وَاللّٰہِ مَا کَانَتْ لِبَشَرٍ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم۔" کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہے۔ محمد ﷺ کے علاوہ کسی اور بشر کے لئے نہیں۔

"لَیْسَ ھٰذَا لِاَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم" میں لفظ "ھٰذَا" قابلِ غور ہے۔ یہاں لفظ 'ھٰذَا' سے مراد قتل نہیں ہے۔ بلکہ یہ حکمِ قتل کے اختیار کے لئے آیا ہے یا یہ اظہارِ احترام اور جذبات کا قائم مقام ہے۔ یعنی معنے یہ ہوں گے کہ صرف رسول اللہ ﷺ کا اختیار تھا کہ آپؐ ایسا حکم جاری فرماتے۔ کوئی اور یہ اختیار نہیں رکھتا۔ یا اگر گستاخی کی وجہ سے کسی کو قتل کرنے کا جواز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کی گستاخی کرنے والے کے لئے ہوتا۔ یا یہ کہ اس طرح کے جذباتِ غیرت و محبت کا اظہار آپؐ کے لئے ہونا چاہئے کسی اور کے لئے نہیں۔ ہماری اس دلیل کی وجہ یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ آیت 24 میں باپ ،بیٹوں، بھائیوں، جیون ساتھیوں،رشتہ داروں، اموال، تجارتوں اور گھروں وغیرہ کے لئے جذبات پر اللہ اور اس کے رسول کو ترجیح دینے کی ترغیب دلائی ہے۔اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایاہے:" اَنْ يَّكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا"(بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان) کہ انسان ایمان کی حلاوت حاصل نہیں کرسکتاجب تک کہ اللہ اوراس کارسولؐ اسے ہر رشتہ اور ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو۔

پس حضرت ابو بکرؓ نے قتل وخون کی بات نہیں کی بلکہ اختیارِ حکم اور جذباتِ محبّت و احترام کی بات کی ہے کہ ایسے جذبات رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہونے چاہئیں۔

ہمارایہ استدلال اس لئے درست ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو بھی گستاخی کرنے والے کو قتل کرنے کی اجازت نہیں فرمائی تھی۔ چنانچہ ' الصارم..... صفحہ 28' پر لکھا ہے کہ "اَنَّ اَبَا قُحَافَةَ شَتَمَ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَرَادَ قَتْلَهٗ وَاَنَّ ابْنَ اُبَيّ تَنَقَّصَ النَّبِيَّ فَاسْتَاذَنَ ابْنُهُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم فِي قَتْلِهٖ لِذٰلِكَ" کہ ابوقحافہ (حضرت ابو بکرؓ کے والد) نے رسول اللہ ﷺ کو گالی دی تو آپؓ نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ اور عبد اللہ ابن ابیّ نے رسول اللہ ﷺ کی تنقیص کی تو اس وجہ سے اس کے بیٹے نے آپؐ سے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔

تاریخ سے واقف ہر شخص جانتاہے کہ ان دونوں مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں شخصوں کو اپنے باپوں کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی اوروہ دونوں شاتم کبھی بھی قتل نہیں کئے گئے۔اس بارے میں حضرت ابو بکرؓ کے سامنے رسول اللہ ﷺ کانمونہ اور فرمان براہِ راست موجود تھا۔ اور وہ یہ تھا کہ کسی بھی ہستی کے لئے بے اختیاری کے جذبات کی ایسی انگیخت

کے موقع پر بھی کسی شاتم کو قتل نہیں کرنا۔یعنی قتل کی اجازت ہر گز نہیں ہے۔پس اس نظیر کے ہوتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ کے بیان فرمودہ لفظ 'ھٰذَا' کے معنے یہ قرار پاتے ہیں کہ ایسے جذباتِ غیرت و محبت کا اظہار صرف رسول اللہ ﷺ کے لئے ہونا چاہیئے۔کسی دوسرے کے لئے نہیں۔

دوسرا پہلو جو حضرت ابو بکرؓ نے اپنے بیان 'لَمْ تَكُنْ لِاَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم' میں واضح فرمایاہے، یہ ہے کہ کسی غلطی، جرم یا گناہ پر قتل کی سزا مقرر کرنے کا اختیار صرف رسول اللہ ﷺ کو تھا۔ آپؐ شارع تھے۔اس حق کی بنا پر یہ آپؐ ہی کر سکتے تھے۔ آپؐ کے بعد یہ حق کسی کو نہیں دیا گیاحتّٰی کہ خلیفہ ٔراشد کو بھی نہیں دیا گیا۔حضرت ابو بکرؓ کے اس قول سے بالکل واضح ہو جاتاہے کہ آپؓ نے امت پر واضح فرمایاہے کہ جن جرائم کے قتل کا ارشاد رسول اللہ ﷺ نے فرمایاہے، ان کے سوا کسی اور جرم کی سزا قتل نہیں ہے۔چنانچہ جن افراد کے قتل کا ذکر آپؐ نے بیان فرمایاہے، یہ تین لوگ ہیں۔جن میں گستاخِ رسولؐ یا شاتمِ رسولؐ کا کسی روایت میں، کسی جگہ، کوئی ذکر نہیں ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

' 'لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِیءٍ مُّسْلِمٍ يَّشْهَدُ أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ أَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ: رَجُلٌ زَنٰی بَعْدَ اِحْصَانٍ فَاِنَّهٗ يُرْجَمُ وَرَجُلٌ خَرَجَ مُحَارِباً لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّهٗ يُقْتَلُ اَوْ يُصْلَبُ اَوْ يُنْفٰی مِنَ الْاَرْضِ اَوْ يَقْتُلُ نَفْسًا فَيُقْتَلُ بِهَا'' (ابو داؤد کتاب الحدود الحکم فیمن ارتدّ)

کہ تین وجوہات میں سے کسی ایک کے صدور کے علاوہ کسی ایسے مسلمان کا خون جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی معبود شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ایک، وہ زناکار جو شادی شدہ ہو اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دوسرے، وہ جو (دین سے) اللہ اور اس کے

رسولؐ سے محاربت کرتا ہوا نکل جائے، اسے قتل کیا جائے گا، یا صلیب پر لٹکایا جائے گا یا ملک بدر کیا جائے گا۔ اور تیسرے، وہ جو کسی کو قتل کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

ان تین سزاؤں میں توہین یا سبّ و شتم کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اگر شاتم کے لئے قتل کی سزا مقرر نہیں فرمائی تو آپؐ کے بعد اسے مقرر کرنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ابو برزہ الاسلمیؓ والی اس زیرِ بحث روایت پر ابو داؤد میں اسی جگہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا حسبِ ذیل تبصرہ بھی تحریر ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں :

''اَیْ لَمْ یَکُنْ لِاَبِی بَکْرٍ اَنْ یَقْتُلَ رَجُلًا اِلاَّ بِاِحْدَی الثَّلَاثِ الَّتِیْ قَالَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم، کُفْرٌ بَعْدَ اِیْمَانٍ اَوْ زِناً بَعْدَ اِحْصَانٍ اَوْ قَتْلُ نَفْسٍ بِغَیْرِنَفْسٍ وَکَانَ لِلنَّبِیِّ اَنْ یَقْتُلَ۔'' کہ حضرت ابو بکرؓ اس شخص کو قتل کی سزا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان تین کے علاوہ کسی مسلمان کا خون جائز قرار نہیں دیا۔ ہاں رسول اللہ ﷺ اسے یہ سزائے قتل دے سکتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا یہ تبصرہ بہت خوبصورت، سچّا اور انتہائی بصیرت افروز ہے۔ اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ تو نبی کا جانشین ہوتا ہے۔ وہ اس کی تعلیم کو نافذ کرنے والا ہوتا ہے، وہ اسے تبدیل نہیں کرتا۔ پس خلیفۃ الرسولؐ حضرت ابو بکرؓ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے تین امور سے آگے جا کر ایک اور امر پر کسی کے قتل کا فیصلہ صادر فرماتے۔

سبحان اللہ! یہ بہت ہی خوبصورت تشریح ہے جو امام احمد بن حنبلؒ نے بیان فرمائی ہے۔ یہ ان دیگر تمام روایتوں پر ایک روشن رہنمائی کی حیثیت رکھتی ہے جن کو توہینِ رسالت کی ظالمانہ

سزا قتل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔پس ان تین پہلوؤں کی موجودگی میں یہ کہنا کہ توہینِ رسالت کی سزا قتل ہے ایک جھوٹا دعوٰی ہے جسے قرآن، سنّتِ رسول اور حدیثِ نبوی سے کوئی سند حاصل نہیں۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ امام احمد بن حنبل ؒ نے یہاں یہ تبصرہ فرما کر اپنا موقف واضح کر دیا ہے کہ آپؒ خود بھی گستاخِ رسولؐ کے قتل کے قائل نہ تھے۔

* * * * *

16:　عبد العزّٰی بن خَطَل

شاتم رسولؐ کے قتل کے جواز میں لکھا ہے کہ " صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ فتح مکّہ کے دن حضور ﷺ نے ابن خطل کو اس وجہ سے کہ وہ شاتمِ رسولؐ تھا حرم میں قتل کروادیا۔"(ناموسِ رسول اور قانون توہین رسالت صفحہ 182)

یہاں مصنف نے واضح جھوٹ سے کام لیا ہے۔ صحیح بخاری میں کسی ایک جگہ بھی ابن خطل کے شاتم ہونے کا ذکر نہیں بلکہ صحاح ستّہ میں اور موٴطا امام مالک میں بھی اس کا ذکر نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے شاتم ہونے کی وجہ سے قتل کروایا تھا۔ مختلف نوعیت کی سزاؤں اور تعزیرات کے واقعات کو کھینچ تان کر شتم وتوہینِ رسولؐ کی ذیل میں لانا پرلے درجہ کی علمی بدیانتی ہے۔

ابن خطل کا اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کا نام عبد العزّٰی تھا اور قبیلہ بنو تیم بن غالب سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ فتح مکّہ سے قبل مدینہ آکر مسلمان ہو گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے اس کا نام بدل کر عبد اللہ رکھا۔ اس لئے بعض کتب میں اس کا نام عبد اللہ بن خطل بھی آیا ہے۔ آپؐ نے اسے زکوٰۃ وصدقات کی وصولی کے لئے بعض بستیوں میں بھیجا۔ آپؐ نے اس کی مدد کے لئے ایک اور انصاری کو بھی اس کے ساتھ کر دیا۔ ابن خطل نے اسے راستے میں شہید کر دیا اور خود مرتد ہو کر مکّہ فرار ہو گیا۔ شاعر ہونے کی وجہ سے اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں ہجو یہ شاعری بھی شروع کر دی۔ مکہ میں اس کی دو داشتائیں تھیں جو اس کی اسلام دشمن کارروائیوں میں اس کی آلہ کار تھیں۔ وہ اس کے اشعار گا گا کر لوگوں کو آپؐ اور اسلام کے خلاف اشتعال دلاتی تھیں۔ امرِ واقع یہ ہے کہ ابن خطل کے سر پر بد عہدی کا جرم بھی تھا اور شہید انصاری کا قصاص بھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے قتل کے حکم میں یہ وجوہات کارفرما تھیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مکّے

میں وُرود فرمایا تو ابن خطل نادم ہونے یا معافی کا طلبگار ہونے کی بجائے جنگی لباس پہن کر گھوڑے پر سوار اعلان جنگ کے ساتھ یہ دعوٰی کرتے ہوئے مقابلے کے لئے نکلا کہ وہ آپؐ کو مکّے میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ لیکن جب اس نے آپؐ کے ساتھ قدوسیوں کا ایک بڑا لشکر دیکھا تو وہ لرز کر رہ گیا اور فوراً خانہ کعبہ میں پہنچ کر اس کے پردے کی اوٹ میں چھپ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”اسے قتل کر دیا جائے۔ اِنَّ الْکَعْبَۃَ لَا تُعِیْذُ مَنْ وَجَبَ عَلَیْہِ الْقَتْلُ“ (فتح الباری شرح بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ فتح مکّہ) کعبہ نہ تو کسی گنہگار کو پناہ دیتا ہے اور نہ ہی واجب شدہ سزا کے نفوذ میں روک بنتا ہے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں اسے اسی جگہ زمزم اور مقامِ ابراہیمؑ کے درمیان قتل کر دیا گیا۔ (ابو داؤد کتاب الجہاد باب قتل الاسیر ولا یعرض علیہ الاسلام و فتح الباری شرح بخاری کتاب المغازی باب غزوۂ فتح مکّہ) لکھا ہے کہ ابو بَرزَہ الاسلمیؓ نے اسے قتل کیا تھا۔ (ابو داؤد کتاب الجہاد باب قتل الاسیر ولا یعرض علیہ الاسلام)

یہ ہے اس کا اصل واقعہ۔ پس اس کے کھاتے میں بدعہدی، قصاص اور محاربت کے واضح اقدام موجود ہیں۔ علاوہ ازیں وہ اپنے ساتھ اشاعتِ فحشاء والی داشتائیں بھی رکھتا تھا۔ جن کا ذکر آئندہ صفحات میں مذکور ہے۔ اس کے اور اس کی داشتاؤں کے یہ جرائم انہیں کھلم کھلا محارب ثابت کرتے ہیں۔

مگر اپنے جھوٹے عقیدے کی تائید میں قائلین قتلِ شاتم ازراہِ کذب و بدیانتی اسے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی تفصیلات صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں بھی درج ہیں مگر وہاں پر بھی یہ ہرگز مذکور نہیں کہ ” فتح مکّہ کے دن آنحضور ﷺ نے ابن خطل کو اس وجہ سے کہ وہ شاتمِ رسول تھا حرم میں قتل کروا دیا۔ “

پس اس واقعہ سے کسی طرح بھی نہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے نہ دلیل لی جا سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنے شاتم کو قتل کرواتے تھے اور نہ ہی اس روایت کی آڑ میں یہ قانون وضع کیا جا سکتا ہے کہ شاتمِ رسولؐ کی سزا قتل ہے۔ اس واقعہ کو غلط مقاصد کے لئے پیش کیا گیا ہے اور اپنی طرف سے اس میں الفاظ داخل کر کے اس سے ظالمانہ استدلال کیا گیا ہے۔

*****

17:　ابن خطل کی دو داشتائیں

ابن خطل کی لونڈیوں کے قتل کے حکم کو بھی سبّ و شتم کی ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ (ناموسِ رسول ﷺ اور قانون توہین رسالت صفحہ 182،183) جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے واقعات کی حقیقت یہ تھی کہ وہ ابنِ خطل کی ہمنوا اور آلہ کار ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ اس کے جرموں میں برابر کی شریک تھیں۔ وہ اشاعتِ فاحشہ کی مرتکب تھیں۔ محفلیں لگا لگا کر اس کی ہجویہ شاعری گاتیں اور آنحضرت ﷺ کے خلاف اور اسلام کے خلاف اشتعال پیدا کرتی تھیں۔ اپنے آقا ابن خطل کے ساتھ اس مسلسل کھلی کھلی محاربانہ اور باغیانہ کارروائیوں کی وجہ سے یہ بھی سزائے قتل کی مستوجب تھیں۔ ان کی کارروائیاں واضح طور پر فساد فی الارض کا موجب تھیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں ایک قتل کی گئی تو دوسری جس کا نام سارہ تھا، فرار ہو گئی۔ اس نے بعد میں آنحضرت ﷺ سے امان کی التجا کی جسے آپؐ نے قبول فرمایا اور اس سے عفو کا سلوک فرمایا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئی۔ (السیرۃ الحلبیہ فتح مکّہ) بعض تواریخ میں ایک کا نام اِرنب اور دوسری کا امّ سعد آیا ہے۔ (تاریخ الخمیس غزوۃ فتح مکّہ)

رسول اللہ ﷺ کے طبعی اور فطرتی رحیمانہ مزاج اور خصوصاً اُن دِنوں آپؐ کے بے پایاں عفو کے آئینے میں یہ فیصلہ کرنا بہت آسان ہے کہ ان دونوں میں سے جو قتل کی گئی اگر وہ قتل سے پہلے آکر آپؐ سے معافی طلب کر لیتی تو آپؐ لازماً اسے بھی اپنی وسیع چادرِ عفو و رحمت میں ڈھانپ لیتے۔ مگر اسے یہ موقع نہ مل سکا اور کسی کے ہاتھوں قتل ہو گئی۔

اگر بعض لوگوں کے نزدیک شاتمِ رسولؐ کی سزا قتل ہے تو یہاں ایک کا قتل نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ ان کا یہ دعوٰی درست نہیں ہے۔ کیونکہ شریعت کے ایک حکم کے خلاف بلکہ بقول ان کے اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ ایک حدّ کے منافی رسول اللہ ﷺ دوسری کو ہرگز معاف نہ

فرماتے۔ آپؐ اسے لازماً قتل کرواتے۔ پس یہ معاملہ شتم وتوہینِ رسالت کا نہیں، محاربت وفساد فی الارض کا ہے۔ اسے شتم وتوہین کے قتل کے لئے دلیل کے طور پر پیش کرنا علمی بددیانتی ہے۔

*****

18: حارث بن نُفَیل

قتلِ شاتم کے موضوع پر تقریباً ہر کتاب میں اس کے قتل کو بھی توہین و شتمِ رسولؐ کی وجہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی فتح مکّہ کے ایّام میں رونما ہونے والا واقعہ ہے۔

بعض کتبِ تاریخ میں حارث بن نفیل کا نام حویرث بن نقیذ آیا ہے۔ تاریخی تفصیلات سے ثابت ہے کہ یہ شخص اسلام کے خلاف ایک کھلا کھلا محارب تھا۔ مسلمانوں کی ایذا رسانی میں مسلسل سرگرمِ عمل تھا۔ یہ ایک ظالم ہبّار بن اسود کے ساتھیوں میں سے تھا اور حضرت زینبؓ پر حملہ کرنے میں اس کے ساتھ تھا۔ اس نے حضرت امّ کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ پر بھی حملہ کیا تھا۔ مختلف رنگ میں آنحضرت ﷺ کو بھی کئی ایک مرتبہ اذیّت دے چکا تھا۔ ہجویہ اشعار کے ذریعے لوگوں کو آپؐ کے اور اسلام کے خلاف انگیخت کرتا تھا۔ جو لوگ مکّے سے ہجرت کے ارادے سے مدینے جانے کے لئے نکلتے تھے، یہ ان کے لئے روکیں پیدا کرتا اور انہیں اذیتیں دیتا تھا۔ یعنی ہر پہلو سے وہ فساد کا سرغنہ تھا۔ اس محاربت کی وجہ سے اس کے قتل کا اعلان کیا گیا تھا نہ کہ سبّ و شتم کی وجہ سے۔ قبل اس کے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے معافی یا امان طلب کرتا، حضرت علیؓ کے سامنے آگیا اور آپؓ نے اسے قتل کر دیا۔ (السیرۃ الحلبیہ غزوۂ فتح مکّہ وابن ہشّام غزوہ فتح مکّہ)

* * * * *

19: مقیس بن صبابہ

مقیس کو بھی کشتۂ سبّ و شتم قرار دیا گیا ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ غزوۂ ذی قرد میں مقیس کے بھائی حضرت ہشام بن صبابہؓ کو ایک انصاری نے غلطی سے دشمن سمجھ کر شہید کر دیا تھا۔ مقیس نے اسلام قبول کیا تو آنحضرت ﷺ سے اپنے بھائی کے خونبہے کا مطالبہ کیا۔ آپؐ نے اس کو دیت دلادی۔ اس کے باوجود اس نے اس انصاری کو قتل کر دیا اور خود مرتد ہو کر مکّے بھاگ گیا۔ آپؐ نے اس کی اس محاربت و فساد کی وجہ سے اور مقتول انصاری کے قصاص کے طور پر اسے واجب القتل قرار دیا۔ (السیرۃ الحلبیہ غزوۂ فتح مکّہ) چنانچہ قبل اس کے کہ یہ آپؐ سے معافی مانگتا، حضرت تمیلہ بن عبد اللہؓ نے اس کو بازار میں دیکھ لیا تو قتل کر دیا۔ (نسائی کتاب تحریم الدّم باب الحکم فی المرتد)

ایک بہت بڑی واقعاتی دلیل: فتح مکہ کے وقت متعدد افراد کے قتل کا حکم دیا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ ان میں سے صرف ان چند ایک کے نام لئے جاتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے سے پہلے قتل ہو گئے تھے۔ اگر یہ مقتول شاتمینِ رسولؐ تھے تو وہ سب بھی جن کو معاف کر دیا گیا تھا، ان پر بھی تو یہی فردِ جرم عائد ہوئی تھی۔ بلکہ معافی پانے والے بعض تو اس مسلک کے قائلین کے مطابق مبیّنہ گستاخ و شاتم تھے۔ اگر شاتمِ رسولؐ کسی طور بھی معاف نہیں کیا جا سکتا تو ان باقیوں کو کیوں معاف کیا گیا؟ پس آنحضرت ﷺ کا ان کو معافی دے دینا ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ شاتم کی سزا قتل نہیں ہے۔ یہی آپؐ کا اسوہ ہے جس کی اتباع ہر مسلمان پر واجب ہے اور یہ آپؐ کی مستقل سنّت ہے جس کی پیروی ہر مومن پر فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس اُسوے سے آگے قدم رکھنا بذاتِ خود آپؐ کی شان میں گستاخی ہے۔

* * * * *

20 ”مَنْ سَبَّ نَبِیّاً فَاقْتُلُوْہ“

حضرت علیؓ کی طرف منسوب یہ روایت بھی شاتمِ رسولؐ کے قتل کے جواز کے لئے بہت کثرت سے پیش کی جاتی ہے۔ وہ روایت یہ ہے:

”حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ نُوحٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِیْزِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ الْحَسَنِ بْنِ زَبَالَةَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنِ مُوْسٰی بْنِ جَعْفَرَ عَنْ عَلِیِّ بْنِ مُوْسٰی عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ عَنْ اَبِیْہِ عَنِ الْحُسَیْنِ بْنِ عَلِیٍّ عَنْ اَبِیْہِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَنْ سَبَّ نَبِیّاً فَاقْتُلُوْہُ وَمَنْ سَبَّ اَصْحَابِی فَاضْرِبُوْہُ۔“ (الشفاء۔ القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقّصہ او سبّہٗ علیہ السلام۔ الباب الاوّل فی بیان ماھو فی حقّہ اسبٌّ او نقصٌ...... شرح ملّا علی قاری صفحہ 304) کہ حضرت حسینؓ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو کسی نبیؑ کو گالی دے اسے قتل کر دو اور جو میرے صحابیؓ کو گالی دے، اسے پیٹو۔

روایت کے مأخذ اور اس کا زمانہ: یہ روایت گو متقدّمین اور متأخرین کی تصنیف کردہ درجن بھر کتب میں درج ہے اور یہ صرف حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ دستیاب معلومات کے مطابق یہ روایت حضرت علیؓ کی وفات کے کم و بیش اڑھائی سو سال بعد سب سے پہلے جس کتاب میں اوّل طور پر ظاہر ہوئی، المعجم الصغیر ہے جو امام ابو القاسم طبرانی کی تصنیف ہے۔ امام طبرانی 360 ہجری میں فوت ہوئے۔ یعنی یہ روایت چوتھی صدی ہجری میں نمودار ہوئی ہے۔ اس سے پہلے صحاح ستّہ میں اور احادیث کے دیگر ابتدائی مجموعوں میں یہ روایت موجود نہیں ہے۔ چنانچہ ملّا علی قاریؒ نے شرح الشّفا میں لکھا ہے کہ امام حلبی کہتے ہیں کہ یہ روایت صحاح ستّہ میں نہیں ہے اور امام طبرانی اسے ضعیف سند کے ساتھ لائے ہیں۔ یعنی یہ ایسی روایت ہے جو تین صدیوں کے

بعد ایک ایسی سند کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے جس پر ائمۂ فنِ روایت نے واضح بحث کے ساتھ اسے ردّ کیا ہے۔ نیز یہ ان روایات میں سے بھی نہیں ہے جو بعد کے زمانوں میں اہل اللہ اور اولیاء اللہ نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے بذریعہ کشف سنیں۔

امام طبرانی کی تصنیف المعجم الصغیر کے بعد معروف کتابیں مثلاً المعجم الاوسط، الشفاء، فوائد، الاربعین المرتبۃ علی طبقات الاربعین، تاریخ دمشق (ابن عساکر)، تاریخ بغداد، مجمع الزوائد الفردوس بمأثور الخطاب، المواھب اللدّنیہ، سبل الھدٰی، الفتاوٰی الکبرٰی اورالصارم المصلول ودیگر سب کتابیں جو اس روایت کو لئے ہوئے ہیں چوتھی صدی کی یا اس کے بعد کی ہیں۔

بالفرض اگر یہ روایت واقعۃً حضرت علیؓ کی اپنی روایت کردہ تھی اور ایک شرعی مسئلہ کی حامل تھی تو اسے احادیث کے اوّلین درجہ کی صحاح میں درج ہو جانا چاہئے تھا۔ حضرت امام حسینؓ اور حضرت علیؓ دونوں کبار صحابہؓ میں اوراوّلین اہلِ بیت میں سے تھے۔ ان کی روایت تو اپنے استناد اور علمِ روایت و درایت کے اعتبار سے مرفوع متّصل اورانتہائی اعلیٰ درجہ کی روایت ہونی چاہئے تھی۔ مگر یہ ایسی نہیں تھی۔ اس لئے اس پر ائمۂ فن کی اکثریت نے بحث کر کے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

روایت کی سند کی حیثیت: اس روایت پر فنِ روایت اور علمِ اسماء الرّجال اور جرح و تعدیل کے چوٹی کے علماء نے بحثیں کی ہیں۔ جن میں سے چند ایک امام ملّا علی قاریؒ نے کتاب ' الشفاء ' کی شرح میں درج کی ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں۔

انہوں نے اس روایت کے ایک راوی عبد اللہ بن موسیٰ بن جعفر کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر یہ عبد اللہ بن موسیٰ ہاشمی ہے تو ابن ابی الفوارس نے کہا ہے کہ اس میں شدید تساہل پایا جاتا ہے یعنی لاپرواہی پائی جاتی ہے۔

علامہ ابو العبّاس الہاشمی البرقانی نے کہا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور وَلَهُ اُصُوْلٌ رَدِيْئَةٌ کہ اس روایت کی بنیاد ٹھوس نہیں ہے۔

امام حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ اگر یہ (عبد اللہ بن موسیٰ) وہی ہے تو اس کی پیش کردہ حدیثیں منقطع ہیں۔ اگر یہ اس کے علاوہ کوئی اور ہے تو پھر مجھے اس کا علم نہیں ہے۔ (منقطع روایت وہ ہے جس کی سند میں صحابی کے علاوہ کوئی اور راوی رہ گیا ہو اور سند کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہو۔) مطلب یہ ہے کہ اگر یہ راوی وہی ہے جو اوپر کی سطور میں سمجھا گیا ہے تو یہ روایت مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر کمزور ہے۔ اور اگر یہ راوی وہ نہیں ہے تو پھر یہ کوئی مجہول الحال راوی ہے، یعنی جس کا روایت وسند کے ائمہ کو علم نہیں۔ لہٰذا روایت کے اصولوں کے مطابق اس راوی کی روایت قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

اس روایت کا دوسرا راوی علی بن موسیٰ ہے۔ اس کے بارے میں لکھا ہے: " تَكَلَّمُوْا فِيْهِ " کہ اس کے بارے میں لوگوں نے کلام کیا ہے یعنی اعتراض کئے ہیں۔

علامہ ابن طاہر نے کہا ہے " يَأْتِي عَنْ اَبِيْهِ بِعَجَائِبَ۔ " کہ وہ اپنے والد کی طرف سے عجیب عجیب باتیں لاتا ہے۔

امام ذہبی نے کہا ہے کہ " اِنَّمَا الشَّأْنُ فِي ثُبُوْتِ السَّنَدِ وَاِلَّا فَالرَّجُلُ قَدْ كُذِبَ عَلَيْهِ وَ وُضِعَ عَلَيْهِ نُسْخَةٌ سَائِرَةٌ كَمَا كُذِبَ عَلَى جَدِّهِ جَعْفَرَ الصَّادِقَ۔ کہ سند کا ثبوت محلّ نظر ہے۔ یا

پھر اس پر جھوٹ باندھا گیا ہے اور اس کے نام پر ایک پورا پلندہ ڈال دیا گیا ہے۔ جیسا کہ اس کے اپنے دادا جعفر صادقؒ پر جھوٹ باندھا گیا تھا۔(شرح الشفاء۔ القسم الرابع فی تصرف وجوہ الاحکام فیمن تنقّصہ او سبّہٗ علیہ السلام۔ الباب الاوّل فی بیان ماھو فی حقّہ.... صفحہ 403)

اس روایت کے حامی اس تمام بحث کو جانتے ہیں جو اس روایت کو ضعیف ثابت کرتی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ اسے ضعیف تو کہا گیا ہے مگر اسے موضوع قرار نہیں دیا گیا۔

ان لوگوں کو امام ذہبی کا یہ مذکورہ بالا بیان دیکھنا چاہئے کہ '' فَالرَّجُلُ قَدْ کُذِبَ عَلَیْہِ وَ وُضِعَ عَلَیْہِ نُسْخَۃٌ سَایِرَۃٌ۔'' پلندے تیار کر کے کسی دوسرے پر ڈال دینا یا اس کی طرف منسوب کر دینا، وضع کرنا ہی ہے۔ ایسے مواد کو 'موضوع' ہی کہا جاتا ہے۔

وہ روایت جس میں سچ، دیانتداری، حافظہ، نیک شہرت، عبادات وغیرہ میں شہرت اچھی نہ رکھنے والے راوی ہوں، ضعیف کہلاتی ہے۔ جبکہ موضوع روایت وہ کہلاتی ہے جو جھوٹی ہو یعنی ایک بات غلط یا جھوٹے طور پر آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب کر دی گئی ہو۔ چنانچہ اس روایت میں یہ بات واضح طور پر موجود ہے۔

علمِ اسماء الرّجال اور جرح و تعدیل کے ائمّہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، کے علاوہ امام نسائی، امام نور الدّین الہیثمی، امام ابن حجر عسقلانی، امام دار قطنی، علامہ ناصر الدین البانی، علامہ یحیٰ بن معین، امام ابو حاتم الرازی رحمہم اللہ نے اس روایت کے راویوں پر علمِ روایت کے اعتبار سے واضح اور سنگین شواہد پیش کئے ہیں، یعنی ان کو جھوٹا، کذّاب، غیر ثقہ، ضعیف، موضوع روایات بیان کرنے والے، احادیث کو خلط ملط کرنے والے، احادیث چوری کرنے والے، حافظہ

میں کمزور اور سمجھ بوجھ میں ناقص، لوگ ان کے بارہ میں باتیں کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ بنیادی کمزوریوں والے قرار دیا ہے۔

اس بحث سے یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ اس روایت کی سند میں ایسے راوی ہیں جو نہ صرف یہ کہ غیر مستند ہیں اور مجہول یعنی نامعلوم ہیں بلکہ علمِ روایتِ حدیث کے حوالے سے بہت عیب دار ہیں۔ ان بنیادوں پر یہ روایت اپنا استناد، اعتماد، مقام اور حیثیت کھو دیتی ہے۔ چنانچہ کسی نے اسے موضوع قرار دیا ہو یا نہ، عملاً یہ روایت 'موضوع' کے مقام پر ہے۔

علاوہ ازیں یہ موضوع کیوں ہے اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ارشاد فرمایا تھا یا نہیں؟ اس کی وضاحت اگلی سطروں میں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

غیر مستند ہونے کے مزید واضح ثبوت: اس روایت کے موضوع ہونے کا واضح اور کھلا کھلا ثبوت یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور آپؐ کے پاک اُسوے کے خلاف اور اس سے متصادم ہے۔ امرِ واقع یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی مکّے کی گلیوں میں مسلسل تیرہ سال توہین و تنقیص ہوتی رہی اور صحابہؓ کی تذلیل کی جاتی رہی۔ اسی طرح مدینے کے کوچے بھی آپؐ، ازواج مطہراتؓ اور صحابہؓ کی توہین و تحقیر کے گواہ ہیں۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ کبھی ایسا کرنے والے کسی کو نہ قتل کیا گیا نہ کوڑے مارے گئے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ یہ روایت عملاً رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کی زندگیوں میں رونما ہونے والے بکثرت واقعات کے کلّیۃً خلاف ہے۔

دوسرا بیّن ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ حضرت علیؓ سے روایت کی گئی ہے۔ لیکن حضرت علیؓ کا اپنا عمل کلّیۃً اس کے خلاف ہے۔ آپؓ نے کبھی صحابیؓ کو 'سبّ' کرنے والے کو کوڑے نہیں

مارے۔ اسی طرح کسی اور صحابیؓ نے بھی ایسا کرنے والوں کو سزا نہیں دی۔ یہ روایت جو دراصل اپنے حکم کے لحاظ سے ایک شرعی قانون کی حامل ہے اگر درست ہوتی اور اس وقت موجود ہوتی تو حضرت علیؓ اور دیگر صحابہؓ کیوں اس سے پہلو تہی کرتے؟ پس ثابت ہوتا ہے کہ در حقیقت یہ روایت وضعی ہے۔ اس لئے نہ تو یہ کوئی اسلامی اصول ہے اور نہ ہی کوئی شرعی قانون۔

روایت کا ناقابلِ عمل حصّہ: امام ابن تیمیہ کی کتاب ' الصارم المسلول' کی جلد 2 صفحہ 173 پر یہ روایت بھی درج ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو 'گالی' دی۔ (یہ واقعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ہوا یا آپؐ کو اس کی اطلاع کی گئی، جو بھی صورتحال تھی اس پر آپؐ نے حضرت خالدؓ کو کوڑے نہیں مروائے۔ بلکہ) آپؐ نے فرمایا:" لَا تَسُبُّوْا اَصْحَابِی فَاِنَّ اَحَدَکُمْ لَوْ اَنْفَقَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا مَا اَدْرَكَ مُدَّ اَحَدِهِمْ وَلَا نَصِیْفَهُ" کہ میرے صحابہ کو گالی نہ دو کیونکہ اگر کوئی احد پہاڑ کے برابر سونا بھی خرچ کرلے تو بھی ان میں سے کسی ایک کے ایک مُدّ (غلّہ ماپنے کا ایک پیمانہ جو غالباً 68 تولے وزن کے برابر ہے) تو کجا اس کے آدھے کے برابر بھی نہ پہنچے گا۔

اگر یہ روایت درست ہوتی تو آنحضرت ﷺ خود حضرت خالد بن ولیدؓ کو کوڑے مروا کر یا کوئی بدنی سزا دے کر اپنے عمل سے ایک اصول کا نفاذ کر کے شریعت کا ایک قانون پختہ طور پر قائم فرما جاتے۔ مگر آپؐ نے ایسا نہیں کیا بلکہ نصیحت کے طور پر صحابہؓ کے بلند مقام کے بیان پر ہی اکتفا فرمایا۔

پھر الصارم المسلول میں ابراہیم النخعی سے یہ روایت درج کی گئی ہے:" شَتْمُ اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ مِنْ الْكَبَائِرِ" اورابو اسحٰق السبیعی سے یہ روایت درج کی ہے:"شَتْمُ اَبِیْ بَكْرٍ وَعُمَرَ مِنْ

الْکَبَائِرِ الَّتِیْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی، اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَ مَا تُنْھَوْنَ عَنْہُ" (جلد2، صفحہ 174) کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو گالی دینا ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے کہ جن بڑے گناہوں سے تمہیں روکا جاتا ہے ان سے باز آ جاؤ۔(یہ سورۃ النسآء کی آیت 32 کا ایک جزء ہے)

سوال یہ ہے کہ اگر صحابہؓ کو گالی دینے سے انسان گناہِ کبیرہ کا مجرم ٹھہرتا ہے تو اس میں سے دو خلفائے راشدین حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور دیگر تمام صحابہؓ کیوں مستثنٰی ہیں۔ صرف حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو کیوں اختیار کیا گیا ہے اور باقی سب صحابہؓ کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر ایک اصول بنایا گیا تھا تو وہ سب پر یکساں اطلاق پانا چاہئے تھا۔ یہ کیسا شرعی اصول ہے کہ دو خلفاء پر تو لاگو ہوتا ہے، مگر دیگر دو پر نہیں۔ دیگر صحابہؓ پر بھی نہیں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ اگر دو صحابہؓ کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ پر سبّ و شتم کو خود آپؐ کی طرف سے اکبر الکبائر قرار دیا ہوتا۔ مگر سب جانتے ہیں شارع ﷺ نے ایسا نہ کہا نہ کیا۔

دوسرے یہ کہ اگر یہ مسئلہ اتنا ہی سنجیدہ تھا کہ صحابہؓ کو گالی دینے سے انسان گناہِ کبیرہ کا مجرم ٹھہرتا ہے اور صحابہؓ کو گالی دینے والے کے بارے میں حکم یہ ہے کہ اسے کوڑے مارو تو اہلِ تشیّع تو بلا استثناء اس کی زد میں آتے ہیں۔ انہیں گزشتہ پندرہ صدیوں میں کیوں کسی حکومت نے کسی بھی دَور میں توہینِ صحابہؓ کی وجہ سے انفرادی طور پر یا جماعت کوڑوں کی سزا نہیں سنائی۔ ان کے دین کی فروعات میں تبرّا ایک ایسا بنیادی رکن ہے کہ جس کی وجہ سے وہ تمام صحابہؓ کو بالعموم اور شیخین جو صحابہؓ کے بھی سردار اور پہلے دو راشد خلیفے ہیں، ان کی غیر محدود اور غیر منقطع

تسلسل کے ساتھ توہین و تحقیر کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس روایت کے پہلے حصے پر پُر تشدّد رویّے اختیار کرنے والے اس کے دوسرے حصّے کو کیوں ترک کر دیتے ہیں؟

جہاںتک صحابہؓ پر 'سبّ' کی سزا کا تعلق ہے، اگر یہ مسئلہ دین کے اہم اور بنیادی قوانین سے تعلق رکھتا تھا تو تحقیق کا حق ادا کرتے ہوئے ائمۂ سلف کو اس زیرِ بحث روایت کی روشنی میں درجِ ذیل روایات کا حل بھی تلاش کرنا چاہیئے تھا۔ یہ معدودے چند روایات ہیں جو صرف صحیح بخاری سے بطور نمونہ پیش ہیں۔ جبکہ صحیح بخاری میں اور دیگر کتب میں اس نوع کی متعدد روایات موجود ہیں۔

چنانچہ صحیح بخاری 'کتاب الھبۃ و فضلھا ..... باب من اھدٰی الٰی صاحبہٖ و تحرّی بعض .....' میں ایک تفصیلی واقعہ درج کیا گیا ہے اور اس میں حضرت زینبؓ کے بارے میں لکھا ہے " فَسَبَّتْهَا " کہ آپؓ نے حضرت عائشہؓ پر 'سبّ' کیا۔

بخاری 'کتاب المغازی باب الافک' میں ہشّام اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا: " سَبَبْتُ حَسَّانَ " میں نے حسّان بن ثابتؓ پر 'سبّ' کیا۔

بخاری 'کتاب الادب باب قول الضیّف لصاحبہٖ .....' میں لکھا ہے: " فَغَضِبَ اَبُوْبَكْرٍ فَسَبَّ " کہ ابو بکرؓ نے غصہ کیا اور 'سبّ' کیا۔

ان روایات میں لفظ 'سبّ' استعمال ہوا ہے۔ ان کے شائع شدہ اردو تراجم میں اس کا عام معنٰی گالی ہی کیا گیا ہے۔ ان صحابہؓ یا صحابیاتؓ کو کیوں کوڑوں کی سزا نہیں دی گئی؟ پیٹا کیوں نہیں گیا؟ یہ سب کبار صحابہؓ اور صحابیاتؓ ہیں۔ اگر گالی دینے کی سزا وہی ہے جو زیرِ بحث روایت

میں قرار دی گئی ہے تو صحیح کتب کی صحیح روایتوں میں مذکوران تاریخی حقیقتوں کو کیوں چھپایا جاتا ہے جو اوپر بیان کی جاچکی ہیں؟

بات یہیں نہیں ٹھہر جاتی کہ صحابہؓ نے صحابہؓ پر 'سبّ' کیا بلکہ روایات میں رسول اللہ ﷺ کے بارہ میں لکھا ہے کہ آپؐ نے بھی 'سبّ' کیا۔ چنانچہ درجِ ذیل روایات ملاحظہ فرمائیں۔

1: "فَسَبَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم الْوَاصِلَةَ وَالْمُسْتَوْصِلَةَ" (بخاری کتاب اللّباس باب وصل الشَّعر) کہ رسول اللہ ﷺ نے بال لگانے والی اور لگوانے والی پر 'سبّ' کیا۔ (اس کے معنے ترجموں میں 'لعنت' کئے گئے ہیں۔)

2: "قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم أَيَّمَا مُؤْمِنٌ سَبَبْتُهُ أَوْ لَعَنْتُهُ أَوْ جَلَدْتُهُ فَاَجْعَلُهَا لَهُ زَكَاةً وَ رَحْمَةً" (تاریخ مدینۃ دمشق (ابن عساکر) الجزء الرابع باب ذکر تواضعہ لربّہ و رحمتہٖ لامّتہ......) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کسی مومن کو میں نے 'سَبّ' کیا ہو (برا کہا ہو) یا لعنت کی ہو یا اسے پیٹا ہو تو میں اسے اس کے لئے اس کی پاکیزگی اور رحمت قرار دیتا ہوں۔

اسی باب میں اس کے ساتھ متعدد روایات درج ہیں جن میں اس لفظ کے علاوہ 'شَتَمْتُ' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تبوک کے سفر میں دو آدمیوں کے بارے میں آتا ہے: "فَسَبَّهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم" (مسند احمد بن حنبل مسند الانصار، حضرت معاذ بن جبلؓ) کہ رسول اللہ ﷺ نے (چشمے پر آپؐ سے پہلے پہنچنے والے) دو افراد پر 'سبّ' کیا۔

ان کے علاوہ ایک روایت ' الصارم المسلول' میں یہ بھی درج کی گئی ہے کہ " مَنْ سَبَّ أَصْحَابِي فَقَدْ سَبَّنِي، وَمَنْ سَبَّنِي فَقَدْ سَبَّ اللّٰه "(الصارم المسلول الجلّد الثانی صفحہ 1082 مطبوعہ رمادی للنشر الموتمن للتوزیع) کہ جس نے میرے صحابی کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی اس نے اللہ تعالیٰ کو گالی دی۔

اس کا براہِ راست مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صحابہؓ میں سے کسی کو برا بھلا کہتے ہیں وہ دراصل رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) برا بھلا کہتے ہیں بلکہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ اگر لفظ 'سبّ' کے معنے عرفِ عام والی گالی کریں تو اس کی زد میں کون کون آتا ہے۔ پس اس زیرِ بحث خود ساختہ روایت کے حصے "مَنْ سَبَّ أَصْحَابِي فَاضْرِبُوْهُ" کا قانون اگر انصاف اور عدل کے تقاضوں کے تحت جاری کیا جائے تو دیکھیں کہ بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ صحابیؓ کو 'سبّ ' کرنے سے اگر بدنی سزا دینا رسول اللہ ﷺ کا بیان فرمودہ اور قائم کردہ ایک قانون تھا تو ان تمام 'سبّ' کرنے والوں کو کیوں زدو کوب نہیں کیا جاتا رہا؟ نیز اس زیرِ بحث روایت کے خلاف کھڑی ان صحیح حدیثوں کو عمداً کیوں نظر انداز کر دیا گیا ہے جو عفوو درگزر اور گستاخی کرنے والوں کو معاف کرنے کا سبق دیتی ہیں؟

ظاہر ہے کہ ایسے سوالوں کا سوائے اس کے اور کوئی جواب نہیں ہے کہ یہ زیرِ بحث روایت ہی بتمام وجوہ قابلِ ردّ ہے۔ سبّ و توہین خواہ رسول اللہ ﷺ پر کی جاتی تھی یا صحابہؓ پر، اس کی سزا قتل یا کوڑے لگانا نہیں تھی، لہٰذا تاریخ گواہی دیتی ہے کہ کبھی بھی یہ سزا نہیں دی گئی۔

روایت کے متن کا تجزیہ: اس زیرِ بحث روایت کے پہلے حصہ میں چار الفاظ ہیں:

۱: مَنْ: جو۔ یعنی کوئی بھی ہو۔ چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ مسلمانوں میں بھی وہ کسی بھی فرقے یا مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا ہو، بلا استثناء 'مَنْ' کے احاطہ میں آتا ہے۔

۲: سَبّ: اس لفظ کا عام معنٰی گالی کیا گیا ہے اور عرب لغات میں بھی بنیادی معنٰی یہی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس کے معنے اَلعَارُ یعنی عیب زنی اور تَقَاطُع یعنی تعلق منقطع کرنے کے بھی ہیں۔ اس کے معنے بے عزّتی کے بھی کئے گئے ہیں۔ امام راغبؒ نے اس کے معنوں میں 'بیہودہ'، 'بے مقصد بات' اور 'نامناسب الفاظ' بھی تحریر کئے ہیں۔

احترام، عقیدت، تقدّس اور بلند مقام کا تقاضا ہے کہ اگر صحابہؓ کی طرف سے لفظ 'سبّ' ادا ہو تو اس کے نرم ترین معنے لینا ہی مناسب ہیں۔ وہاں گالی کے معنے نہیں لئے جاسکتے۔

حدیث اور سیرت کی کتابوں میں درج ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے بھی یہ لفظِ 'سبّ' ادا ہوا ہے۔ لیکن یہ ایک سچّائی ہے کہ جب یہ لفظ رسول اللہ ﷺ استعمال فرماتے ہیں تو اس کے نرم ترین معنے ہی لینے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہاں عام گالی والے معنے لئے جائیں گے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو کجا، کوئی نبی بھی گالی نہیں دیتا۔ لہٰذا 'سبّ' کے محاوراتی معنے اختیار کرنے ضروری ہیں۔ اسی طرح کوئی شخص اگر نبی کریم ﷺ یا کسی اور نبیؑ پر 'سبّ' کرتا ہے تو اس جگہ بھی ان کے لئے نرم ترین معنے لینے ہوں گے۔ کیونکہ کوئی گالی رسول کریم ﷺ کو یا دیگر انبیاء علیہم السلام کو نہیں پہنچتی۔

۳: نَبِیّاً: یہاں 'نبیّاً' نکرہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ کوئی بھی نبی۔ یعنی صرف رسول کریم ﷺ نہیں بلکہ تمام نبی۔ اگر یہاں مقصود صرف رسول اللہ ﷺ ہوتے تو لفظ

نَبِیّاً کی بجائے 'النَّبِیَّ' یعنی معرفہ ہوتا تو فقرہ یوں ہوتا'' مَنْ سَبَّ النَّبِیَّ فَاقْتُلُوْہ' '۔ پس اس کی نحوی ترکیب کی وجہ سے یہاں معنے یہ لئے جائیں گے کہ کسی بھی نبی کو کوئی برا بھلا کہتا ہے یا گالی دیتا ہے توفَاقْتُلُوْہ۔ اس روایت کے یہ لازمی معنے ہیں۔ چنانچہ ہر اس شخص کو جو آنحضرت ﷺ اور آپؐ سے پہلے یا بعد میں آنے والے نبیوں میں سے کسی کو گالی دیتا ہے تو اس سے فَاقْتُلُوْہ'' کے معنوں کے مطابق سلوک ہونا چاہئے۔

۴: فَاقْتُلُوْہُ: اس لفظ کے عام معنے تو جان سے مار دینے کے ہیں۔ مگر قرآن کریم، حدیث نبویؐ، عربی زبان اور محاورے کے مطابق قتل کے حقیقی معنوں کے ساتھ اس کے مجازی اور محاوراتی معنے بھی دیکھنے ضروری ہیں۔ چنانچہ

آیت کریمہ '' قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرَہٗ' ' (عبس:18) کے بارہ میں مفسّرین نے کہا ہے کہ یہاں قُتِلَ کا مطلب لُعِنَ ہے۔ یعنی (ایسے) انسان پر اللہ کی لعنت ہو۔

اسی طرح'' قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنَّى يُؤْفَكُوْنَ'' (التوبۃ: 30) اس کا معنٰی یہ کیا گیا ہے کہ خدا منافقوں پر لعنت ڈالے۔

حدیث میں ہے'' قَاتَلَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ'' کہ اللہ یہود کو ہلاک کرے۔ اس کا مطلب یہ بھی لیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود پر لعنت ڈالے۔ اور بعض نے یہ معنے کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا دشمن ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے نمازی کو حکم دیا ہے کہ اگر نماز میں اس کے آگے سے کوئی گزرے تو ''قَاتِلْهُ فَاِنَّهٗ لَشَيْطٰنٌ'' کہ وہ شیطان ہے اسے سامنے سے ہٹا دو۔ یہاں اس کے معنے

موت کے گھاٹ اتارنے کی بجائے اسے ہٹا دینے کے لئے جاتے ہیں۔رہ روایتیں ان معنوں کے ثبوت میں کتبِ لغت میں درج کی گئی ہیں۔

اسی طرح کہتے ہیں:" قَتَلَ اللّٰہُ فُلَانًا" اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ اللہ اس کے شر سے بچائے۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کی مجلس میں خلافت کے بارے میں جو ماحول قائم ہوا اس منظر میں حضرت عمرؓ نے کہا: " قَتَلَ اللّٰہُ سَعْدًا" کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو سعد(بن معاذؓ) کے شرّ سے بچائے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؓ نے فرمایا: " اُقْتُلُوْا سَعْدًا قَتَلَہُ اللّٰہُ۔"(الطبری۔جزء الثالث مطبوعہ دارالمعارف مصر،واقعات سنۃ 11ھ،ذکر الخبر..... سقیفۃ بنی ساعدۃ)مراد یہ تھی کہ اسے مقتول سمجھو کہ گویا یہ زندہ ہی نہیں۔اس کی بات نہ مانو، اسے یوں سمجھو کہ وہ گویا قتل ہی ہو گیا،وہ گویا کالعدم ہو گیا ہے،بے حیثیت ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب فرمایا" اُقْتُلُوْہُ"تو کسی نے اس سے موت کے گھاٹ اتارنا مراد نہیں لیا۔

لغت و محاورۂ عرب میں سے حسبِ ذیل مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔جو لغتِ عرب میں سے ' تاج العروس'، لسان العرب' اور ' المعجم الوسیط ' وغیرہ سے مأخوذ ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

قَتَلَ الشَّیئَ خَبْرًا وَ عِلْمًا۔ اس نے کسی بات کو علم کے لحاظ سے قتل کر دیا یعنی اس چیز کے بارے میں مکمل علم حاصل کیا۔ پھر یہ بھی کہتے ہیں۔

قِیْلَ لِلْخَمْرِ مَقْتُوْلَۃٌ: شراب کو مقتولہ کہا جاتا ہے، جب اس میں پانی ملا کر اس کی تیزی ختم کر دی گئی ہو۔

قَتَلَ فُلَانًا کہا جائے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے دوسرے کو ذلیل و رسوا کر دیا۔

تَقَتَّلَ الرَّجُلُ لِلْمَرْأَۃِ کا مطلب ہے کہ مرد عورت کا مطیع ہو گیا۔

نَاقَۃٌ مُقَتَّلَۃٌ ایسی اونٹنی کو کہتے ہیں جو مالک کے اشارے پر چلتی ہو۔

ان چند مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل کے معنے عربی میں صرف جان سے مارنے اور موت کے گھاٹ اتارنے کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ اپنی صرفی ترکیب، صورتحال اور تناظر کے لحاظ سے اپنے مجازی اور محاوراتی معنے بھی اپناتا ہے۔ اسے اکثر مجازی معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ اس لئے 'فَاقْتُلُوْہ' سے ہر جگہ جان سے مار دینا آیاتِ قرآنیہ، سنّتِ رسول ﷺ اور عربی محاورہ کے خلاف ہے۔

پس جب قرآن کریم، احادیث نبویہ، لغت و محاورۂ عرب میں قتل کے دیگر معانی موجود ہوں تو ایسی صورت میں اگر کوئی ایسی یقینی حدیث بھی جس میں "اُقْتُلُوْہ" کا لفظ استعمال ہوا ہو تو اس میں اس لفظ کا یہ ترجمہ کرنا کہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دو، جائز نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ قرآن کریم کی صریح آیات اور سنّت و اسوۂ رسول ﷺ کے منافی ہو گا۔ جیسا کہ باب دوم میں متعدد بار ثابت کیا جا چکا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے آپؐ کی کھلی کھلی توہین کرنے والوں کو کبھی بھی قتل نہیں کیا، نہ گردن مارنے کا حکم دیا اور نہ ہی کسی صحابیؓ کے غیرت کے تحت اجازت طلب کرنے پر اسے اس کی اجازت دی۔ بلکہ آپؐ تو ایسے بدزبانوں کے لئے ہدایت کی دعا کرتے تھے۔ پس ان حقائق کی بنیاد پر اس زیرِ بحث روایت کو جہاں قبول نہیں کیا جا سکتا، وہاں اس میں لفظ "فَاقْتُلُوْہُ" کے معنے جان سے مار دینا بھی کسی طور پر اختیار نہیں کئے جا سکتے۔ اس فقرے کے واضح اور موزوں معنے یہی بنتے ہیں کہ جو بھی کسی نبیؑ کے بارے میں نازیبا یا اس کی شان کے منافی کلام

کرے اس کو اس سے روکو اور اس کی اس بدتمیزی کو کالعدم سمجھو۔ کیونکہ اس کی فضول حرکت سے نبیوں کی شان میں ایک تنکا برابر فرق بھی نہیں پڑتا۔

پس یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ زیرِ بحث روایت میں ' فَاقۡتُلُوۡہُ' سے جان سے مارنا یا گردن مارنا یا عرفِ عام کے مطابق قتل کر دینا مراد نہیں ہے۔

روایت کے الفاظ میں تبدّل: یہاں یہ بھی قابلِ ذکر اور قابلِ فکر بات ہے کہ کتاب المعجم الصغیر جس میں سب سے پہلے یہ روایت نمودار ہوئی وہاں۔'' مَنۡ سَبَّ الاَنۡبِیَآءَ'' کے الفاظ ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے: مَنۡ سَبَّ الاَنۡبِیَآءَ قُتِلَ وَمَنۡ سَبَّ اَصۡحَابِی جُلِدَ۔'' یعنی اس پہلی روایت میں سب انبیاءؑ کا ذکر ہے۔ اس سے صاف طور پر ثابت ہے کہ اگر بفرض محال اس وضعی روایت کو ایک لمحہ کے لئے مان بھی لیا جائے تو اس میں صرف رسول اللہ ﷺ کی بات نہیں، بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام مذکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ بعد میں یہ روایت کس طرح بدل گئی اور ' اَلۡاَنۡبِیَاء ' کی بجائے ' نَبِیًّا ' کا لفظ اختیار کر لیا گیا۔ الغرض جو بھی ہو اوہ بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ اس روایت کو بنایا گیا ہے اور بعد میں اس کے مضمون پر کسی کو تسلّی نہ ہوئی تو اس کے الفاظ کو بھی بدل دیا گیا۔ جبکہ راوی دونوں میں حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ ہی ہیں۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ ' المعجم الصغیر ' والی روایت میں الفاظ ' قُتِلَ ' سے مراد جان سے مار دینا نہیں بلکہ ایمانی لحاظ سے ایسا ہو جانا مراد ہے کہ گویا وہ اپنا ایمان ختم کر چکا ہے، وہ اپنے ایمان کو مار چکا ہے یا کالعدم ہو چکا ہے۔ اسی طرح ' جُلِدَ ' سے مراد ہے کہ جو صحابیؓ کو گالی دے وہ گویا ایمانی لحاظ سے از خود پِٹ چکا ہے۔ کیونکہ نبیوں کو ہر گالی دینے والا پکڑا جا سکتا ہے نہ پکڑا گیا ہے۔ تو اس کے لئے یہ روایت کالعدم اور بے معنے ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ' قُتِلَ ' میں ایک

حتمیّت پائی جاتی ہے کہ وہ لازماً قتل ہو گیا۔ وہ قتل ہو چکا ہے۔ اسی طرح تاریخ شاہد ہے کہ کسی صحابیؓ یا صحابیہؓ کو کوڑے مارے گئے نہ پیٹا گیا تو اس ثابت شدہ واقعاتی حقیقت کی وجہ سے اس کے یہ معنے نہیں لئے جاسکتے کہ نبیوں کو گالی دینے والے کو جان سے مار دیا جائے اور کسی صحابیؓ کو گالی دینے والے کو ظاہری کوڑوں سے مارا پیٹا جائے۔

خلاصہ کلام:

۱: یہ روایت ابتدائی صحیح اور مستند مجموعہائے احادیث میں شامل نہیں ہے۔ یہ چوتھی صدی ہجری میں منصہ شہود پر ابھری ہے۔

۲: ائمہّ فن کے مطابق یہ روایت علمِ سند اور علمِ درایت کے لحاظ سے ضعیف روایت ہے بلکہ موضوع ثابت ہوتی ہے۔

۳: اس روایت میں جو تغیّر و تبدّل ہوا ہے، اس سے اس کے معنوں میں بھی تبدیلی آئی ہے۔

۴: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کے اپنے عمل سے ثابت ہے کہ یہ بات ان کے زمانے میں بالکل بھی موجود نہیں تھی۔ نہ ہی اس پر کبھی ان معنوں میں عمل ہوا ہے جو معنے آج متشدّد لوگ لیتے ہیں۔

۵: اس روایت کے تمام الفاظ اُن معنوں کو ردّ کرتے ہیں جو ایک مخصوص طبقہ محض کشت و خون کے لئے اختیار کرتا ہے۔

۶: اس روایت کی نحوی ترکیب بتاتی ہے کہ اس میں صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص نہیں ہیں، بلکہ تمام انبیاء مراد ہیں۔

۷: اس روایت کا ایک جزو یعنی صحابہؓ کو گالی دینے والے کی سزا والا حصّہ ہمیشہ نا قابلِ عمل رہا ہے۔

الغرض اس ساری بحث کا یہی خلاصہ نکلتا ہے کہ یہ روایت خلافِ قرآن کریم، خلافِ احکام و سنّتِ رسول ا، خلافِ عملِ خلفائے راشدین و صحابہؓ، خلافِ اجماع و طریقِ ائمّہ اور خلافِ عقل ہے۔ اس کی اندرونی شہادت ثابت کرتی ہے کہ یہ روایت وضعی ہے اور نا قابلِ عمل ہے۔ ایسی وضعی روایات خوبصورت دین اسلام پر الزام قائم کرتی ہیں، اس کی دلکش تعلیم کو متّہم کرتی ہیں اور اس سے اس کی بنیادی کشش چھین کر عالمگیر نفرتوں میں اتار دیتی ہیں۔ لہٰذا ان کا ترک کرنا ضروری ہے۔ ان کا دینِ اسلام کی خوبصورت، پُرکشش اور پاک تعلیمات سے قطعی طور پر کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ اسلام ایک پُر رحمت، سچّا، مثبت اور عملی مذہب ہے۔ یہ قتل و غارت جیسے وحشیانہ، جھوٹے، منفی اور مہلک نظریات کو ترک کر کے پُر امن اور مثبت راہوں پر آگے سے آگے چلنے کی تلقین کرتا ہے۔

* * * * *

21: مرتد کا قتل

شاتمِ رسولؐ کے قتل کے جواز میں ایک روایت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ " ابن ماجہ نے روایت کی کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے ایک مرتد کو قتل کی سزا دی۔ اس پر فتح القدیر کا مؤلف لکھتا ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کے خلاف غلیظ زبان استعمال کرے اس کی گردن اڑا دی جائے۔" (ابن ماجہ جلد 2 ص 281، بحوالہ طبرانی)

فتح القدیر نے حوالے کے بغیر یہ روایت ابن ماجہ کے حوالے سے پیش کی ہے جبکہ یہ روایت صحیح بخاری کتاب استتابۃ المرتدّین والمعاندین وقتالھم باب حکم المرتدّ والمرتدّۃ واستتابتھم، ابو داؤد کتاب الحدود اور دیگر کتب میں بھی آئی ہے۔

اوّل تو یہ دلیل ہی غلط ہے کہ مرتد کو قتل کیا گیا لہٰذا وہ شاتمِ رسولؐ تھا۔ اس روایت میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو سکتا ہو کہ اس شخص نے کوئی سبّ و شتم یا کوئی گالی گلوچ کیا تھا۔ پس ایسی روایت کو شتمِ رسولؐ یا توہینِ رسالت کی سزا قتل کے ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا ہے؟

علاوہ ازیں ایسا حکم نہ قرآن میں ہے نہ آنحضرت ﷺ کا کوئی ایسا ارشاد موجود ہے کہ جو محض ارتداد اختیار کرے اسے قتل کر دو۔ اسے اگر قرار دیا جا سکتا ہے تو حضرت معاذؓ کی اپنی رائے قرار دیا جا سکتا ہے، قرآن و حدیث کی ہرگز یہ تعلیم نہیں ہے۔

جہاں تک اس واقعے کا تعلق ہے تو اس روایت میں باقی سب منظر اور کوائف مخفی ہیں کہ وہ شخص محض ارتداد کی وجہ سے پکڑا گیا تھا یا اس نے کوئی اور جرم یا بغاوت وغیرہ کا ارتکاب کیا تھا کہ وہ فساد فی الارض یا محاربت کے زمرے میں آتا ہو۔ چونکہ اس واقعے کے سارے کوائف

موجود نہیں اس لئے ایک اہم مسئلے میں قرآن کریم کی واضح آیات کے خلاف فیصلہ ہر گز قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک مسلّمہ اصول ہے کہ جہاں کوئی حدیث، اثر یا روایت جو خواہ کیسی بھی مستند کیوں نہ ہو، اگر واضح طور پر قرآن کریم کی کسی آیت یا حکم کے خلاف ہو تو اسے ردّ کر کے قرآن کریم کے حکم کو اپنایا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ روایت بہت سی احادیثِ صحیحہ کے تو خلاف ہے ہی مگر قرآن کریم کی واضح آیات بھی اس کو ردّ کرتی ہیں۔ (ایسی کچھ آیات حضرت امام بخاریؒ کے حوالے سے دسویں نمبر پر مذکور روایت " مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہٗ" کے ضمن میں تحریر کی جا چکی ہیں)

اوّل تو کسی صحابی کی رائے کو قرآن پر اور واضح فرموداتِ رسولؐ پر فوقیت یا ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ حضرت معاذ بن جبلؓ ان چنیدہ چار صحابہؓ میں سے ہیں جن کے بارے میں آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا تھا: "خُذُوْا الْقُرْآنَ مِنْ اَرْبَعَۃٍ" (ترمذی ابواب المناقب باب مناقب عبداللہ بن مسعودؓ و اُسد الغابہ معاذ بن جبلؓ) کہ ان چار سے قرآن سیکھو۔ ان سے ایسی بات کی توقع کرنا جو قرآن کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہو، ممکن نہیں ہے۔ اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حوالہ دیا ہے تو اس کا لازماً مطلب یہی ہے کہ تفصیلی واقعہ کچھ اور تھا جو اس روایت میں پورا محفوظ نہیں ہو سکا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے جو تفصیل بتائی تھی (جو غالباً روایت میں ریکارڈ نہیں ہو سکی) اس کے مطابق لازماً وہ بغاوت یا فساد کا کوئی عادی مجرم تھا جو قرآنی حکم کے تحت آتا تھا۔ ورنہ محض ارتداد اختیار کرنے والے کے لئے قرآن کریم کسی ایک جگہ بھی قتل کی سزا تجویز نہیں فرماتا۔ (چنانچہ گزشتہ صفحات میں روایت نمبر 10 کے تحت صحیح بخاری میں امام بخاریؒ کی پیش فرمودہ وہ تمام آیات درج کی گئی ہیں جن میں مرتد کے قتل کی ممانعت ہے۔)

فتح القدیر کے مصنّف (یعنی عبد الرزّاق) کے حوالے سے ایک چڑھاوا اس روایت پر چڑھایا گیا ہے۔ لیکن نفسِ روایت کو اگر دیکھا جائے تو فتح القدیر کا تبصرہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ روایت کے الفاظ کے مطابق حضرت معاذؓ ایک مرتد کو مارنے کی بات کر رہے ہیں، جبکہ فتح القدیر کا مصنف اسے شاتم یا گستاخِ رسولؐ کی سزا کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ اسی بناوٹی کارروائی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر قتل کے معاملے کو انتہائی تکلّف اور بناوٹ کے ساتھ سبّ و شتمِ رسولؐ سے منسلک کیا جاتا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت سبّ و شتم والے مسئلے سے کسی طرح بھی متعلق نہیں ہے۔

*****

22: یمن میں ایک مرتدّہ

قاضی عیاض کی کتاب الشّفا کے حوالے سے یہ بے سند روایت بھی شاتمِ رسولؐ کے قتل کے حق میں پیش کی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یمن کے گورنر مہاجر بن امیّہ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو اطلاع دی کہ وہاں ایک عورت مرتد ہو گئی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی والا گیت گایا۔ گورنر نے اس کا ہاتھ کاٹ دیا اور سامنے والے دو دانت توڑ دیئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کو پتہ چلا تو آپؓ نے فرمایا۔ اگر تُو فیصلہ کر کے عمل نہ کر چکا ہوتا تو میں اس عورت کے قتل کرنے کا حکم صادر کرتا۔ اس لئے کہ نبیوں کی تنقیص کی تعزیر حدود جیسی نہیں ہوتی۔ یا نبیوں کی بیان کردہ سزائیں حدود جیسی نہیں ہوتیں۔''

روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''وَبَلَغَ الْمُهَاجِرَ ابْنَ اَبِي اُمَيَّةَ اَمِيْرَ الْيَمَنِ لِاَبِي بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ امْرَأَةً هُنَاكَ فِي الرِّدَّةِ غَنَّتْ بِسَبِّ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَطَعَ يَدَهَا وَنَزَعَ ثَنِيَّتَهَا فَبَلَغَ ذٰلِكَ اَبَا بَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ ذٰلِكَ فَقَالَ لَهُ لَوْلَا مَا فَعَلْتَ لَاَمَرْتُكَ بِقَتْلِهَا لِاَنَّ حَدَّ الْاَنْبِيَآءِ لَيْسَ يُشْبِهُ الْحُدُوْدَ'' (الشفاء۔ القسم الرابع فی تصرّف وجوہ الاحکام فیمن تنقّصہ او سبّہٗ علیہ السلام۔ الباب الاوّل فی بیان ماھو فی حقّہ اسبٌّ او نقصٌ..... مع شرح ملا علی قاری صفحہ 406)

اگر اس بے سند روایت کو درست مان بھی لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب رسول اللہ ﷺ کے وصال سے قبل یمن میں اسود عنسی نے نبوّت کا دعوٰی کر کے عام بغاوت کی اور کھلی کھلی جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ اس میں یمن کے بہت سے مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا تھا۔ یمن کے علاقہ صنعاء کے گورنر حضرت شہر بن باذانؓ بھی اس کے مقابلے میں شہید

ہو گئے تھے۔ بالآخر اس بغاوت میں اسود عنسی خود بھی اپنے بہت سے ساتھیوں سمیت قتل ہوا۔ پھر یہ بغاوت حضرت ابو بکرؓ کے زمانے تک بھی ممتد رہی۔

جنگوں میں اشتعال دلانے کے لئے رزمیہ اور ہجویہ شعر گانے والی عورتیں فوج کا جزو اور لڑائی میں مکمل حصہ دار ہوتی ہیں۔ لہٰذا لڑائی کے دوران اگر وہ قتل ہوئی تھی تو اس کا قتل لڑائی کے مسلّمہ اصولوں میں سے تھا۔ اسی کی بابت حضرت ابو بکرؓ نے توجہ دلائی تھی کہ ہاتھ کاٹنے یا دانت توڑنے کی سزا تو کوئی سزا نہیں ہے۔ مگر تم اب اسے یہ سزا دے چکے تو اب مزید کارروائی کی ضرورت نہیں۔ میدانِ کارزار میں اگر سامنے آجائے تو ایسے محارب کو اسی دم قتل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

قائلینِ قتلِ شاتم کی دلیل اس پہلو سے بھی کمزور اور بے بنیاد ثابت ہوتی ہے کہ اگر ہجویہ اشعار یا توہینِ رسولؐ پر قتل کرنا شرعی سزا کے طور پر قائم اور نافذ ہو چکا ہوتا تو ہاتھ دانت کٹ جانے سے حضرت ابو بکرؓ وہ سزا ساقط کس طرح کر سکتے تھے؟ اس کے بعد بھی تو اسے اصل سزا کے تحت قتل کیا جانا ضروری تھا۔ پس قارئین غور فرمائیں کہ یہ روایت اسی سچائی کا ثبوت مہیّا کرتی ہے کہ توہینِ رسالت کی سزا قتل نہیں ہے۔ نیز خلیفۃ الرسولؐ کا کسی شرعی حکم سے پہلو تہی کرنا ممکن نہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اگر ایک ثانئے کے لئے اس روایت کو درست مان بھی لیا جائے تو حضرت ابو بکرؓ کا مذکورہ بالا تبصرہ محض یمن میں باغیانہ کارروائیوں اور جنگی حالات کے تحت تھا۔ عام حالات کے مطابق نہیں تھا۔ اسی طرح مہاجر بن ابی امیّہ نے اگر بطور جرنیل اس عورت کو موقع پر سزا دی تھی تو وہ ان کا اپنا فیصلہ تھا۔ اس سے بڑھ کر اس کی نہ کوئی حیثیّت تھی، نہ ہی ان کے اس فعل کو شریعت کا کوئی حکم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ملّا علی قاریؒ نے اس روایت کے تحت لکھا ہے کہ ایک روایت میں ہے کہ اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے گئے تھے اور ایک اور روایت میں ہے کہ اس کے دونوں پستان کاٹ دیئے گئے تھے۔ لیکن بہتر تھا کہ یا تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی یا اسے قتل کر دیا جاتا۔(شرح الشفا صفحہ 406)

روایات میں مذکور ان تمام مختلف اور متفرّق باتوں میں سے کس کو صحیح اور سچا سمجھا جائے اور کس کو نہ سمجھا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس بے سند روایت میں اتنے اختلافات یقینی طور پر اس روایت کا اضطراب ظاہر کرتے ہیں اور اس کو بنیادی طور پر کمزور بلکہ وضعی ثابت کرتے ہیں۔ ایسی بے بنیاد روایت پر عقائد کی بنیاد حباب بر آب کے سوا کچھ نہیں۔

*****

23: سفیان ہذیلی

ایک روایت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ "امام سیوطی نے خصائص الکبریٰ میں سفیان ہذیلی کے بارے میں یہ روایت لکھی کہ آنحضور ﷺ نے اس گستاخ کی نشاندہی خود فرمائی اور کہا کہ اس وقت وہ وادیٔ نخلہ یا وادیٔ عُرَنہ میں ہے۔ تم جاؤ اور اسے قتل کرو۔ آپؐ نے عبداللہ بن انیس کو اپنا عصا مبارک بطور انعام عطا فرمایا۔" (الخصائص الکبریٰ جلد 1 صفحہ 523)

لیکن یہ پوری روایت اس طرح ہے کہ بیہقی اور ابو نعیم نے یہ روایت لی ہے کہ عبداللہ بن انیسؓ فرماتے ہیں کہ انہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آپؐ کو یہ اطلاع ملی ہے: "اِنَّ ابْنَ نُبَیْحَ الْھُذَیْلِیَّ یَجْمَعُ النَّاسَ لِیَغْزُوْنَنِی وَھُوَ بِنَخْلَۃَ اَوْ بِعُرَنَۃَ فَاْتِہٖ فَاقْتُلْہُ۔" (الخصائص الکبریٰ جلد 1 صفحہ 390 باب ما وقع فی قتل سفیان بن نبیح الھذلی، الناشر دار الکتب العلمیۃ۔ بیروت) کہ ابن نُبَیح ہُذَیلی لوگوں کو نخلہ میں یا وادی عرنہ میں جمع کر رہا ہے تاکہ مجھ پر چڑھائی کرے۔ لہٰذا جاؤ اور اسے قتل کر دو۔

جو روایت پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہذیلی شخص ایک وادی میں کھڑا رسول اللہ ﷺ پر کوئی گالی گلوچ نہیں کر رہا تھا جس کے انسداد کے لئے آپؐ نے اسے قتل کا حکم صادر فرمایا تھا۔ یہ روایت کسی گالی گلوچ کی نشاندہی نہیں کرتی بلکہ ایک کھلی کھلی محاربانہ کارروائی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ایسی کارروائیوں کو روکنے کے لئے دفاعی اقدامات تو رسول اللہ ﷺ کئی غزوات اور سرایا کے ذریعے بھی فرما چکے ہیں۔ مثلاً خیبر پر آپؐ کے غزوے کی بنیاد ہی یہ تھی کہ اہلِ خیبر نجد کے غطفانی قبائل اور دیگر کئی قبائل سے معاہدے کر کے غزوۂ احزاب سے بڑی تعداد میں قبیلوں اور فوجوں کا انتظام کر رہے تھے اور مدینے پر یلغار کے لئے تیار تھے۔ یہ اطلاع جب رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو بجائے اس کے کہ وہ مدینے پر چڑھائی کرتے، آپؐ نے ان پر

چڑھائی کی۔ یہی آپؐ نے غزوۂ احزاب کے بعد فرمایا تھا ”اَلْاٰنَ نَغْزُوْھُمْ وَلاَ یَغْزُوْنَنَا“ یعنی اب وہ ہم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ اگر وہ ہمارے خلاف اٹھنے کی کوشش کریں گے تو ہم اپنے دفاع کے لئے ان پر چڑھائی کریں گے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے شدید صحرائی گرمی میں سینکڑوں میل کا انتہائی مشقت خیز اور تکلیف دہ سفر اختیار کر کے عرب کے شمال میں تبوک تک تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس غزوے کا نام ہی الغزوۃ العسرۃ یعنی شدید تنگی و تکلیف والا غزوہ رکھا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی ایک سرایا اور مہمّات ایسی تھیں جو آپؐ نے ایسی شرارت کرنے والوں کی سرکوبی کے لئے بھجوائیں۔ آنحضرت ﷺ کے ایسے اقدامات کو کھینچ تان کر توہین کی سزا کے طور پر پیش کرنا آپؐ پر کھلا کھلا اتّہام ہے۔ آپؐ نے کسی گالی دینے والے کو صرف گالی کی سزا کے لئے قتل کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔ چنانچہ گزشتہ صفحات میں ہم بدلائل ثابت کر آئے ہیں کہ آپؐ کی ساری حیاتِ طیّبہ میں ایک واقعہ بھی ایسا رونما نہیں ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے اقدام باغیوں اور مسلمانوں پر جنگ مسلّط کرنے کی تیاری کرنے والے قبائل کی سرکوبی کے لئے اس لئے کئے کہ تا فریقین کو کثیر جانوں کے اتلاف سے بچایا جائے۔ کسی جگہ اگر کسی ایک فتنہ پرداز شخص کے قتل کا حکم اس کی بغاوت، فساد یا محاربانہ کارروائی کی وجہ سے کیا بھی گیا ہے تو اس کی وجہ یہی تھی کہ ایک شخص کے نقصان سے قبیلے اور قوم کی بکثرت جانوں کی حفاظت ہو سکے۔ مبادا کہ وہ اس فتنہ پرداز کے پیچھے ہو کر اپنی جانیں گنوا بیٹھیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہ حکم دیا ہے کہ اگر وہ تم پر جنگ مسلّط کریں تو اس میں بھی کوشش کرو کہ ائمۃ الکفر کو مارو۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ لاعلمی کے نتیجے میں ان لیڈروں کی اتباع کرنے والوں کی جانیں تلف نہ ہوں۔ ایک دو یا چند ایک کی ہلاکت سے دیگر سب بچا لئے جائیں۔

اگر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا محبت اور سچائی کی نظر سے مطالعہ کریں تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ آپؐ انسان کے خون کے محافظ تھے۔ وہ خون چاہے کسی مسلمان کا تھا یا غیر مسلم کا۔ آپؐ کی ساری زندگی آپؐ کے اس پاک جذبے اور پُر رحمت مزاج کی گواہ ہے۔

پس امام سیوطیؒ نے زیرِ بحث روایت ویسے تو بیہقی کے حوالے سے درج کی ہے جو سند اوراصولِ روایت کے اعتبار سے ایک کمزور روایت ہے مگر اسے بفرضِ محال درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اسے گالی کے انتقام کے طور پر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

* * * * *

24: محمد بن ابی بکرؓ کے بارے میں ایک روایت

توہینِ رسولؐ کے ضمن میں ایک روایت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ ”حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے حضرت محمدؓ کے دور میں ایک امام نے جس کا نام عبد اللہ بن نواحہ تھا، قرآن کی آیات کا مذاق اڑایا اور مفاہیم کے ردّوبدل سے یہ الفاظ کہے:

”قسم ہے آٹا پیسنے والی عورتوں کی جو اچھی طرح گوندھتی ہیں پھر روٹی پکاتی ہیں پھر ثرید بناتی ہیں پھر خوب لقمے لیتی ہیں۔“

اس پر حضرت نے اسے قتل کا حکم سنایا اور لمحہ بھر بھی تاخیر نہ فرمائی۔(مصنف ابن ابی شیبہ باب ارتداد)“

سرسری نظر سے ہی اس روایت پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی کونسی توہین ہے یا کونسی گالی ہے جو آپؐ کو دی گئی ہے؟ جس کی بناء پر اسے توہین رسولؐ کی سزا قتل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

اپنے متشدّد مقاصد کے حل کے لئے یا اپنے خونی ارادوں کی تسکین کے لئے یہاں حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے کے ایک فعل کو شریعت کے ایک قانون کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے۔یعنی انہوں نے جو کہا یا کیا، وہ ایک شرعی حکم کی حیثیّت رکھتا ہے۔ جو ایسے لوگوں کی نام نہاد اسلامی سلطنت کے سنہری اصولوں میں شمار کیا جائے گا۔

یہ درست ہے کہ محمد، حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے تھے۔ مگر ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حجۃالوداع کے ایام میں پیدا ہوئے اور امرِ واقعہ یہ ہے کہ حجۃالوداع کے اسّی(80) دن بعد رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو گیا تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انہیں آپؐ کی صحبت حاصل نہ

ہو سکی تھی۔ اسی طرح انہوں نے بعد میں کوئی خاص دینی تعلیم بھی حاصل نہ کی تھی اور نہ ہی نیکی و تقویٰ میں ان کا کوئی مقام تھا۔ وہ ابھی اپنی عمر کے چوتھے سال میں تھے کہ حضرت ابو بکرؓ بھی فوت ہو گئے۔ لہٰذا انہیں اپنے مقدّس باپ کی تربیت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ موٴرخین نے لکھا ہے کہ ان کے بزرگ باپ کے سبب لوگ ان کا ادب کرتے تھے جس سے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ معاشرے میں کوئی خاص حیثیت یا مقام کے حامل ہیں۔ ورنہ در حقیقت انہیں کسی قسم کی کوئی سبقت حاصل نہ تھی۔

بعد میں بد قسمتی سے یہ عبد اللہ بن سبا کے ساتھ باغیوں کے گروہ میں شامل ہو کر خلیفۃ الرسولؐ حضرت عثمانؓ کی مخالفت کرنے والوں کے سرغنہ تھے۔ بالآخر جب باغی حضرت عثمانؓ کے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر کُودے تو ان میں محمد بن ابی بکر بھی پیش پیش تھے۔ یہ وہی تھے جو توہینِ خلیفۃ الرّسول میں گستاخی کی تمام حدوں کے ساتھ ساتھ آپؓ کے گھر کی دیوار بھی پھلانگ گئے تھے۔ یہ وہی تھے جنہوں نے آگے بڑھ کر حضرت عثمانؓ کی داڑھی پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ایسی توہینِ خلافتِ راشدہ کے مرتکب لوگ آج قتل وخون کی ہولیاں کھیلنے والے خونخواروں کے پیشوا بن رہے ہیں۔

ایک طرف یہ لوگ ایسی وضعی روایتیں پیش کرتے ہیں کہ جو صحابی کو گالی دے اسے کوڑے مارو اور دوسری طرف اسی لمحے ایسے مقدّس صحابی کی جو نہ صرف دامادِ رسولؐ تھا بلکہ راشد خلیفۃ الرسولؐ بھی تھا، ممکن حد تک توہین بلکہ تذلیل کے مرتکب شخص کو اپنا ہیرو بلکہ بہترین اسوہ قرار دے رہے ہیں۔ افسوس صد افسوس! کیا اس روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ کے ساتھ توہین آمیز سلوک کی وجہ سے محمد بن ابی بکرؓ خود کوڑوں کی سزا کے مستحق نہ تھے؟

مکرر عرض ہے کہ محمد بن ابی بکرؓ ان باغیوں میں سے تھے جنہوں نے راشد خلیفہ حضرت عثمانؓ سے وہ قمیص اتارنے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ منافق اسے اتارنے کی کوشش کریں گے مگر تم ہرگز نہ اتارنا۔ مگر محمد بن ابی بکر نے انتہائی ظالمانہ عمل سے ردائے خلافت کو اتارنے کے مطالبے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ لہٰذا ان کے کسی فعل کو کس طرح ایک شرعی مسئلے کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے یا اس کی تائید میں ان کا ایسا فعل کیونکر بطور دلیل لیا جاسکتا ہے۔

اگر تاریخی حقائق سے منہ نہ موڑا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ محمد بن ابی بکرؓ صرف حضرت ابو بکرؓ کے صاحبزادے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ ان کی زندگی دینی لحاظ سے تلخ حقیقتوں سے لبریز ہے تو انجام اس سے بھی زیادہ بھیانک۔ چنانچہ بعد میں جب وہ مصر میں والی تھے تو انہیں وہیں قتل کیا گیا اور ان کی لاش کی ناقابلِ بیان حد تک بے حرمتی کی گئی۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُوْلِی الْاَبْصَار

ایسے شخص کو جس کے ساتھ صرف مقدّس باپ کا نام لگا ہو، جبکہ اس کا اپنا دامن دینی خدمات سے تہی ہو، ہاتھ ظلم و گستاخی سے رنگے ہوئے ہوں، زبان مقدّسوں کی توہین و تنقیص سے تر ہو، کسی دینی مسئلے میں سند قرار دینا یا اس کا عمل سند کے طور پر پیش کرنا یقیناً دین سے کھلا کھلا کھلواڑ ہے اور حَسِین شریعتِ اسلام و سیرتِ محمدیؐ سے مذاق ہے۔

* * * * *

25:　منافق کی گردن کشی

ایک روایت تفسیر روح المعانی سے یہ پیش کی جاتی ہے کہ

"عبد اللہ بن عبّاسؓ کی سند سے روایت ہے کہ بِشر نامی ایک منافق کا کسی یہودی سے کسی معاملے میں تنازعہ تھا۔ یہودی نے فیصلے کے لئے رسول اللہ ﷺ کے پاس اور منافق نے اسے کعب بن اشرف کے پاس جانے کے لئے کہا۔ بہر حال دونوں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور آپؐ نے یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ منافق اس فیصلے پر راضی نہ تھا۔ چنانچہ وہ تنازعہ حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا۔ یہودی نے حضرت عمرؓ کو بتا دیا کہ رسول پاک ﷺ پہلے ہی اس کے حق میں فیصلہ دے چکے ہیں۔ یہ شخص اس پر راضی نہ تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے منافق سے پوچھا کہ کیا ایسا ہی ہے؟ اس نے کہا: "ہاں"۔ حضرت عمرؓ اندر گئے، اپنی تلوار لی اور آکر منافق کو قتل کر دیا اور کہا: "جو رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو تسلیم نہیں کرتا اس شخص کے لئے میرا یہی فیصلہ ہے۔" اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّىَ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً (النساء:66) ترجمہ: پس نہیں، تمہارے ربّ کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

اس روایت کو پیش کرنے والا مصنف لکھتا ہے۔" حضرت عمرؓ کے اس عمل کی قرآن کریم نے توثیق کی اور یہ اہانت رسول پاکؐ کے لئے سزائے موت کی نظیر ہے۔" (ناموسِ رسول اور قانونِ توہینِ رسالت صفحہ 98 اور 346)

مصنف نے جو آیت اپنی کتاب میں بِشر اور یہودی والے مذکورہ بالا واقعہ کے شانِ نزول کے طور پر پیش کی ہے، تفسیر روح المعانی میں اس کا صرف حوالہ موجود ہے۔ جبکہ اس میں مذکور واقعہ سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت نمبر66 کی بجائے اسی سورۃ کی حسبِ ذیل آیت نمبر 61 کے تحت درج ہے۔

''أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيْدُونَ أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيْداً'' ترجمہ: کیا تونے ان لوگوں کے حال پر نظر کی ہے جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لے آئے ہیں جو تجھ پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ وہ چاہتے ہیں کہ فیصلے شیطان سے کروائیں جبکہ انہیں حکم دیا تھا کہ وہ اس کا انکار کریں۔ اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ وہ انہیں دور کی گمراہی میں بہکا دے۔

پس ظاہر ہے کہ اپنی دلیل پیش کرتے ہوئے مصنّف نے آیت کے تعیّن میں غلطی کھائی ہے یا جان بوجھ کر وہ آیت پیش کر دی ہے جس سے اس کے گمان میں اس کا مقصد بر آتا تھا۔

پھر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہاں مصنّف تفسیر روح المعانی علامہ الوسیؒ نے بِشر اور یہودی والی روایت کے استناد کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ لیکن جو آیت 66 مصنف نے اپنی دلیل کے لئے پیش کی ہے اس کے تحت جو واقعہ تفسیر روح المعانی میں درج ہے وہ مذکورہ بالا واقعے سے کلّیۃً مختلف ہے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ در حقیقت قطعی طور پر وہی سچا واقعہ ہے۔ اس کے استناد کے لئے علامہ الوسیؒ نے بڑے وثوق اور طمطراق کے ساتھ صحاح ستّہ کے سب مصنّفین کے نام درج کئے ہیں۔ صحاح ستّہ مرتب کرنے والے ان سب محدّثین نے یہ واقعہ لے کر سزائے موت

کی جھوٹی دلیل پیش کرنے والے کی یہ نظیر توڑ کر رکھ دی ہے۔ مثلاً امام بخاریؒ نے مرفوع متصل سند سے اس آیت کے تحت کتاب التفسیر میں حضرت عروہؓ سے روایت درج کی ہے جس میں حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری کا کھیتوں کے پانی کے سلسلے میں ایک تنازعہ تھا۔ اس پر حضرت زبیرؓ کا خیال تھا کہ یہ مذکورہ بالا آیت اس بارہ میں نازل ہوئی تھی۔

بخاری کی روایت مرفوع متصل یعنی ایک اعلیٰ درجہ کی روایت ہے۔ اس کے مطابق یہودی اور منافق والا واقعہ نہیں ہوا اور نہ کسی ایسے واقعے کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ بلکہ یہ واقعہ حضرت زبیر اور ایک انصاری کے تنازعہ پر مبنی تھا۔ پس مصنّف نے ریت کی طرح گر جانے والی وضعی روایات پر اپنے موقف کو استوار کر کے جھوٹا موقف قائم کیا ہے۔

پھر یہی منافق اور یہودی کے تنازعے والا واقعہ جو تفسیر روح المعانی کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے، کتاب ''الصارم المسلول..... ''(جلد2 صفحہ 41 المسئلۃ الثالثۃ باب الوجوہ الدّالۃ علیٰ جواز قتل المنافقین اذا ثبت بالبیّنۃ) میں بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس موقع پر سورۃ النساء کی آیت نمبر61 ''أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُونَ .... الخ'' نازل ہوئی تھی اور جبریلؑ نے کہا تھا کہ عمرؓ نے حق اور باطل میں فرق کر دکھایا ہے۔ پس آپؓ کا نام فاروق ہو گیا۔

علّامہ الوسی نے روح المعانی میں اس یعنی آیت نمبر 61 کا ایک اور شانِ نزول بھی بتایا ہے کہ یہ ابوبرزہ الاسلمیؓ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ وہ کاہن تھا اور یہود میں فیصلے کیا کرتا تھا اور اس غرض سے مسلمان بھی اس کے پاس جاتے تھے۔ (یہ ابوبرزہ وہی ہیں جن کا ذکر روایت نمبر 15 میں بھی گزر چکا ہے)

اس صورتحال میں یہ تو بالکل واضح ہے کہ ان روایات یا واقعات میں سے کوئی ایک درست ہے۔ لیکن علمِ روایت و درایت کو جاننے والا ہر محقق اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ درست واقعہ وہی ہے جو صحیح بخاری (اصح الکتب بعد کتاب اللہ) میں درج ہے۔ کیونکہ اس کی سند مکمل ہے اور صحاح ستّہ میں یہ روایت بار بار اخذ کی گئی ہے۔ اس روایت کے مطابق کوئی قتل نہیں ہوا۔ باقی روایات وضعی ہیں جو ردّ کرنے کے لائق ہیں۔

روح المعانی کی مذکورہ بالا روایت میں ردّ شدہ واقعے کے بارے میں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ کعب بن اشرف کی زندگی کا ہے یعنی 3 ھ یا اس سے پہلے کا ہے۔ اس وقت تو عبد اللہ بن عباسؓ مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے۔ مسلمان تو کیا اس وقت آپؓ مکّے میں کم و بیش 5/4 سال کی عمر کے بچے تھے۔ اس عمر کا بچہ جو مکے کا رہنے والا تھا، سینکڑوں میل دور مدینے کے ایسے گہرے مسائل اور آیات کے نزول کے پس منظر کو کس طرح جان اور سمجھ سکتا تھا۔ پس واضح ہے کہ یہ روایت مبیّنہ طور پر وضعی اور جعلی ہے جو ایک بار پھر حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے نام پر وضع کی گئی ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں یہ حقیقت کھول کر بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ پر وضّاعوں نے یہ ظلم کیا ہے کہ ان کی طرف وہ روایات و تفاسیر منسوب کر دی ہیں جو انہیں نے بیان نہیں کیں۔

آیات کے شانِ نزول کی حقیقت: آیات کے شانِ نزول سے عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اِدھر کوئی واقعہ ہوا اور اُدھر فوراً اس کے مطابق آیت اتر آئی اور وہ واقعہ اس آیت کے نزول کا موجب بن گیا۔ دراصل یہ معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں یہ حقیقت مد نظر رکھنی چاہئے کہ شانِ نزول یا وجہِ نزول کا مسئلہ ایک مشکل مسئلہ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے اپنی کتاب ''الفوز الکبیر'' میں اس مسئلے پر جامع روشنی ڈالی ہے۔

آپؒ کے اس مضمون کا لبّ لباب یہ ہے کہ صحابہؓ یا تابعین جہاں یہ کہتے ہیں نَزَلَتْ فِیْ کَذَا یعنی یہ آیت فلاں بارے میں نازل ہوئی تو یہ کسی خاص واقعے سے مخصوص نہیں ہوتا جو آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے مبارک زمانے میں ہوا اور نزول آیت کا سبب بنا۔ ان کا یہ طریق تھا کہ وہ ایسے مواقع کا جو آپؐ کے زمانے میں یا اس کے بعد ہوئے ہوں، ذکر کر کے کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ آیت ایسے موقعے پر نازل ہوئی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ آیت پوری طرح اس واقعے پر منطبق ہو، بلکہ اصل حکم پر منطبق ہونی چاہئے۔ (یعنی واقعے کی نوعیت یا اس کی صورتحال پر اگر کسی آیت کریمہ کا حکم یا تعلیم چسپاں ہو تو اسے اس کے نزول کا گویا منظر قرار دیا جائے۔)

کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے میں کوئی واقعہ ہوا اور صحابہؓ نے اس سے متعلق سوال کیا تو اس پر آپؐ نے اس کا حکم کسی آیت سے اخذ فرما کر موقع پر وہ آیت تلاوت کر دی۔ ایسے واقعات کو بھی بیان کرتے وقت صحابہؓ نَزَلَتْ فِیْ کَذَا کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ قَوْلَہٗ کَذَا یعنی اللہ نے اپنا حکم اس طرح نازل فرمایا۔ اس تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا اس آیت سے استنباط اور اس وقت قلبِ مبارک پر جو کچھ القاء ہوا وہ بھی وحی اور نفث فی الرّوع کی ایک قسم ہے۔ (نفث فی الرّوع کا معنٰی ہے، دل میں پھونکنا اور اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بات جو اللہ کی طرف سے دل میں اترے) اس لئے ایسے موقع پر فانزلت کہنا جائز ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص اسے تکرارِ نزول سے بھی تعبیر کر لے۔

محدثین و مفسّرین قرآنی آیات کے تحت بہت سی ایسی چیزوں کا ذکر کر دیتے ہیں جو در حقیقت سببِ نزول نہیں ہوتیں۔ مثلاً صحابہؓ کا اپنے مباحثے میں کسی آیت کو بطور شہادت پیش کرنا،

یا کسی آیت سے مثال دینا، یا آنحضرت ﷺ کی تلاوت سے اپنی بات کو ثابت کرنا، یا ایسی حدیث روایت کرنا جو اصل مطلب کی آیت کی موافقت میں ہو، یا نزول آیت کے موقع کا تعیّن کرنا، یا جو اسماء آیات میں مبہم مذکور ہوں ان کا تعیّن کرنا، یا کسی قرآنی کلمے کا تلفظ کرنا، یا قرآنی سورتوں اور آیتوں کے فضائل بیان کرنا، یا امرِ قرآنی کی آنحضرت ﷺ نے جس طرح تعمیل کی اس کی شکل بتانا۔ اس قسم کی ساری باتیں در حقیقت اسبابِ نزول میں شامل نہیں ہیں۔ نہ ان باتوں کا احاطہ کرنا مفسّر کے لئے ضروری ہے۔ (ملخّص از الفوز الکبیر باب شان نزول کی حقیقت)

معزّز قارئین! الحمد للہ کہ اس باب میں ہم نے وہ تمام روایات جو 'توہینِ رسالت کی سزا قتل' کے موقف کو ثابت کرنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں، قرآن کریم، سنّت و اسوۂ رسول ااور مستند صحیح روایات کے ذریعے ردّ کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ یہ عقیدہ اسلامی عقائد میں سے نہیں ہے بلکہ قرآن کریم، اسلام، اور رسول اللہ ﷺ کے منشاء کے خلاف ہے۔

* * * * *

ایک قابلِ ذکر تاریخی ریکارڈ

امام مالکؒ پیدائش 93ھ (711ء) وفات 179ھ (795ء)

امام بخاریؒ پیدائش 13/شوال 194ھ وفات یکم شوّال 256ھ

ابن عباس جب ابن عباس پیدا ہوئے تو آنحضرت ﷺ شعب ابی طالب میں تھے۔ جب آنحضرت ﷺ کا وصال ہوا تو آپؓ 13 سال کے تھے۔ آپؓ 70/ 73 سال کی عمر میں طائف میں فوت ہوئے۔ (اسد الغابہ)

عکرمہ بربری وفات 104ھ

محمد بن عمر الواقدی 130ھ سے 207ھ

عبد الرزّاق بن ہمام 126ھ سے 211ھ (واقدی اور یہ دونوں ہمعصر ہیں)

ابن سحنون 202ھ تا 256ھ/یا 265ھ

قاضی عیاض 471ھ سے 544ھ

امام ابن تیمیہ 661ھ (1260ء یا 1263ء) سے 728ھ (1327ء یا 1328ء)

ابنِ سحنون سے امام ابن تیمیہ تک زمانہ وہ ہے جس میں عالمِ اسلام کے ایک حصے میں امویوں کی اور دوسرے میں عباسیوں کی سلطنتیں تھیں۔ حکومتوں میں عیسائی اور یہودی سب شامل تھے۔ عیسائی مذہبی رہنما اسلام کی اس وسعتِ قلبی اور ضمیر کی آزادی کی تعلیم سے ہمیشہ سے ہی پریشان و ہراساں تھے کہ عیسائی عوام ان میں یہ کشش دیکھ کر اس میں شامل ہو جائیں گے۔ لہٰذا وہ عیسائی نوجوانوں سے سرِ عام آنحضرت ﷺ کی توہین و تنقیص کرواتے تھے۔ اس

ماحول اور ضرورت کی وجہ سے حکوتِ وقت کی ایماء پر اُس وقت کے مفتیوں نے فتوے اور قاضیوں نے ایسے فیصلے جاری کئے۔ پھر بعد میں انہیں شرعی فتوے قرار دے کر شریعت کا حصّہ سمجھ لیا گیا۔ ان فتووں کے تحقّق کے لئے مختلف واقعات کو تکلّف اور تصنّع سے اور بسا اوقات جھوٹ کے ساتھ شرعی حیثیت دے دی گئی۔

* * * * *

باب سوم

کتاب ”الصّارم المسلول علیٰ شاتم الرّسولؐ “کاایک مختصر تجزیہ

*****

کتاب ”الصّارم المسلول علیٰ شاتمِ الرّسولؐ“

یہ کتاب اِس دور میں ایک خاص شہرت کی حامل کتاب ہے۔ یہ امام ابنِ تیمیہ کی طرف منسوب ہوتی ہے یا اس کے مصنّف امام ابنِ تیمیہ قرار دیئے گئے ہیں۔ آپ کا زمانہ 661ھ (1260یا1263ء) سے 728ھ(1327 یا1328ء) ہے۔ آپ شام کے علاقے حرّان کے رہنے والے تھے۔نام تقی الدّین ابو العبّاس احمد بن شہاب الدّین تھا۔ آپ کو اپنی صدی کا مجدّد بھی مانا گیاہے۔ اسلامی علوم پر دسترس کے لحاظ سے آپ کی کتب کو خاص مقام دیا جاتاہے۔ آپ کے فلسفے، تفقّہ علم و فضل پر علماء نے اپنی کتب میں سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ان تبصروں کے لحاظ سے آپ ایک نابغہ ٔروزگار عالم دین تھے۔الغرض دنیائے اسلام میں آپ کے علم و فضل کا چرچا ہے۔

جہاتک کتاب” الصارم المسلول......“ کا تعلق ہے،تو یہ امام ابن تیمیہ کی دیگر کتب سے کچھ الگ اسلوب رکھتی ہے۔امام ابن تیمیہ کی اپنی معروف شہرت سے یہ کتاب مطابقت نہیں رکھتی۔اس کتاب میں مذکور واقعات و استدلالات کئی جگہ قرآنِ کریم، سنّت و سیرتِ رسول ﷺ سے متصادم و مخالف ہیں۔جو ایک محبِّ رسولؐ کسی طور پر قبول نہیں کر سکتا۔اس لئے درجِ ذیل دو باتوں میں سے ایک کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ

اوّل: یہ کہ امام ابن تیمیہ کی شخصیت اگر وہی ہے جو علم و فضل کے حوالے سے معروف ہے تو یہ کتاب خود بولتی ہے کہ یہ آپ کی نہیں ہے۔ کسی نے کسی وقت آپ کی طرف منسوب کر دی ہے اور اسے پھر ایک خاص مزاج کے مکتبۂ فکر نے آپ کے ساتھ پختہ طور پر منسلک کر دیا ہے۔ چنانچہ ایسی کتابوں کے بارے میں مالکی فقہ کے عالم امام ابو العباس احمد بن عبد العزیز الہلالی المالکی المغربی اپنی کتاب "نور البصر" میں لکھتے ہیں: "وَقَدْ حَذَّرَ الْعُلَمَاءُ مِنْ تَأْلِيفٍ مَوْجُوْدَةٍ بِأَيْدِي النَّاسِ تُنْسَبُ إِلَى الْأَئِمَّةِ، وَ نِسْبَتُهَا بَاطِلَةٌ" کہ علماء نے لوگوں کو ان کے پاس موجود تالیفات سے خبر دار کیا ہے جو ائمّہ کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ (ان ائمّہ کی طرف) باطل طور پر منسوب ہیں۔ (نور البصر فی شرح خطبۃ المختصر صفحہ 130 دار یوسف بن تاشفین۔ مکتبہ امام مالکؒ)

دوم: یہ کہ اگر یہ واقعتاً امام ابن تیمیہ کی کتاب ہے تو افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ امام موصوف نے اس کتاب میں قرآن کریم اور سنّت و سیرتِ رسول ﷺ سے منافی اور ان سے متصادم استدلالات کر کے امّت کو ہلاکتوں کا راستہ دکھایا ہے۔

منصفانہ تحقیق اور قوی شواہد کی بنیاد پر ہمارا رخ پہلی بات کی طرف ہے۔ یعنی یہ کہ یہ کتاب امام ابن تیمیہ کی نہیں ہے۔ لہٰذا اس کتاب میں ہم نے امام ابن تیمیہ کی بجائے کتاب "الصارم......" میں مذکور امور پر جرح و تنقید کر کے سچائی تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔

یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ امام ابن تیمیہ متشدّد طبع کے مالک تھے۔ لیکن ہماری بحث یہ نہیں ہے کہ وہ طبیعت و مزاج کے کیسے تھے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ آیاتِ قرآنیہ، سنّت و سیرتِ رسول ﷺ اور احادیث، روایات و آثار سے ایسے استدلال جو قرآن کریم کی آیاتِ بیّنہ اور حقیقی سیرت و شمائل نبوی کے سراسر مخالف ہوں، کیونکر قبول کئے جائیں۔ ظلم و تشدّد اور کشت و خون

کیونکر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ہوں۔ چنانچہ کتاب کے مندرجات اور استدلالات کو ہدفِ جواب بنایا گیاہے۔

" الصارم المسلول....."اور اسی نوع کی دیگر کتب جن میں توہینِ رسالت کے نعرے کی آڑ میں قتل و غارت اور کشت و خون کی تعلیم دی گئی ہے، ایک خاص مکتبۂ فکر کی ترجمان ہیں۔ ان کتابوں کی پذیرائی کرنے والے وہ لوگ ہیں جو مذہب میں جبر و تشدّد اور قتل و غارت گری کے علمبردار ہیں جبکہ دیگر مسلمان ان نظریات سے متفق نہیں بلکہ شدّت سے ان کے مخالف ہیں۔ ایسی کتابیں تعلیماتِ قرآنیہ و سنّتِ نبویّہ کی رحیمانہ تعلیمات سے کلّیۃً مخالف و متصادم ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے مندرجات، ان میں پیش کردہ روایات اوران سے کئے گئے استدلالات عام علمی معیار سے گرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان میں یہ سقم بھی بکثرت موجود ہیں کہ روایات اخذ کرتے وقت ان کے استناد کے سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ نیز یہ حقیقت بھی ثابت شدہ ہے کہ وہ روایات جن پر شاتم رسولؐ کے قتل کے عقیدے کی بنیاد رکھی گئی ہے، ان کے سوتے گدلے ہیں۔ اگر کوئی روایت صحیح اور مستند ہے تو اس کے استدلالات کو خونی نظریات سے آلودہ کر دیا گیاہے۔ اس باب میں ایسی ہی حقیقتوں کو پیش کیا جارہاہے۔

یہاں قارئین کی خدمت میں یہ بھی عرض ہے کہ اس باب میں مندرج نظائر کتاب "الصارم المسلول" کے صرف پہلے جزو سے بطور نمونہ چند لئے گئے ہیں ۔ ورنہ یہ کتاب ایسی نظیروں کا طومار ہے اور اس پر تنقید سینکڑوں صفحات کی متقاضی ہے۔

جھوٹے راوی اور ''الصارم المسلول......''

کتاب ''الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسولؐ'' جو یہاں زیرِ بحث ہے، اس کا رُخ کچھ اور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں زمانے کی روَش کے زیرِ اثر استدلالات و اجتہادات ہوئے ہیں یا حالات کا کوئی ایسا دباؤ ہے کہ اس نے سوچ کے دھارے کو رسول اللہ ﷺ کی صفاتِ رحمت و کرم کی سمت بہنے نہیں دیا۔ بلکہ اس کے برعکس جا بجا خون بہانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس تبصرے کی وجہ اور بنیاد یہ ہے کہ قرآن کریم کی حَکمیّت اور سنّت و حدیثِ رسولؐ کے صحیح ریکارڈ کو چھوڑ کر بنیادی طور پر یہ کتاب بکثرت ایسی روایات پر مشتمل ہے جو مبیّنہ طور پر وضعی اور جعلی ہیں۔ چنانچہ ان روایات اور راویوں پر گزشتہ ائمہ اور علمائے فن ّنے بڑی مضبوط اور مدلّل تنقیدیں کر کے انہیں ردّ کیا ہے۔ مثلاً اس کتاب میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ اس میں بیشتر بلکہ اکثر روایات واقدی سے لی گئی ہیں اور پھر بڑے اعتماد کے ساتھ ان پر یہ رائے بھی لکھی گئی ہے کہ:

''اِنْ كَانَ الْوَاقِدِیُّ لَا يُحْتَجُّ بِهِ اِذَا انْفَرَدَ، وَلٰكِنْ لَّا رَيْبَ فِیْ عِلْمِهِ بِالْمَغَازِیِ، وَاسْتِعْلَامِ كَثِيْرٍ مِّنْ تَفَاصِيْلِهَا مِنْ جِهَّتِهِ، وَلَمْ نَذْكُرْ عَنْهُ اِلَّا مَا اَسْنَدْنَاهُ عَنْ غَيْرِهِ۔''(الصارم المسلول...... زیر عنوان'' والاستدلال بقتل کعب بن اشرف من وجہین''صفحہ 59) کہ واقدی جب تنہا روایت کرے تو اس کی روایت سے حجّت نہیں لی جا سکتی مگر اس کے ماہرِ مغازی ہونے اور اس کی تفصیلات سے آگاہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہم نے واقدی سے وہی کچھ لے کر ذکر کیا ہے جو ہم نے دوسروں سے باسند نقل کیا ہے۔

یعنی واقدی کے بارے میں بالکل درست تجزیہ کیا گیا ہے کہ اس سے حجّت نہیں لی جا سکتی مگر اس کے باوجود اس کتاب'' الصارم.....''میں اس کی روایات کو کثرت سے لیا بھی گیا

ہے۔ پھر آگے چل کر واقدی کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے: مَعَ مَا فِی الْوَاقِدِیِّ مِنَ الضُّعُفِ (الصارم..... زیر عنوان" الدّلیل السادس،قصۃ امرأۃ من خطمۃ کانت تہجو النبیؐ" صفحہ 70) کہ واقدی میں (روایت کے سلسلے میں) ضعف پایا جاتا ہے۔

کتاب الصارم المسلول کی یہ ایک بنیادی اور سنگین لغزش ہے کہ اس کی بنیاد زیادہ تر واقدی کی روایات پر استوار ہے۔ گو مذکورہ بالا اقتباس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ "ہم نے واقدی سے وہی کچھ لے کر ذکر کیا ہے جو ہم نے باسند دوسروں سے نقل کیا ہے۔" مگر یہ بیان قارئین کے لئے محض ایک طفل تسلّی کے طور پر ہے۔ کیونکہ جس روایت میں واقدی موجود ہو، چاہے اس کے ساتھ کیسی بھی سند ہو، اس کی وجہ سے اکثر و بیشتر مشکوک، کمزور اور ضعیف بلکہ جیسا کہ ائمۂ فن نے بیان کیا ہے، اکثر وضعی ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر دوسروں سے کچھ باسند لیا ہے تو پھر واقدی سے لینے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے تھی۔ مگر اصل بات یہی ہے کہ واقدی اس طرح کا وضعی اور جھوٹا مواد بکثرت مہیّا کر دیتا ہے جو اس طرح کے موضوعات کے لئے مرغوب ہے۔ علاوہ ازیں اس کی روایات کی اسناد بھی محلِّ نظر ہیں۔ ان میں بھی اکثر خود تراشیدہ ہیں۔

ہم قطعاً یہ نہیں کہتے کہ واقدی کی پیش کردہ ہر روایت ہی جھوٹی ہے۔ ہمارا دکھ یہ ہے کہ وہ روایات جو آیاتِ قرآنیہ اور سنّت و حدیثِ نبویؐ کے صحیح مجموعے سے ٹکراتی ہیں، انہیں ترک کیوں نہیں کر دیا گیا۔ واقدی ہو یا کوئی اور، جس کی بھی پیش کردہ ایسی روایات جو ہدایت کے مذکورہ بالا ان بنیادی سرچشموں سے سیراب ہوتی ہوں وہ تو درست قرار دی جاسکتی ہیں مگر جو ہر قسم کی توجیہہ اور تطبیق کی کوشش کے باوجود ان کے مخالف اور متصادم ہوں وہ بہر حال جھوٹی اور وضعی ہیں۔ انہیں ترک کرنا ضروری ہے۔ واقدی اور اس جیسے اور اصحاب نے چونکہ خود ایسی

روایات تراشی ہیں اور انہیں کئی لوگوں کی طرف منسوب کر کے کوئی سند بھی مہیّا کر دی ہے مگر وہ ہدایت کے ان حقیقی سر چشموں سے مخالف اور متصادم ہیں۔ اس لئے ائمّہ فن نے واقدی کو جھوٹا، روایات تراشنے والا اور سارق یعنی چور قرار دیا ہے۔

دوسری بنیادی اور فاش غلطی اس کتاب میں یہ ہے کہ اس میں واقدی کے ساتھ ساتھ دیگر وضّاعوں مثلاً مصنّف عبد الرّزّاق اور عکرمہ مولیٰ ابن عباسؓ کی روایات بھی بنیادی حیثیت میں شامل ہیں جو اس کتاب کی بنیادوں کو مبیّنہ طور پر کھوکھلا، استدلالات کو غلط اور اجتہادات کو بودا کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج　　　　تا ثریّا می رَوَد دیوار کج

معمار اگر عمارت میں بنیاد کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھتا ہے تو دیوار چاہے ثریّا تک بلند کر دی جائے، وہ لازماً ٹیڑھی ہی ہوگی۔ کتاب ' الصارم.....' اس شعر میں بیان شدہ حقیقت کی عملی اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ہم روایات وضع کرنے والے ان مذکورہ بالا تینوں افراد کا ذکر گزشتہ باب میں تفصیل سے کر آئے ہیں۔ ظلم یہ ہے بعض آیاتِ قرآنیہ اور روایاتِ صحیحہ کو بھی ان وضعی روایات کے تحت کر کے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ حالانکہ رُخ یہ ہونا چاہئے تھا کہ روایات اور ان پر کئے جانے والے اجتہادات کو قرآن کریم اور سنّت و حدیثِ رسولؐ کے مستند ریکارڈ کے سامنے پیش کر کے ہر روایت کی ایسی توجیہہ کی جاتی جو رسول اللہ ﷺ کی پاک سیرت، آپؐ کے عفو و درگزر، آپؐ کی وسعتِ قلبی، وسعتِ ظرفی اور کائنات سے وسیع تر دامنِ رحمت پر داغ نہ لگنے دیتی وَ اِلّا اس روایت پر آیتِ قرانیہ یا سیرت و سنّتِ رسولؐ کو حَکَم بنا کر اسے ترک کر دیا جاتا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو اس سے ایک طرف تو مسائل کا رُخ بالکل درست اور صحیح رہتا اور دوسری طرف رسول اللہ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی وہ خواہش پوری ہو جاتی کہ ’’ لوگ یہ باتیں نہ کریں کہ محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) اپنے ساتھیوں کو مرواتا ہے۔‘‘ مگر ایسی کتابوں نے یہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے کہ آپؐ نعوذ باللہ اپنے ساتھیوں کو مرواتے تھے اور بار بار مرواتے تھے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ آج اسلام کی اور رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی مسلسل توہین کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ نعوذ باللہ آپؐ کی تلوار لوگوں کو ظالمانہ طور پر کاٹتی رہی ہے اور اسلام کی تعلیم متشدّدانہ ہے۔

اگر محسن انسانیت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس سچائی کو ثابت اور پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی کہ آپؐ نہ صرف یہ کہ اپنوں کے خون اور ان کی زندگیوں کو بچاتے تھے بلکہ ظلم کرنے والوں کو بھی بقاعطا کرتے ہوئے معافی پر معافی عطا کرتے چلے جاتے تھے۔ تو ثابت یہ ہوتا کہ نسلِ انسانی میں صرف اور صرف ایک آپؐ ہی ہیں جو انسان، انسانیت اور انسانی خون کے سب سے بڑے محافظ تھے۔ پھر اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ آج دنیا کی قومیں اس عظیم، عفو و درگزر اور رحمت کے بحرِ بیکراں سے فیضیاب ہو رہی ہوتیں۔ ایسی متشدّد کتابوں نے نہ صرف دوسری قوموں کے لئے اسلام کی کشش کو سلب کر لیا ہے بلکہ مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کے دلوں میں قساوت، سینوں میں رعونت اور نظروں میں ایسی خشونت بھر دی ہے کہ دیگر مذاہب کے پیروکار اُن سے بدکتے ہیں۔ کاش وضعی، ضعیف اور کمزور روایتوں کو کتابوں میں جگہ نہ دی جاتی۔ صحیح روایات کو غلط معنے نہ پہنائے جاتے۔ آیاتِ قرآنیہ کی تفسیریں کمزور روایت کے تابع نہ کی جاتیں بلکہ ان جھوٹی اور جعلی روایات کو کلّیۃً ردّ کر دیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو لازماً ہر عہد میں ہی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی پُر رحمت و پُر نور شخصیّت اپنی پورے حسن و جمال اور خوبی و کمال سے چمک کر دنیا کے سامنے آتی۔ اسلام کا سچا، سُچّا اور حسین چہرہ ہر دَور میں ہر

ایک کے لئے مقناطیسی کشش رکھتا اوراسلام یقیناً اپنی تعداد، تعلیم، عمل اور رحمت کے لحاظ سے آج کلّی طور پر دنیاکاغالب مذہب ہوتا۔

افسوس اور ہزار افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس بنیادی کمزوری اور ناقابلِ تلافی غلطی کی وجہ سے کتاب 'الصارم.......' بجائے فائدہ مند ہونے کے اساسی طور پر ایک ضرر رساں کتاب ہے۔ جس کے مقصود اور علّتِ غائی کا قرآن کریم کی تعلیمات،رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور آپؐ کی ساری زندگی کے پاک اور پُر عفوو رحمت اسوہ سے نہ صرف دور کا بھی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ واضح طور پر ان سے متصادم ہے۔ بتکرار یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس سے اسلام کو اندرونی طور پر بھی بیحد نقصان پہنچاہے اور دشمنوں نے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنے جھوٹے حملوں کے لئے اس سے جھولیاں بھر بھر کر مواد حاصل کیاہے۔یہ وہ کڑوی حقیقت ہے جس کی گواہی ہر مخالفِ رسولؐ کی کتاب فراہم کرتی ہے۔

نقضِ عہد:

اس کتاب میں شتمِ رسولؐ کو نقضِ عہد کاذریعہ قرار دے کر شاتم کے قتل کے جواز کے طور پر پیش کیا گیاہے اوراس کے لئے متعدد آیات بھی پیش کی گئی ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ایک آیت بھی ایسی نہیں جو براہِ راست اس دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کی جاسکے۔ چنانچہ اس پوری کتاب میں ان مذکورہ آیات میں سے کسی ایک کا استدلال بھی براہِ راست پیش نہیں کیا گیا۔ایک بات کے ساتھ دوسری ملا کر پھر اس کے ساتھ ایک اور بات ملا کر پھر اس کے ساتھ ایک اور ملا کر کہیں تیسری چوتھی جگہ جاکر نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔حالانکہ شریعت کے

مسائل کا حل اس طرح نہیں ہوتا۔ چنانچہ الوجہ الرابع کے تحت زیر عنوان " سَبُّ الرَّسُوْلِ ﷺ یُوْجِبُ نَقْضَ عَهْدِ الذِّمِّيِّ" لکھاہے:

''اِنَّهُ قَالَ تَعَالیٰ(أَلاَ تُقَاتِلُونَ قَوْماً نَّكَثُواْ أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّواْ بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَؤُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ)(التوبہ: 13) فَجَعَلَ هَمَّهُمْ بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ مِنَ الْمُحَضِّضَاتِ عَلَى قِتَالِهِمْ، وَمَا ذَاكَ اِلَّا لِمَا فِيْهِ مِنَ الْاَذٰی،وَسَبُّهُ اَغْلَظُ مِنَ الْهَمِّ بِاِخْرَاجِهِ،بِدَلِيْلِ اَنَّهُ صلی اللہ علیہ وسلم عَفَا عَامَ الْفَتْحِ عَنِ الَّذِيْنَ هَمُّوْا بِاِخْرَاجِهِ، وَلَمْ يَعْفُ عَمَّنْ سَبَّهُ، فَالذِّمِّيُّ اِذَا اَظْهَرَ سَبَّهُ فَقَدْ نَكَثَ عَهْدَهُ، وَفَعَلَ مَا هُوَ اَعْظَمُ مِنَ الْهَمِّ بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ، وَبَدَأَ بِالْاَذٰی، فَيَجِبُ قِتَالُهُ۔'' (الصارم .....باب الادلّۃ علیٰ انتقاض عھد الذّمی السابّ۔ زیر عنوان "سبّ الرسول یوجب نقض عھد الذمی" صفحہ:22) کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "بھلا تم ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو جنھوں نے اپنی قَسموں کو توڑ ڈالا اور پیغمبرِ خدا کے جلا وطن کرنے کا صمّم عزم کر لیا اور انہوں نے تم سے (عہد شکنی کی) ابتدا کی۔" اس آیت میں کفّار کے رسول کریم ﷺ کو جلا وطن کرنے کے ارادے کو ان کے ساتھ جنگ کا محرّک اور موجب قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس سے آپؐ کو تکلیف پہنچتی ہے۔ مگر آپؐ کو گالی دینا جلاوطن کرنے کے ارادے سے بھی زیادہ شدید ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جن لوگوں نے آپؐ کو جلاوطن کرنے کا ارادہ کیا تھا، فتحِ مکّہ کے روز اُن کو رسول کریم ﷺ نے معاف کر دیا تھا مگر گالی دینے والوں کو معاف نہیں کیا تھا۔ بنابریں ذمّی جب آپؐ کو گالی دے گا تو اپنے عہد کو توڑ دے گا، اور وہ ایسے فعل کا مرتکب ہوگا جو آپؐ کو جلاوطن کرنے کے ارادے سے عظیم تر ہے اور چونکہ اس نے ایذا رسانی کی طرح ڈالی ہے، لہٰذا اس سے لڑنا واجب ہے۔

قارئین ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ ایک عام معاہدے کو توڑ کر جنگ کرنے والوں سے، جن کے بارے اللہ تعالیٰ نے کھول کر بتا دیا ہے کہ '' انہوں نے تم سے (عہد شکنی کی) ابتدا کی'' ان سے قتال واجب ہے۔ یہ الفاظ بغیر کسی ابہام کے یہ پیغام دے رہے ہیں کہ یہاں جنگی صورتحال کی بات ہو رہی ہے۔ قتال کا لفظ مقابلے کا مقتضی ہے۔ یعنی پہل کرتے ہوئے انہوں نے جنگ شروع کی تو تمہیں پورا پورا حق حاصل ہے کہ تم ان کے مقابلے میں ان سے جنگ کرو۔ یہ لفظ قتال کے براہِ راست معنے ہیں۔ اس صورتحال کا گالی گلوچ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ معاہدوں کو توڑ دینا(یعنی عہد شکنی) بالکل الگ چیز ہے اور شتم و تنقیص بالکل الگ۔ مگر کتاب ' الصارم.....' میں خوامخواہ دور کی کوڑی لا کر پہلے اس عہد شکنی کا گالی کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے۔ اور پھر اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گالی دینے والے کی سزا قتل ہے۔

کتاب 'الصارم.......' کے اس استدلال میں ایک بات اپنی طرف سے زائد بھی داخل کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گالی دینے والے کو معاف نہیں کیا۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ آپؐ نے ہر گالی دینے والے کو یعنی جس کا کوئی اور قومی جرم نہیں تھا یا ایسا کوئی جرم نہیں تھا جس کی سزائے قتل اللہ تعالیٰ نے حدّ کے ساتھ باندھی تھی، ہمیشہ معاف فرمایا تھا۔ یہ حقیقت ہم اس کتاب میں دلائل قویّہ سے ثابت کر چکے ہیں۔

الغرض یہ ایک مفروضہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر سبّ و شتم کرنے سے ذمیؔ کا عہد ٹوٹ جاتا ہے۔ قرآن کریم یا احادیث صحیحہ سے اس مفروضے کی کوئی بنیاد ثابت نہیں ہے۔ کسی آیتِ قرآنی سے براہِ راست ایسا کوئی استنباط نہیں ہوتا۔

بہر حال اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ گالی کا تعلق گندی سوچ یا بسا اوقات محض زبان کی گندگی سے ہے، لیکن اس کا نقضِ عہد سے کوئی تعلق نہیں۔ عہد کا توڑنا ایک

ارادے اور فیصلے کا متقاضی ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ گالی دینے والا بعض اوقات باوجود اپنے عہد پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے ہوئے بھی اپنی گندی زبان، عادت، کسی انگیخت یا کسی منفی ردّ عمل کی وجہ سے بلکہ بعض اوقات غیر شعوری طور پر گالی دے رہا ہوتا ہے۔ جس کے عقب میں اس کا عہد توڑنے کا کوئی عزم وارادہ نہیں ہوتا۔

کتاب 'الصارم......' میں شاتمِ رسولؐ کو متعدد بار ناقضِ عہد قرار دے کر اس پر قتل کا فتوٰی لگایا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ جس عہد کی یہاں بات ہو رہی ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں رہنے والا غیر مسلم اس حکومت کی اطاعت میں رہنے کا جو عہد کرتا ہے، یہاں وہ عہد مراد ہے۔ یہ عہد ملکی قوانین کی پابندی کا عہد ہے۔ ایسا عہد کرنے والے کو معاہد یا ذِمّی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کتاب ' الصارم .....' کی ابتداء ہی میں یہ اصول زیرِ بحث لایا گیا ہے کہ ذمی کا عہد کن باتوں سے ٹوٹتا ہے۔ اس پر مختلف مکتبہ ہائے فکر کے فقہاء کی آراء اور فتاویٰ وغیرہ درج کئے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض نے شتمِ رسولؐ کو نقضِ عہد کا موجب قرار دیا ہے تو بعض نے اس سے بالکل اتفاق نہیں کیا۔ ان کے فتوے اور آراء کلّیۃً اس کے مخالف ہیں۔ یعنی یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ اس مسئلہ پر اجماع نہیں ہے۔ بلکہ یہ سب مخصوص طرز کے علماء کے صرف اجتہادات یا رجحانات ہیں۔ ان سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔ یہ الگ حقیقت ہے کہ کسی آیتِ کریمہ میں یا قولِ رسولؐ و خلفائے راشدین میں یہ موجود نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والا ناقضِ عہد ہے۔

بہر حال یہ ایک تفصیلی بحث ہے جو کتاب کے پہلے باب " اِنَّ مَنْ سَبَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم مِنْ مُسْلِمٍ اَوْ کَافِرٍ فَاِنَّہٗ یَجِبُ قَتْلَہٗ" میں موجود ہے۔ (اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس نے بھی رسول اللہ ﷺ کو گالی دی، چاہے مسلمان ہو یا کافر، اس کا قتل واجب ہے) اس بحث کا تفصیلی

مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ پہلے شتمِ رسولؐ کو تکلّف اور تصنّع کے ساتھ کھینچ کھینچ کر نقضِ عہد کا موجب قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے اور پھر ناقضِ عہد کے قتل کا فتوٰی صادر کر دیا گیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس مسئلے میں بھی اور باقی امور میں بھی انہی کمزور، ضعیف اور وضعی روایات کو بنیاد بنا کر قرآن کریم اور سنّت و احادیثِ نبویہ کو اس کے مطابق ڈھالا گیا ہے۔ ہدایت کے ان بنیادی اور اصل مأخذوں کی تشریحات اُن جھوٹی اور وضعی روایات کے تحت کی گئی ہیں۔ حالانکہ ان فقیہوں اور علمائے دین کا فرض تھا کہ ہر روایت کو قرآن کریم پر پیش کر کے ان کی صداقت اور صحت کو پرکھتے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی پاک اور پُر رحمت سنّت کے مطابق ان کی جانچ پڑتال کرتے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا جس کا طبعی نتیجہ یہی نکلا کہ مثلاً نقض عہد والے مسئلے میں درجِ ذیل دونوں پہلو ہی بنیادی طور پر غلط اختیار کر لئے گئے کہ

۱: رسول اللہ ﷺ پر سبّ و شتم سے عہد ٹوٹ جاتا ہے۔

۲: عہد توڑنے کی سزا قتل ہے۔ لہٰذا سبّ و شتم کرنے والا لازماً قتل کیا جائے گا۔

جہاںتک اس بات کا تعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر سبّ و شتم سے عہد ٹوٹ جاتا ہے، تو اس سلسلے میں اگر قرآن کریم اور سنّت و احادیثِ صحیحہ سے رہنمائی طلب کی جائے تو جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ ان میں کوئی ایسی تعلیم موجود نہیں جو یہ سکھاتی ہو کہ آپؐ پر سبّ یعنی گالی سے عہد ٹوٹ جاتا ہے۔ جب تک خود عہد والا عہد نہ توڑے، وہ نہیں ٹوٹتا۔ قرآن کریم بھی تو یہی بتاتا ہے کہ عہد کرنے والا اگر از خود عہد توڑے تو عہد ٹوٹتا ہے۔ کسی دوسرے کے کہنے سے کسی کا عہد نہیں ٹوٹتا۔

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر مشتمل بنیادی کتبِ تاریخ و سِیَر میں قبائل اور قوموں کے ساتھ آپؐ کے کئے ہوئے معاہدوں میں کسی ایک معاہدے میں بھی یہ شق نہیں ملتی کہ جس میں یہ لکھا ہو کہ کوئی آپؐ کو گالی دے گا تو اس کا عہد ٹوٹ جائے گا۔ مثلاً نمونے کے طور پر ایک معاہدہ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ بھی قرار پایا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عیسائی اکابرین پر مشتمل نجران سے جو وفد آیا تھا اور اس نے آنحضرت ﷺ سے مباحثہ کیا تھا۔ اس وفد نے اس مباحثے میں لاجواب ہونے پر عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کرنے کی آپؐ کی دعوت کو تو قبول نہیں کیا تھا۔ مگر اسلام کے پُر امن نظام کو تسلیم کرتے ہوئے آپؐ کی خدمت میں عرض کی تھی کہ وہ آپؐ سے صلح کی درخواست کرتے ہیں اور جو حکم آپؐ انہیں دیں گے وہ انہیں قابلِ قبول ہو گا۔ چنانچہ آپؐ نے ان سے حسبِ ذیل معاہدے پر صلح قبول کی کہ

”وہ دو ہزار ہتھیار جن میں سے ایک ہزار ہتھیار ماہِ رجب میں اور ایک ہزار ماہِ صفر میں دینے ہوں گے، نیز اگر یمن میں کسی مقام پر جنگ ہو تو نجران کے ذمّے بطور رعایت تیس زرہیں اور تیس نیزے اور تیس اونٹ اور تیس گھوڑے ہوں گے۔ نجران اور ان کے آس پاس والوں کی جان، مال، مذہب، ملک، زمین، حاضر، غائب اور ان کی عبادت گاہوں کے لئے اللہ تعالیٰ اور محمدؐ نبی (ﷺ) کی ذمّہ داری ہے۔ نہ تو کوئی اسقف (پادری) اس کے منصب سے، نہ کوئی راہب اس کی رہبانیت سے، اور نہ کوئی کاہن اس کی کہانت سے ہٹایا جائے گا۔“

آنحضرت ﷺ نے انہیں ایک اور معاہدے پر مبنی حسبِ ذیل تحریر بھی دی جو آپؐ نے حضرت مغیرہؓ سے تحریر کروائی:

”(مِنْ مُحَمَّدِ النَّبِيِّ) لِاَسْقُفِ أَبِي الْحَارِثِ بْنِ كَعْبٍ وَ أَسَاقِفَةِ نَجْرَانَ وَكَهَنَتِهِمْ وَمَنْ تَبِعَهُمْ وَ رُهْبَانِهِمْ أَنَّ لَهُمْ عَلَى مَا تَحْتَ أَيْدِيهِمْ مِنْ قَلِيْلٍ وَّكَثِيْرٍ مِنْ بِيَعِهِمْ وَصَلَوٰتِهِمْ

وَ رَهْبَانِيَّتِهِمْ، جِوَارُ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ لَا يُغَيَّرُ أَسْقُفُ عَنْ أَسْقُفِيَّتِهِ، وَلَا رَاهِبٌ مِنْ رَهْبَانِيَّتِهِ، وَلَا كَاهِنٌ عَنْ كَهَانَتِهِ، وَلَا يُغَيَّرُ حَقٌّ مِنْ حُقُوْقِهِمْ، لَا سُلْطَانِهِمْ، وَلَا شَيْئٍ مِمَّا كَانُوْا عَلَيْهِ (مِنْ ذٰلِكَ، جِوَارُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ أَبَداً) مَا نَصَحُوْا وَأَصْلَحُوْا فِيْمَا عَلَيْهِمْ غَيْرَ مُثْقِلِيْنَ بِظُلْمٍ وَّلَا ظَالِمِيْنَ۔'' (ابن سعد ذکر وفادات وفد نجران) ترجمہ: محمّد نبی ﷺ کی طرف سے اسقف ابو حارث کے لئے اور نجران کے دیگر پادریوں، کاہنوں اور ان کے پیروکاروں اور راہبوں اور ان کے تھوڑے بہت متبعین کے لئے اور ان کے گرجوں، عبادت گاہوں وغیرہ کے لئے امان ہے۔ ان کے پادریوں میں سے کسی کو اس کے منصب سے، ان کے راہبوں میں سے کسی راہب کو اس کی رہبانیّت سے اور ان کے کاہنوں میں سے کسی کاہن کو اس کی کہانت سے ہرگز برطرف نہیں کیا جائے گا۔ انہیں ان کے حقوق اور ان کے اختیارات سے جن پر وہ قائم ہیں، ہٹایا نہیں جائے گا۔ جب تک وہ خیر خواہ اور صلح جُو رہیں گے یا ظالموں کے ساتھ ظلم ڈھانے والے نہ ہوں گے ، انہیں ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی پناہ حاصل رہے گی۔

اس خط کے مندرجات، طبقات ابن سعد باب 'ذکر بعثۃ رسول اللہ ﷺ الرسل بکتبہ الی الملوک یدعوھم الی الاسلام' سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اس میں دو فقرے جو بریکٹ میں ہیں 'ابن کثیر کتاب الوفود وفد نجران' سے بھی شامل کئے گئے ہیں تاکہ آپؐ کے فرمودات ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں اور قاری اس جامع فرمان کو ایک ہی جگہ ملاحظہ کر سکے۔

اس مذکورہ بالا معاہدے کو یا کسی بھی قوم و قبیلے سے کئے گئے کسی بھی معاہدے کو دیکھ لیں، اس میں آپ کو ایسی کوئی شق نہیں ملے گی جو یہ بتاتی ہو کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے سے کسی معاہد یا ذمی کا عہد ٹوٹ جائے گا۔ ہاں خیر خواہ، صلح جُو رہنے اور ظالموں کا ساتھ نہ دینے کی شرائط موجود ہیں۔ ان شرائط کے علاوہ تو رسول اللہ ﷺ نے گالی اور توہین و تنقیص وغیرہ کی

کوئی شرط نہیں رکھی۔ اگر یہ ایسا اہم مسئلہ تھا تو معاہدات میں یہ شق نمایاں طور پر درج ہونی چاہیئے تھی۔ پس فقہاء میں سے کسی کا اگر ایسا اجتہاد یا استدلال ہے جو کسی وقتی ضرورت کے تحت کیا گیا تھا تو یہ محض اس کا اپنا وقتی استدلال یا اجتہاد تھا اور اس کی حیثیت صرف وقتی ہی تھی اور اسی علاقے تک محدود تھی جہاں یہ ضرورت پیدا ہوئی تھی۔ اس کا شریعتِ اسلامیہ کے مستقل قوانین اور عقائد سے ہرگز کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح قرآن کریم اور سنّتِ رسولؐ اور احادیث صحیحہ میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے کہ کبھی کسی کے گالی دینے سے کسی پر نقضِ عہد کی فرد عائد کی گئی ہو۔ نیز آنحضرت ﷺ نے کبھی بھی اس وجہ سے کسی کو ناقضِ عہد قرار دے کر قتل نہیں کرایا۔ آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی ایسا نہیں کیا۔ احادیثِ صحیحہ کے مطابق تو نہ صرف یہ کہ آپؐ نے کبھی ایسا حکم نہیں دیا بلکہ اس کے برعکس جب بھی کوئی آپؐ کی توہین کا مرتکب ہوا اور صحابہؓ نے اسے سزا دینے کے لئے آپؐ سے اجازت طلب کی تو بھی آپؐ نے قطعاً ایسی اجازت نہیں دی۔ ایسے واقعات ایک سے زائد دفعہ ہوئے اور وہ احادیثِ صحیحہ میں محفوظ ہیں۔ لہٰذا آپؐ کے اس طرزِ عمل، فیصلوں اور مستقل سنّت کے برعکس ایسا استدلال ہرگز درست قرار نہیں پا سکتا۔ الغرض کتاب 'الصارم.....' میں یہ جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ پر سبّ و شتم سے عہد ٹوٹ جاتا ہے۔" ایک ایسا خود ساختہ اور بے بنیاد دعویٰ ہے جو قرآن کریم کے احکام، آپؐ کی سنّت، واضح ہدایات اور مسلسل عمل سے ہرگز تائید یافتہ نہیں۔

دوسری بات جو کی گئی ہے کہ "عہد توڑنے کی سزا قتل ہے۔" اور اس کا نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ "سبّ و شتم کرنے والا لازماً قتل کیا جائے گا۔" اس کے ثبوت کے لئے سورۃ التوبہ کی چند ابتدائی آیات پیش کر کے استدلال کیا گیا ہے۔

جہاں تک ان آیات کا تعلق ہے، تو ان کا پس منظر یہ ہے کہ فتح مکّہ کے بعد ایک سال سے کچھ زائد عرصہ گزرنے پر جب حج کا مہینہ آیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو پہلے اسلامی حج کی ادائیگی کے لئے امیر الحجّاج مقرر فرمایا۔ آپؓ ذوالقعدہ 9ھ میں بمطابق مارچ 631ء مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اس حج میں سنّتِ ابراہیمی کے مطابق یعنی اسلامی رنگ میں مناسکِ حج کا قیام ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ کی انہی آیات میں اسے الحجّ الاکبر کا نام بھی دیا۔ حضرت ابو بکرؓ ابھی مدینہ سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ آنحضرت ﷺ پر سورۃ التوبہ کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں مشرکوں سے برأت یعنی الزام سے آزاد ہونے نیز چار ماہ کی مہلت کا ذکر ہے کہ وہ اس عرصے میں بے شک سارے عرب میں گھوم پھر کر دیکھ لیں اور پھر اسلامی حکومت سے کسی معاہدے میں داخل ہوں۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو فوراً اپنی اونٹنی القصواء دے کر پیچھے روانہ فرمایا اور حکم فرمایا کہ یہ آیات وہ لوگوں کو خود پڑھ کر سنائیں۔ قافلۂ حج ابھی العرجؔ کے مقام پر پہنچا تھا کہ حضرت علیؓ حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ حضرت علیؓ نے آپؓ کو بتایا کہ آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناؤں۔ (زرقانی، ابن اثیر، ابن کثیر، ابن سعد، ابن ہشام حجۃ ابی بکر الصدیق ؓ ......)

یہ قافلہ مکّے پہنچ کر مناسکِ حج کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرفہ کے روز خطبہ ارشاد فرمایا اور مناسکِ حج کی تعلیم دی اور مسائلِ حج بیان فرمائے۔ آپؓ کے بعد حضرت علیؓ نے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں سورۃ التوبہ کی مذکورہ بالا آیات پڑھیں۔ لکھا ہے کہ آپؓ نے سورۃ التوبہ کی ابتدائی چالیس آیات تلاوت کیں۔ اس کے بعد ہر ایک عہد والے کو اس کا عہد واپس کیا اور مشرکوں کو جو مسلمان ہونا نہیں چاہتے تھے، ان آیات میں

مذکور چار ماہ کی مہلت دی کہ اگر وہ اس مدّت میں کسی معاہدے میں منسلک ہو کر اسلامی سلطنت کا جزو نہ بنیں گے تو پھر اس کے بعد اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر کسی قسم کا کوئی الزام نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ برأت تھی جو سورۃ التوبہ میں پیش کی گئی ہے۔اس پیغام میں چار ماہ کی مدّت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سفر کرنے والا اس عرصے میں پورے خطّہ عرب میں گھوم پھر کر جائزہ لے کر فیصلہ کر سکتا ہے اور نیا معاہدہ کر سکتا ہے۔ حضرت علیؓ نے مزید یہ بھی فرمایا:

''وَمَنْ كَانَ لَهُ عَهْدٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَهُوَاِلٰی مُدَّتِهٖ'' (زادالمعاد، فصل فی حجۃ ابی بکر الصدیقؓ..... ۔) کہ جس شخص کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کوئی عہد ہو گا وہ اس کی مدّت تک اس کے ساتھ رہے گا۔

یہ اعلان خطّہ عرب میں امن و سلامتی کے عہد و پیمان کا ایک واضح اعلان اور انتظام تھا۔ مشرکین نے حضرت علیؓ سے کہا کہ ہم تمہارے اور تمہارے چچازاد کے عہد سے بری ہوتے ہیں، سوائے جنگ و حرب کے عہد کے۔ پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ ان میں سے بعض کہنے لگے کہ جب قریش ہی مسلمان ہو چکے ہیں تو تم کر بھی کیا سکتے ہو؟ چنانچہ اس موقع پر بہت سے مشرک بھی مسلمان ہو گئے۔ (طبری و ابن اثیر 9ھ)

سورۃ التوبہ کی جو آیات کتاب 'الصارم.....' میں اپنے مدّعا کے لئے لکھی گئی ہیں، ان درجِ ذیل آیات میں سے آیات 13، 12، 8، 7 اور 14 ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ o فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ o وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ

وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الأَكْبَرِ أَنَّ اللّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُواْ أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّهِ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ o إِلاَّ الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئاً وَلَمْ يُظَاهِرُواْ عَلَيْكُمْ أَحَداً فَأَتِمُّواْ إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ o فَإِذَا انسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُواْ الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُواْ لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ فَخَلُّواْ سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ o وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلاَمَ اللّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لاَّ يَعْلَمُونَ o كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِندَ اللّهِ وَعِندَ رَسُولِهِ إِلاَّ الَّذِينَ عَاهَدتُّمْ عِندَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَمَا اسْتَقَامُواْ لَكُمْ فَاسْتَقِيمُواْ لَهُمْ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ o كَيْفَ وَإِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لاَ يَرْقُبُواْ فِيكُمْ إِلاًّ وَلاَ ذِمَّةً يُرْضُونَكُم بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبَى قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُون o اشْتَرَوْاْ بِآيَاتِ اللّهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَصَدُّواْ عَن سَبِيلِهِ إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُون o لاَ يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلاًّ وَلاَ ذِمَّةً وَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُونَ o فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَنُفَصِّلُ الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ o وَإِن نَّكَثُواْ أَيْمَانَهُم مِّن بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُواْ فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُواْ أَئِمَّةَ الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لاَ أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنتَهُونَ o أَلاَ تُقَاتِلُونَ قَوْماً نَّكَثُواْ أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّواْ بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَؤُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤُمِنِينَ o قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ o وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ وَيَتُوبُ اللّهُ عَلَى مَن يَشَاءُ وَاللّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (التوبۃ:1 تا 15) ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بیزاری (کا پیغام بھیجا جارہا) ہے اُن مشرکین کی طرف جن سے تم نے معاہدہ کیا

ہے۔ پس چار مہینے تک تم زمین میں خوب چلو پھرو اور جان لو کہ تم اللہ کو ہرگز عاجز نہیں کر سکو گے اور یہ کہ یقیناً اللہ کافروں کو رُسوا کر دے گا۔ اور حجِ اکبر کے دن سب لوگوں کے سامنے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ عام کیا جاتا ہے کہ اللہ مشرکین سے کلّیۃً بیزار ہے اور اس کا رسولؐ بھی۔ پس اگر تم توبہ کر لو تو وہ تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم پھر جاؤ تو جان لو کہ تم ہرگز اللہ کو عاجز نہیں کر سکو گے۔ پس وہ لوگ جو کافر ہوئے انہیں ایک دردناک عذاب کی خوشخبری دے دے۔ سوائے مشرکین میں سے ایسے لوگوں کے جن کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے تم سے کوئی عہد شکنی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی اور کی مدد بھی نہیں کی۔ پس تم اُن کے ساتھ معاہدے کو طے کردہ مدّت تک پورا کرو۔ یقیناً اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ پس جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو جہاں بھی تم (عہد شکن) مشرکوں کو پاؤ تو اُن سے لڑو اور انہیں پکڑو اور ان کا محاصرہ کرو اور ہر کمین گاہ پر اُن کی گھات میں بیٹھو۔ پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ اور مشرکوں میں سے اگر کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دے یہاں تک کہ وہ کلام الٰہی سن لے پھر اسے اس کی محفوظ جگہ تک پہنچا دے۔ یہ (رعایت) اس لئے ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہیں جو علم نہیں رکھتے۔ مشرکین کا عہد، سوائے ان کے جن سے تم نے مسجدِ حرام میں عہد لیا، اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کیسے درست شمار ہو سکتا ہے۔ پس جب تک وہ تمہارے مفاد میں (عہد پر) قائم رہیں تم بھی ان کے مفاد میں قائم رہو۔ یقیناً اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ کیسے (ان کا عہد قابلِ اعتماد) ہو سکتا ہے جبکہ حال یہ ہے کہ اگر وہ تم پر غالب آجائیں تو تمہارے متعلق نہ کوئی عہد خاطر میں لاتے ہیں اور نہ کوئی ذمہ داری۔ (بس) وہ تمہیں اپنے منہ کی باتوں سے خوش کر دیتے ہیں جبکہ ان کے دل منکر ہوتے ہیں اور ان میں سے اکثر بدکردار لوگ ہیں۔ انہوں نے اللہ کی آیات کے بدلے حقیر قیمت قبول کر لی۔ پس اس کی راہ سے روکا۔ یقیناً بہت برا

ہے جو وہ کرتے ہیں۔ وہ کسی مومن کے معاملہ میں نہ کسی عہد کا پاس کرتے ہیں اور نہ کسی ذمہ داری کا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو حد سے گزرنے والے ہیں۔ پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ دین میں تمہارے بھائی ہیں۔ اور ہم ایسے لوگوں کی خاطر نشانات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنے عہد کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعن کریں تو کفر کے سرغنوں سے لڑائی کرو۔ یقیناً وہ ایسے ہیں کہ ان کی قسموں کی کوئی حیثیت نہیں (پس اُن سے لڑائی کرو۔ اس طرح) ہو سکتا ہے کہ وہ باز آجائیں۔ کیا تم ایسی قوم سے لڑائی نہیں کروگے جو اپنی قسمیں توڑ بیٹھے ہوں اور رسول کو (وطن سے) نکال دینے کا تہیہ کئے ہوئے ہوں اور وہی ہیں جنہوں نے پہلے پہل تم پر (زیادتی کا) آغاز کیا۔ کیا تم ان سے ڈر جاؤ گے جبکہ اللہ زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ ان سے لڑائی کرو۔ اللہ انہیں تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے گا اور انہیں رسوا کر دے گا اور تمہیں ان کے خلاف نصرت عطا کرے گا اور مومن قوم کے سینوں کو شفاء بخشے گا۔ اور ان کے دلوں کا غصّہ دور کر دے گا۔ اور اللہ جس پر چاہے توبہ قبول کرتے ہوئے جھکتا ہے اور اللہ بہت جاننے والا (اور) بہت حکمت والا ہے۔“

بالکل واضح ہے کہ ان آیات میں مشرکوں کے ساتھ ایسے عہد کا ذکر ہے جو اسلام میں داخلے کا عہد یعنی عہدِ بیعت نہیں ہے بلکہ یہ اسلامی سلطنت میں اس کے قوانین کی پابندی کا عہد ہے۔ مذہب میں داخلے کے لئے چار مہینے ملک میں پھرنے کی شرط نہیں ہوتی۔ اس کے لئے مطالعے، تحقیق، دعاؤں اور رجوع الی اللہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جبکہ ملک میں امن و امان کا عہد کرنے کے لئے اردگرد اور دوسرے قبائل اور شہروں کے حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی

ہے۔ لہٰذا انہی آیات میں اسی مذکورہ بالا عہد توڑنے کے بعد بغاوت اور جنگ کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ایسا عہد تو ہر شخص خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی ملک کا شہری ہی کیوں نہ ہو، اپنی حکومت سے کرتا ہے۔ یہ عہد اسلام میں داخلے سے بالکل مختلف عہد ہے۔ ایسے عہد کے توڑنے کو مذہب اور دین سے نکلنے سے تعبیر کرنا قیاس مع الفارق ہے اور ایک سیدھے سادے مسئلے کو خلطِ مبحث کر کے الجھانے کی کوشش ہے۔ یہاں کتاب 'الصارم' میں اس پہلو سے بھی غلطی ہوئی ہے۔ ملکی قوانین کی پابندی والے عہد کو عہدِ بیعت یا عہدِ اسلام سے بدل کر ناحق طور پر قتل وخون والے نتائج نکالے گئے ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق نہ ملکی عہد توڑنے والے کو قتل کیا جاتا ہے نہ عہدِ بیعت توڑ کر مرتد ہونے والے کو قتل کیا جاتا ہے۔ یہ دونوں قضیئے ہی غلط ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات صورتحال کی سنگینی کے تحت بغاوت یا محاربت کرنے والے کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ اسے ہر حال میں لازماً قتل کیا جائے۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ حالات کے مطابق اسے درگزر یا شہر یا ملک بدر بھی کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال اس ملکی عہد کے توڑنے سے کسی کا قتل واجب نہیں ہوتا جب تک کہ وہ بغاوت یا محاربت کر کے فساد نہ برپا کرے۔ چنانچہ اس کی بڑی مثال مسیلمہ اور اسود عنسی کی ہے کہ انہوں نے جنگ کی اور مبیّنہ طور پر اسی میں قتل ہوئے۔ یہ تو وہ تھے جو نقضِ عہد کر کے محاربت میں ملوّث ہوئے اور جنگ کے دوران قتل ہو گئے۔ لیکن ایک تیسرا بھی تھا جس کا نام طلیحہ الاسدی تھا۔ اس نے جنگ میں اپنی شکست دیکھی تو اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو گیا اور شام روانہ ہو گیا۔ (طبری السنۃ الحادیۃ عشرۃ ذکر بقیۃ الخبر عن غطفان.... أمر طلیحۃ و ابن اثیر ذکر خبر طلیحہ الاسدی)

بعد ازاں ایک مرتبہ طلیحہ عمرے کی غرض سے شام سے مکّے آیا۔ جب راستے میں مدینے کے پاس سے گزرا تو لوگوں کو علم ہو گیا کہ وہ طلیحہ ہے۔ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں اس کی اطلاع دی تو آپؓ نے فرمایا کہ "اس سے صرفِ نظر کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہدایت دے دی ہے اور وہ اسلام قبول کر چکا ہے۔"

ایک روایت کے مطابق طلیحہ نے حضرت عمرؓ کے عہد میں اسلام قبول کیا تھا اور پھر جنگِ قادسیہ اور جنگِ نہاوند میں بھی شامل ہوا تھا۔ (ایضاً و اسد الغابہ و الاصابہ: طلیحہ بن خویلد)

باوجود اس کے کہ وہ کھلا کھلا محارب تھا اور کئی صحابہؓ کی شہادت کا موجب بھی بنا تھا۔ محاربت اور قصاص دونوں جرموں کی وجہ سے اس کے قتل کا کافی جواز موجود تھا مگر اسے درگزر کیا گیا اور قتل نہیں کیا گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں میں سے جن کے قتل کے حکم صادر فرمائے تھے، ہر ایک کو جو آپؐ کے پاس عفو و درگزر کی درخواست لے کر آیا، معاف کر دیا تھا۔ بعینہٖ حضرت ابو بکرؓ نے بھی طلیحہ سے عفو و درگزر کا سلوک فرمایا۔ آپؓ نے یہاں نہ نقضِ عہد کی کوئی سزا دی اور نہ ہی فردِ محاربت عائد کر کے اسے قتل کیا۔

یہاں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ حضرت ابو بکرؓ نے اسے اس لئے قتل نہ کیا تھا کہ وہ دوبارہ اسلام قبول کر چکا تھا۔ کیونکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنی بغاوت اور محاربت میں شکست کے بعد اپنے اسلام کا کوئی اظہار نہ کیا تھا۔ اس لئے اس محارب اور ناقضِ عہد کی سزا اگر قتل تھی تو اس کے عمرے پر آنے سے پہلے ہی اس کا تعاقب کر کے اسے قتل کیا جانا ضروری تھا۔ مگر حضرت ابو بکرؓ نے اس کے فرار پر اس سے صرفِ نظر کیا اور اس کا تعاقب کر کے اسے قتل نہ کیا۔ پھر

اسے لوگوں سے بچانے کے لئے آپؐ نے گویا خود اس کی حفاظت قائم کر دی۔ یہاں تک کہ وہ مسلمان ہو گیا۔

یہ بھی مدّ نظر رکھنا ضروری ہے کہ محاربت یا نقضِ عہد کا تعلق کسی کے مذہب سے نہیں ہے بلکہ حکومت سے متعلق ہے۔ یعنی اگر ایک مسلمان بھی اسلامی حکومت سے محاربت کرتا ہے اور اس کے قوانین کے عہد کو توڑتا ہے تو وہ ویسی ہی سزا کا مستحق ہوتا ہے جیسی کا غیر مسلم۔ نیز ہر قانون کے توڑنے پر سزا اس کے مطابق ہوتی ہے۔

یہاں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عہد توڑنے والوں سے قتال کا حکم نہیں دیا بلکہ صرف ائمّۃ الکفر سے قتال کا حکم دیا ہے یعنی باقی سب کی بقا کو مدّ نظر رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اِکّادُکّا فتنہ پرداز سرغنوں کے قتل سے عامّۃ الناس جو تعداد میں کثرت میں ہوتے ہیں، محفوظ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی اپنے سرغنوں کے ساتھ نقضِ عہد کے مرتکب ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کے قتل کا حکم نہیں ہے۔ عوام کو اکسانے والے اور فتنے بھڑکانے والے صرف ائمّۃ الکفر سے قتال کا حکم ہے۔

بے ربط اور الٹا استدلال:

الصارم..... صفحہ 28 زیرِ عنوان 'فصل، اَلْاَدِلَّۃُ مِنَ الْقُرْآنِ الدَّالَّۃِ عَلَی کُفْرِ الشَّاتِمِ وَقَتْلِہٖ' پر سورۃ المجادلہ کی آیت 22 ''لَا تَجِدُ قَوْماً یُؤْمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ یُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ'' کے شانِ نزول کی بابت لکھا ہے کہ ''اِنَّ مِنْ سَبَبِ نُزُوْلِھَا اَنَّ اَبَا قَحَافَۃَ شَتَمَ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَاَرَادَ قَتْلَہٗ وَاَنَّ ابْنَ اُبَیّ تَنَقَّصَ النَّبِیَّ فَاسْتَاذَنَ ابْنُہُ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم فِی قَتْلِہٖ لِذٰلِكَ۔ فَثَبَتَ اَنَّ الْمُحَادَّ کَافِرٌ حَلَالُ الدَّمِ'' کہ اس آیت کا سبب نزول یہ ہے کہ ابو قحافہ

(حضرت ابو بکرؓ کے والد) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی تو آپؓ نے ان کو قتل کرنا چاہا۔ اور عبد اللہ ابن ابیّ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کی تو اس وجہ سے اس کے بیٹے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ ان دو واقعات کو پیش کر کے الصارم المسلول میں ساتھ ہی یہ استدلال کیا گیا ہے۔ " فَثَبَتَ اَنَّ الْمُحَادَّ کَافِرٌ حَلَالُ الدَّمِ " کہ اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرنے والے کا خون مباح ہے۔ یعنی اسے قتل کرنا جائز ہے۔

ذرا ان دونوں واقعات پر غور تو کریں کہ اگر معاملہ دونوں کی اجازت تک محدود رہتا تو شاید یہ نتیجہ نکل سکتا تھا کہ گالی دینے والے کی یا توہین و تنقیص کرنے والے کی سزا قتل ہے۔ مگر جب یہ معلوم ہو جائے کہ در حقیقت ان دونوں مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں شخصوں کو اپنے باپوں کو قتل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دی اور وہ دونوں شاتم کبھی بھی قتل نہیں کیئے گئے۔ پھر اس سے یہ استدلال کرنا کہ شاتم رسولؐ کو قتل کیا جائے گا، محض ایک دھونس ہے۔ یہ استدلال کسی زاویئے سے بھی جائز ہے نہ درست۔

ہاں اس کے برعکس ان دونوں واقعات سے یہ ضرور صاف اور واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ سبّ و شتم کرنے والا قتل نہیں کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ مگر یہاں استدلال اس قولِ رسولؐ سے بالکل مخالف کیا گیا ہے۔ نہ اس آیت میں قتل کی کوئی بات بیان ہوئی ہے اور نہ ان واقعات میں جو اس آیت کا سبب نزول بتائے گئے ہیں ان میں قتل کی ترغیب دی گئی ہے۔ بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ دونوں ہی واقعات میں قتل سے واضح طور پر روکا گیا ہے۔ پس یہ استدلال کسی بھی پہلو سے قابلِ قبول نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ابو قحافہ نے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کی تھی تو وہ لازماً ہجرت سے پہلے ہی کی ہو گی۔ کیونکہ فتح مکّہ کے موقعے پر تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ جبکہ

عبد اللہ بن ابیّ بن سلول کی طرف سے کی گئی توہین والا واقعہ غزوہ بنی مصطلق کے وقت 5ھ کا ہے۔ یعنی ان دونوں واقعات میں کئی سالوں کا فرق ہے۔ پھر کس طرح ان دونوں واقعات کے موقعوں پر اس آیت کا نزول ہو سکتا ہے؟ پس اس آیت کا شان نزول یہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بے ترتیب اور وضعی کہانی:

الصارم میں کعب بن اشرف کی ہجو گوئی اور اس کے جواب میں حضرت حسّان بن ثابتؓ کی ہجو کے ذکر میں لکھا ہے :

"کعب مکّے آیا تو اس نے اپنا سامان ابو وداعہ بن ابی صبیرہ سہمی کے پاس رکھ دیا۔ اس کی بیوی عاتکہ بنت اسید بن ابی العیص تھی۔ اس نے (جنگِ بدر میں مرنے والے) قریش کے مرثیہ پر اشعار کہے۔ نیز حسّانؓ نے اس کے جواب میں وہ اشعار سنائے جن میں آپؐ نے ان اہلِ خانہ کی ہجو کی تھی جن کے ہاں وہ قیام پذیر تھا۔ جب عاتکہ کو حضرت حسّانؓ کی ہجو گوئی کی خبر پہنچی تو اس نے کعب کا سامان باہر پھینک دیا اور کہا: "اس یہودی سے ہمیں کیا سروکار؟ تم دیکھتے نہیں کہ حسّان ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے؟ یعنی ہماری ہجو کر کے ہمیں بے عزت کرتا ہے۔" چنانچہ کعب وہاں سے چلا گیا۔ "كُلَّمَا تَحَوَّلَ عِنْدَ قَوْمٍ دَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم حَسَّانًا، فَقَالَ: اِبْنُ الْاَشْرَفِ نَزَلَ عَلَى فُلَانٍ، فَلَا يَزَالُ يَهْجُوْهُمْ حَتّٰى نَبَذَ رَحْلَهُ، فَلَمَّا لَمْ يَجِدْ مَأْوَى قَدِمَ مَدِيْنَةَ۔" کہ وہ جب کسی کے پاس قیام کرتا تو رسول اللہ احسّانؓ کو بلاتے اور فرماتے کہ کعب فلاں شخص کے پاس ٹھہرا ہوا ہے۔ حضرت حسّان اس کی ہجو کہتے اور وہ کعب کا سامان باہر پھینک دیتا۔ پس جب اسے کہیں ٹھکانہ نہ ملا تو وہ مدینے لوٹ آیا۔" (الصارم المسلول "والاستدلال بقتل کعب بن الاشرف من وجهين" صفحہ 59:)

اس عبارت پر ایک ادنیٰ سے غور سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ من گھڑت کہانی ہے۔ کیونکہ اس کہانی کا منظر یہ ہے کہ کعب بن اشرف مکّے میں پھر رہا ہے اور اسے لوگ گھر سے نکال رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ مدینے میں ہیں مگر جب کعب کسی دوسرے گھر میں جاتا ہے تو آپؐ کو دو سو سے زائد میل دور مدینے میں اسی وقت اس کا علم ہو جاتا ہے۔ آپؐ حضرت حسّانؓ کو بلاتے ہیں۔ وہ آپؐ کے ارشاد پر اس گھر والے کی ہجو کرتے ہیں جس میں کعب ٹھہرتا ہے تو مکّے میں بیٹھا وہ شخص حضرت حسّان کی ہجو سن لیتا ہے اور کعب کو گھر سے نکال دیتا ہے۔ اور یہ کھیل مسلسل ہوتا چلا جاتا ہے حتّٰی کہ کعب بے عزت ہو کر اور تنگ آ کر واپس مدینے چلا آتا ہے۔

یہاں یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود رسول اللہ ﷺ کو مدینے میں خبر دے دیتا تھا کہ کعب مکّے میں کس کے گھر مہمان ہو رہا ہے۔ مگر مدینے میں بیٹھے بیٹھے ہر بار آپؐ کا حضرت حسّان کو بلانا اور ان کا کعب کے ساتھ اس گھر والوں کی ہجو کہنا اور اس ہجو کا آناً فاناً مکّے پہنچ جانا اور میزبانوں کا اس ہجو کو سن لینا اور اس کے نتیجے میں کعب کو گھر سے نکال دینا، محض اور محض ایک گپ ہے۔ ایک دیومالائی کہانی ہے۔ اسے کسی طرح بھی ایک سچ اور حقیقت کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کجا یہ کہ اس پر کسی عقیدے یا قانون کی بنیاد رکھی جائے۔ جو ایسی من گھڑت کہانیوں کو دین کے مسائل کی بنیاد بناتے ہیں، وہ دراصل دین کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون

قتل کی وجہ، لسانی ایذاء!!!

پھر کعب کے معاملے میں الصارم.....' کے اگلے صفحے 60 پر ''اِنَّ قَتْلَ ابْنَ الْاَشْرَفِ کَانَ بِسَبَبِ کَثْرَۃِ ذُنُوْبِہٖ'' کے عنوان کے تحت بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کعب بن اشرف کا

جرم صرف یہ تھا کہ وہ لسانی ایذا کا موجب ہوا تھا.....۔اس نے کوئی ایسا کام نہ کیا تھا جس کا تعلق حرب و پیکار سے ہو۔ پھر مکرّر لکھا ہے کہ کعب بن اشرفؔ سے صرف ایذاء باللسان کا جرم صادر ہوا تھا۔ اس سے مطلب یہ ہے کہ مشرکین کو جنگ و حرب کے لئے ابھارنا زبان سے تھا۔ عملاً اس نے لڑائی وغیرہ کا کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔

کتاب الصارم..... میں قریش مکہ کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کے لئے انگیخت کرنے کی صحیح روایات اور اور مستند تاریخی حقائق کو گو ایسی باتوں کے ذریعے چھپانے کی حتّی الامکان کوشش کی گئی ہے مگر پھر بھی یہ حقیقت بیان ہو ہی گئی ہے کہ وہ کفّار کو ابھارتا تھا۔ کعب کے جرموں کی فہرست میں لکھا ہے۔" وَ حَضَّهُمْ عَلَى مَحَارَبَةِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَ وَاطَأَهُمْ عَلَى ذٰلِكَ" (الصارم المسلول:60) کہ وہ ان (قریش مکہ) کو نبی کریم اسے جنگ کے لئے ابھارتا تھا اور ان کی پشت پناہی کرتا تھا۔ اگلے صفحہ پر پھر " تَحْضِيْضُهُ" بھی لکھا ہے۔یعنی اس کا (آنحضرت ﷺ کے خلاف) جنگ کے لئے ابھارنا۔

اس پہلو سے کتاب کے اندر ہی نفسِ مضمون کے لحاظ سے ایک واضح ابہام، الجھاؤ کے ساتھ تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ اوّل تو یہ کہ محاربت کے لئے انگیخت کرنا کوئی گالی گلوچ یا لسانی ایذاء دہی نہیں ہے بلکہ باقاعدہ اعلانِ جنگ ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی کو جنگ کے لئے اکسانا یا جنگ کے لئے سازش تیار کرنا، زبان ہی کے کام ہیں۔ سازشیں زبانوں سے ہی بیان ہوتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ پھر جن کی بنیاد پر باقاعدہ لڑائیاں اور جنگیں ہوتی ہیں۔ قوانینِ دنیا میں ایسی کارروائیاں عملاً جنگ میں اترنا اور اس کا کھلا کھلا اعلان قرار پاتی ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ اشعار میں ہو یا نثر میں، ایسی کارروائی ہر پہلو سے محاربت ہی کہلاتی ہے۔ خصوصاً اُس زمانے میں آج کی طرح تو لکھت پڑھت نہیں تھی۔ اس زمانے میں تو سب کچھ زبان سے یعنی نظم یا نثر میں ہی ہوتا تھا۔

اگر بات صرف ہجو کی تھی تو یہ عام فہم بات ہے کہ کعب کو محض اشعار میں آنحضرت ﷺ کی ہجو کرنے کے لئے دو سو میل سے زائد سفر کر کے مکے جانے کی تو ضرورت ہی کوئی نہیں تھی۔ صرف لفظی یا لسانی ایذاء دہی کے لئے طویل سفر کی اتنی مشقت اٹھانا، کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کام تو مدینے میں بھی ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر جبکہ رسول اللہ ﷺ مدینے میں تھے تو ہجو بھی مدینے میں ہی موئثر تھی، نہ کہ سینکڑوں میل دور اور وہ بھی ان لوگوں کے پاس جا کر جو پہلے سے ہی آپؐ کے دشمن تھے اورآپؐ کے خلاف ایک دوسرے سے بڑھ کر ہجو گو تھے اور وہ تعداد میں بھی کثرت سے تھے۔ اصل بات وہی تھی جس پر 'الصارم ......' میں پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ درحقیقت ایک بڑی سازش کا تانا بانا بننے کے لئے مکّے گیا تھا۔ اس کا مقصد قریش مکہ اور دیگر قبائل کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر اکسانا اور آپؐ کے قتل پر آمادہ کرنا تھا۔ یہی تاریخی طور پر ثابت شدہ حقیقت بھی ہے۔

سُنَینہ یہودی کا قتل:

''جس یہودی پر تم قابو پاؤ اُسے قتل کر دو۔'' (الصارم ''زیر عنوان، بین محمد بن مسلمۃ و ابن یامین عند معاویۃ'' صفحہ:86)

کعب بن اشرف کے واقعے کے ذکر کے بعد ابن ہشام نے یہ روایت نقل کی ہے کہ کعب کے قتل کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابہؓ سے یہ ارشاد فرمایا تھا: ''مَنْ ظَفِرْتُمْ بِهِ مِنْ رِجَالِ يَهُودَ فَاقْتُلُوهُ'' کہ اب جس یہودی پر تم قابو پاؤ اُسے قتل کر دو۔ چنانچہ مُحَیِّصَہ نامی ایک صحابی نے ایک یہودی پر حملہ کر کے قتل کر دیا تھا۔ یہ روایت ابو داؤدؒ (سنن ابی داؤد کتاب الخراج) نے بھی درج کی ہے اوران دونوں روایتوں کا منبع ابن اسحاق ہے۔

علمِ روایت کی رُو سے یہ کمزور اور ناقابل اعتماد روایت ہے۔ کیونکہ ابن ہشام نے تو اسے بغیر کسی قسم کی سند کے لکھا ہے اور ابو داؤد نے جو سند دی ہے وہ اس وجہ سے کمزور اور ناقص ہے کہ اس سند میں ابن اسحاق یہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ واقعہ زید بن ثابت کے ایک آزاد کردہ غلام سے سنا تھا اور اس نامعلوم الاسم غلام نے محیّصہ کی ایک بیٹی سے سنا تھا (اس لڑکی کا نام بھی معلوم نہیں ہے) اور اس لڑکی نے اپنے باپ سے سنا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اصول کی بات ہے کہ اس قسم کی روایت جس کے راوی بالکل نامعلوم الاسم اور مجہول الحال ہوں درجہ ٔ استناد سے گر جاتی ہے اور قابل قبول نہیں رہتی۔ سوائے اس کے کہ وہ قرآن کریم اور سنّتِ نبویؐ کے عین مطابق ہو۔

درایت کے لحاظ سے بھی یہ قصہ درست ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ آنحضرت ﷺ کا عام طریقِ عمل اسے قطعی طور پر جھٹلاتا ہے کہ آپؐ نے اس قسم کا کوئی عام حکم دیا ہو۔ یہ اگر کوئی عام حکم ہوتا تو اس کے نتیجے میں یقینا اور عملاً کئی قتل واقع ہو جاتے۔ کیونکہ اگر اس کو اس کی ظاہری صورت میں لیا جائے تو آنحضرت ﷺ کا یہ حکم قتل و غارت گری کا ایک کھلا کھلا اور عام اعلان تھا۔ ایسے واضح اور غیر مبہم حکم کے ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ صحابہؓ اس پر عمل کئے بغیر گھروں میں بیٹھے رہتے۔ اس سے تو کشت وخون کی ایک تاریخ رقم ہو جاتی۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ روایت میں بلکہ اس وقت کے تمام تاریخی ریکارڈ میں صرف ایک قتل کا ذکر ملتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کا قتل ہے جو غیر معروف تھا۔ یعنی کسی سیاسی یا مذہبی اہمیّت کا حامل نہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ واقعہ بھی ایسا ہے جسے مجہول الحال راویوں کے سبب ثابت کرنا ممکن نہیں۔

جیسا کہ گزشتہ باب میں یہ ذکر گزر چکا ہے، اصل بات یہ ہے کہ کعب بن اشرف کے قتل کی وجہ سے محض ایک وقتی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے، مخدوش حالات میں اور محدود وقت کے لئے یہ ایک احتیاطی اقدام تھا۔ یہ کوئی عام اور مستقل حکم نہیں تھا۔ نیز جب صحیح روایات سے یہ ثابت ہے کہ دوسرے دن ہی یہود کے ساتھ امن کا نیا معاہدہ ہو گیا تھا۔ (ابوداؤد کتاب الخراج والامارۃ والفئَ باب کیف کان اخراج الیہود من المدینۃ و ابن سعد سریۃ قتل کعب بن الاشرف) تو اس صورت میں یہ ہر گز قبول نہیں کیا جا سکتا کہ اس معاہدے کے ساتھ اس قسم کا حکم بھی موجود رہنے دیا گیا تھا۔ اس معاملے کو سمجھنے کے لئے اس منظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ کوئی مستقل حکم ہوتا اور مدینے کے یہود کو مسلسل اپنی جانوں کا خوف ہوتا تو وہ اس کے متعلق ضرور واویلا کرتے مگر کسی تاریخی روایت سے ظاہر نہیں ہے کہ معاہدے کے بعد یہود کی طرف سے اس قسم کی کبھی کوئی شکایت کی گئی ہو۔ پس روایت اور درایت دونوں طرح سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ قصہ وضعی ہے۔

سنن ابی داؤد میں اور ابن سعد میں اس نئے معاہدے کا معیّن ذکر موجود ہے۔ ابن سعد میں یہ بھی ذکر ہے کہ یہ معاہدہ حضرت علیؓ کے پاس محفوظ تھا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ معاہدہ کسی کتاب میں درج نہیں ہو سکا چنانچہ ان دونوں کتابوں میں اس کا متن موجود نہیں ہے۔

اگر اس مذکورۃ الصدر واقعے میں کچھ حقیقت سمجھی جا سکتی ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ جب کعب بن اشرف کے قتل کے بعد مدینے میں ایک شور پیدا ہوا اور وہاں کے یہود جوش میں آ گئے تو اُس وقت آنحضرت ﷺ نے یہود کی طرف سے خطرہ محسوس کر کے صحابہؓ سے یہ فرمایا ہو گا کہ جس یہودی کی طرف سے تمہیں خطرہ ہو اور تم پر حملہ کرے تو اپنے دفاع میں تم اس پر قابو پا لو تو اسے قتل کر دو۔ 'مَنْ ظَفِرْتُمْ بِهِ' کا یہی معنٰی ہے۔ یعنی (خطرے کے ان مخصوص

حالات میں) اگر کسی یہودی سے اس کے انتقامی جوش میں تمہارا تصادم ہو اور تم اس پر غلبہ پا لو تو اسے قتل کر دو۔ اگر آپؐ کا یہ حکم عام ہوتا تو الفاظ 'مَنْ ظَفِرْتُمْ بِهِ' کی بجائے 'مَن وَجَدْتُمْ' وغیرہ ہوتے۔ یعنی جسے پاؤ، اسے قتل کر دو۔

علاوہ ازیں جہاںتک حالات کی عملی شہادت کا تعلق ہے تو اس سے واضح طور پر ثابت ہے کہ یہ حالت صرف چند گھنٹے رہی تھی۔ کیونکہ دوسرے دن ہی یہود کے ساتھ از سر نو معاہدہ ہو کر امن و امان کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ گو اس کے بعد بھی چند مخصوص واقعات رونما ہوئے مگر وہ اس مذکورہ بالا واقعے سے منسلک نہیں ہیں۔ تاریخ میں ان کی وجوہات اور تفصیلات الگ مذکور ہیں۔ البتہ یہ حقیقت بھی کسی سے اوجھل نہیں ہے کہ یہود ہمیشہ مدینے میں رہے، مسلمانوں کی ان سے معاشرت بھی رہی اور وہ رسول اللہ ﷺ کے وصال تک آپؐ کے احسانات سے فیضیاب بھی ہوتے رہے۔

بے سروپا روایات اور صحابہؓ پر ایک الزام:

کتاب الصارم..... میں ایک عنوان باندھا گیا ہے " اَصْحَابُ الرَّسُوْلِ يَقْتُلُوْنَ السَّابَّ وَلَوْ كَانَ قَرِيْبًا۔" صحابہؓ شاتمِ رسولؐ کو قتل کر دیتے تھے خواہ وہ ان کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوتا تھا۔ اس عنوان کے تحت لکھا ہے:

"صحابہؓ جب کسی کے بارے میں سنتے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دیتا اور دکھ پہنچاتا ہے تو وہ اسے قتل کر ڈالتے اگرچہ وہ ان کا قریبی رشتہ دار ہوتا۔ اس معاملے میں آپؐ ان کی تائید کرتے اور اس سے خوش ہوتے، بعض اوقات آپؐ ایسا کرنے والے کو اللہ اور اس کے رسول کے " ناصر " کا لقب دیتے۔ اس کے تحت یہ روایات درج کی گئی ہیں۔

۱: ابو اسحاق الفزاری نے سیرت پر اپنی مشہور کتاب میں بطریق سفیان ثوری از اسماعیل بن سمیع از مالک بن عمیر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں نے اپنے والد کو مشرکین میں پایا اور آپ ﷺ کے حق میں اس سے قبیح جملہ سنا، میں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھ سکا جب تک نیزہ مار کر اسے موت کی نیند نہ سلا دیا۔ یہ بات آپ ﷺ پر ناگوار نہ گزری۔

۲: ایک اور آدمی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے اپنے والد کو مشرکین میں پایا اور اسے قتل کر دیا اور یہ بات آپؐ پر ناگوار نہ گزری، اموی وغیرہ نے اسے بدیں سند روایت کیا ہے۔

۳: اسی طرح ابو اسحاق الفزاری نے اپنی کتاب میں حسّان بن عطیہ سے نقل کیا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ایک لشکر بھیجا جس میں حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ اور جابرؓ بھی تھے۔ جب مشرکین نے صف آرائی کی تو ان میں سے ایک آدمی سامنے آکر رسول اللہ ﷺ کو گالیاں دینے لگا۔"

اس کے بعد مبارزت اور قتل کا ذکر ہے اور لڑائی میں قتل کرنے والے صحابیؓ کی شہادت کا بھی ذکر ہے۔ اس کی شہادت پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کیا تمہیں اس آدمی پر حیرت ہوئی جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مدد کی۔" (الصارم المسلول:105,104)

جہاں یہ عنوان قطعی طور پر جھوٹا اور غلط ہے، وہاں ان روایات کا سرچشمہ بھی واضح طور پر مکدّر ہے۔ ابو اسحاق الفزاری کی کتاب جو سیرت کی کتاب ہے، اس کی روایت کی صحت اور اس کے استناد کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ کتاب بھی ایسی 'مشہور' ہے کہ اس کا نام تک بھی درج نہیں کیا گیا۔ خصوصاً دوسری روایت تو بالکل بے سر و پا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں کسی گالی کا ذکر

نہیں۔ البتّہ صرف شرک کا ذکر موجود ہے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو کبھی کسی کو شرک کی وجہ سے نہ قتل کروایا نہ کسی کو اس کا قتل کرنے دیا۔ یہ آپؐ کی مستقل، متواتر اور ثابت سنت ہے۔ قرآن کریم کے مطابق شرک کی سزا کا مسئلہ صرف اور صرف خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ کسی کو اس وجہ سے قتل کرے کہ وہ مشرک ہے۔ اگر ایسا حکم ہوتا تو ہر وقت سرزمین عرب مشرکوں کے خون سے سرخ رہتی۔ خصوصاً فتح مکّہ کے بعد مکّے میں مشرکوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی ہوتی۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہوا۔ بلکہ فتح مکّہ کے بعد مشرکینِ مکّہ بھی آنحضرت ﷺ کے ہمراہ غزوۂ حنین میں قبائلِ ہوازن کے خلاف لڑائی میں شامل ہوئے۔ پس یہ اس مذکورہ بالا دعوے کو جھوٹا ثابت کرنے اور ردّ کرنے کے لئے کافی دلیل ہے۔

قبل ازیں امام ابو حنیفہؒ کے فتوے کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس میں آپؒ فرماتے ہیں کہ جب مشرک کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے تو شاتم کو کیوں قتل کیا جائے۔ پس قرآن کریم اور سنّتِ رسول ﷺ، احادیثِ صحیحہ اور امام اعظمؒ کے فتوے کے سو فیصد خلاف کسی بے سروپا روایت کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ پس ان بے سند اور من گھڑت روایات میں ایک واضح اور ناروا ظلم کا ذکر ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک

تیسری روایت میں جس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے وہ میدانِ کارزار سے تعلق رکھتا ہے۔ جنگ میں مبارزت بھی ہوتی ہے اور رزم و ہجو اور تشبیب بھی۔ پھر اس میں ہمیشہ فریقین میں سے قتل بھی ہوتے ہیں۔ یہ جنگ کا خاصّہ ہے۔ اس منظر میں دشمن کے کسی مبارز مقتول کو شاتم رسولؐ قرار نہیں دیا جاتا بلکہ وہ محارب ہونے کی وجہ سے اور جنگ کے طبعی نتائج کی بناء پر قتل ہوتا ہے۔

اس روایت کے وضعی ہونے کا ایک اور قرینہ یہ بھی ہے کہ اس میں نہ مقتول کے نام کا ذکر ہے اور نہ قاتل کے نام کا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسی اہم روایت جو ایک عقیدے کے اثبات یا اسے قائم کرنے کے لئے پیش کی جارہی ہو، اس کے دو بنیادی کردار ہی نامعلوم الاسم اور مجہول الحال ہوں۔

علاوہ ازیں اس روایت کے ترجمے پر پروفیسر غلام احمد حریری نے لکھاہے: ''یہ حدیث حسّان بن عطیہ کے ارسال کی وجہ سے ضعیف ہے۔'' پس یہ روایت بیّنہ طور پر مرسَل ہونے کی وجہ سے قطعی طور پر قابلِ استناد نہیں ہے۔ اسے کسی عقیدے یا قانون کی بنیاد بنانا، اپنے ہاتھوں سے اس عقیدے اور قانون کے جھوٹ کی بیّنہ تصدیق ہے۔

ان روایتوں پر جو عنوان باندھا گیاہے، وہ سراسر ایک جھوٹا عنوان ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اور احادیثِ صحیحہ میں رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ کی بیان شدہ سیرت میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا جس میں صحابہؓ نے گالی دینے والے کو قتل کیاہو۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے بسا اوقات ایسے جذبات کا اظہار ضرور کیا تھا مگر رسول اللہ ﷺ نے اس کی کبھی اجازت نہیں دی۔ عبد اللہ بن ابیّ بن سلول کوئی ایک دو دفعہ توہین و تذلیل کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ وہ مسلسل اسی مہم پر قائم تھا۔ واقعہ افک (یعنی حضرت عائشہؓ زوجہ رسولؐ پر نعوذ باللہ بدکاری کا الزام) تراشنے والا اور رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) اَذَلّ کہنے والا یہی شخص تھا۔ قرض دینے والے ایک گستاخ یہودی نے آپؐ پر دست درازی تک کی تھی۔ حنین سے واپسی پر اموال کی تقسیم کے وقت آپؐ کو دھکیل دھکیل کر جھاڑی میں الجھا دیا گیا تھا۔ اسی موقعے پر ذوالخویصرہ کی پرلے درجے کی گستاخی کا واقعہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ یہودی آکر آپؐ کے بستر کو پاخانے سے گندا کر گیا تھا۔ طائف کے سفر میں آپؐ پر تشدّد کیا گیا تھا۔ مکّہ میں 13 سال مسلسل ہر قسم کی بدنی و لسانی تحقیر و تنقیص کی گئی تھی وغیرہ

وغیرہ، آپؐ کی گستاخی اور تذلیل کی کتنی اور کیسی کیسی کہانیاں ہیں۔ مگر قربان جائیں اس رحمتِ مجسّم ﷺ پر کہ نہ صرف اپنے ساتھیوں کو بلکہ پہاڑوں پر مامور فرشتوں کو بھی یہ اجازت نہیں دیتے کہ وہ کسی کی جان تلف کریں۔ آنحضرت ﷺ کی ساری زندگی حضرت عائشہؓ کی بیان فرمودہ اس حقیقت افروز گواہی پر شاہدِ ناطق ہے کہ ” آپؐ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔“ (مسلم کتاب الفضائل) یعنی آپؐ نے کبھی کسی اور کو بھی آپؐ کی شان میں کسی زیادتی یا توہین کرنے والے کی جان لینے کی اجازت نہیں دی۔ جیسا کہ پہلے ذکر گزر چکا ہے کہ بسا اوقات بعض صحابہؓ نے آپؐ سے کسی گستاخ کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی مگر ہر موقع پر آپؐ نے ان کی درخواست ردّ کر دی۔ آپؐ نے جن چند لوگوں کے قتل کا ارشاد فرمایا وہ گستاخی یا توہین و سبّ کرنے والے نہ تھے بلکہ ان کے جرم اور تھے جو قومی یا انسانی حقوق کے تحفّظ کے لحاظ سے سنگین تھے۔ انہیں ان جرموں کی سزا دی گئی تھی۔ توہین و تنقیص کی وجہ سے سزا نہیں دی گئی تھی۔

پس خود تراشیدہ اور بے سروپا، گمنام مجموعوں سے روایات لے کر نبیٔ رحمتؐ کی طرف قتل و خون منسوب کرنا آپؐ سے انتہائی زیادتی ہی نہیں دشمنی بھی ہے۔

اس عنوان کے تحت دو تین مزید وہ روایات بھی درج کی گئی ہیں جو روایات والے باب میں زیرِ بحث آ کر ردّ کی جا چکی ہیں۔ یہاں ان کے تکرار کی ضرورت نہیں۔

کتاب ’ الصارم..... ‘میں اس جگہ ابن ابی سرح کا قصہ بھی اختصار کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس واقعے کا ذکر یہاں برعکس دلیل پیش کر رہا ہے۔ کیونکہ اسے تو قتل نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اسے معافی مل گئی تھی۔ لہٰذا اس کا یہاں اندراج عبث اور بے مقصد ہے۔ جسے خود رسول اللہ ﷺ نے معاف کر دیا اور اسے قتل ہی نہیں کیا گیا تو اس سے ثابت کیسے

ہو سکتا ہے کہ توہین رسولؐ کی سزا قتل ہے۔ اس کی معافی تو بذاتِ خود اس بات کی نا قابلِ تردید دلیل ہے کہ شاتمِ رسولؐ کی سزا قتل نہیں ہے۔

الغرض ان وجوہات کی بناء پر یہی ثابت ہوتا ہے کہ کتاب 'الصارم.....' کی یہ بات کہ "صحابہؓ شاتمِ رسولؐ کو قتل کر دیتے تھے خواہ وہ ان کا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوتا تھا۔" قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد ہے۔

شاتم جنّوں کا قتل!

مذکورہ بالا عنوان کے بعد عنوان " مُؤْمِنُو الْجِنِّ یَقْتُلُ السَّابَّ مِنْ کُفَّارِھِمْ" ویسے ہی مضحکہ خیز ہے جو کتاب 'الصارم........' کے استناد کو اور بدنما کر دیتا ہے۔ عنوان یہ ہے کہ "کافر جنّوں میں سے جو رسول کریم ﷺ کو گالی دیتا تھا مومن جنّ اسے قتل کر دیتے تھے۔" (الصارم..... صفحہ 106,105)

اس عنوان سے انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ کس حدّ تک نامعقول اور غیر مستند وضعی مواد اس کتاب میں جمع کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ایک مضحکہ خیز گپ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جنّوں اور بھوتوں جیسی تصوّراتی غیر مرئی مخلوق کے قصوں پر مبنی ایسی مبیّنہ گپ سے شریعت کا کوئی مسئلہ کبھی حل ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ کجا یہ کہ اسے مذہبی عقائد کی بنیاد قرار دیا جائے۔ دیومالائی کہانیاں شریعت کے مسائل کا حل ہو سکتی ہیں نہ بنیاد۔

مؤمن اور کافر ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوں گے:

الصارم .... صفحات 109 تا 113 پر زیرِ عنوان " فِعْلُ عَقِيْلِ ابْنِ اَبِي طَالِبٍ بِدُوَرِ النَّبِیِّ وَ اَقَارِبِهٖ " میں آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کو ایک مستقل قانون کی حیثیت سے لیا گیا ہے۔ نیز آخر میں اس سے گالی والے مسئلے کا بھی استدلال کیا ہے۔ چنانچہ آپؐ کا مذکورہ بالا ارشاد اس طور پر تحریر کر کے لکھا ہے:

"آپؐ کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہنوز مکانات اس (حضرت علیؓ کے بھائی عقیل) کے قبضے میں ہیں اور تقسیم نہیں ہوئے تو ہم تمام مکانات اسی کو دے دیں گے اور اس کے بھائیوں کو نہیں دیں گے۔ اس لئے کہ وہ ایک غیر مقسوم میراث ہے۔ لہٰذا اب اسے اسلامی احکامات کے مطابق تقسیم کیا جائے گا اور اسلامی تقسیم کی رُو سے ایک مسلم کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ اگرچہ یہ حکم ابو طالب کی وفات کے بعد نازل ہوا، چونکہ ترکہ اس وقت تک تقسیم نہیں ہوا تھا اس لئے اسے اسلامی احکام کے مطابق تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا رسول کریم ﷺ نے واضح کیا کہ جعفر اور علی کو ابو طالب کی وراثت سے حصہ طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ جائیداد موجود ہو اور جب ان سے فی سبیل اللہ لی گئی تو اب وہ اسے کیونکر واپس لے سکتے ہیں۔........ اسی طرح اس سے ان گالیوں کا بھی محاسبہ نہیں کیا جائے گا جو اس سے دورِ جاہلیت میں صادر ہوئیں، بنابریں ان لوگوں کو معاف کر دیا جائے گا۔" (الصارم.....113,112)

اس مکمل بحث میں ورثے کی بابت جو توجیہات پیش کی گئی ہیں، وہ قرآنی قوانینِ وراثت سے واضح طور پر ٹکراتی ہیں۔ قبل اس کے کہ اس بحث کی سمت چلیں، ذرا یہ دیکھتے ہیں کہ اس ارشادِ نبویؐ کی تفصیل اور اس کا منظر اور پس منظر کیا ہے؟

اس واقعے کا منظر یہ ہے کہ فتح مکّہ کے روز صحابہؓ نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ مکّے میں آپؐ کہاں قیام فرمائیں گے؟ تو اس کے جواب میں آپؐ نے فرمایا: ''هَلْ تَرَكَ لَنَا عَقِيْلٌ مِّنْ مَنْزِلٍ ثُمَّ قَالَ لَا يَرِثُ الْمُؤْمِنُ الْكَافِرَ وَلَا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُؤْمِنَ'' (بخاری کتاب المغازی غزوۂ فتح مکّہ و کتاب الفرائض باب لا یرث المسلم الکافر) کہ عقیل نے تو ہمارا کوئی گھر بھی نہیں چھوڑا۔ یعنی میرے رشتہ داروں نے میری ہجرت کے بعد میری ساری جائیداد بیچ ڈالی ہے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ مؤمن کافر کا وارث نہیں ہو گا اور کافر مؤمن کا وارث نہیں ہو گا۔ (مسلم کتاب الفرائض میں 'مؤمن' کی جگہ 'مسلم' کے الفاظ ہیں۔)

آنحضرت ﷺ کا یہ قول فتح مکّہ کے روز کا ہے۔ اسے بعض علماء نے بھی ایک عام اور مستقل قانون قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ یہاں چونکہ نہ دارالحرب کا ذکر ہے اور نہ کسی اَور ایسی بات کا جو اس کو مخصوص یا محدود کرتی ہو۔ اس لئے یہ ایک عمومی اور دائمی حکم قرار پائے گا۔

ان کا خیال اپنی جگہ مگر اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعض احکامات بعض مخصوص تناظر میں ہیں۔ آپؐ جب کسی خاص پس منظر میں کوئی بات بیان فرماتے تھے تو اس پس منظر کو جاننے کی وجہ سے صحابہؓ اس کا مطلب سمجھ رہے ہوتے تھے۔ اس لئے اس وقت آپؐ کے اس فرمان کے بارے میں ایسی بحث نہیں اٹھی کہ وہ دائمی حکم ہے، مشروط ہے یا بعض مخصوص حالات سے تعلق رکھنے والا محدود حکم ہے؟ چونکہ ایسی تفصیلات اس وقت سامنے نہیں آئیں لہٰذا بعد میں بعض فقہاء نے اس کو ایک عام اور دائمی حکم قرار دے دیا۔

آنحضرت ﷺ جب یہ فرماتے ہیں کہ نہ مسلمان غیر مسلم کا وارث ہو گا نہ غیر مسلم مسلمان کا وارث، تو ماحول اور پس منظر کو سامنے رکھ کر اس فرمان کی نوعیت کو جاننا ضروری ہے

کہ کہیں یہ حکم ایسا تو نہیں ہے جو مخصوص ہے اور بعض حالات کے تناظر میں مشروط ہے یا کسی جنگی پس منظر سے متعلق ہے اور محدود ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم بسا اوقات بعض خاص حالات کے لئے روز مرّہ کے عام احکامات سے ہٹ کر مگر واضح طور پر اجازت دیتا ہے۔ اجازت کی ایسی صورتوں کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ اگر دشمن ایک کام کرتا ہے تو تمہیں بھی اس دشمن سے اس حدّ تک ویسا متبادل سلوک کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً دشمن اگر بیت الحرام کی بے حرمتی کرتے ہوئے وہاں لڑتا ہے تو تمہیں بھی صرف اسی حدّ تک اس جگہ لڑنے کی اجازت ہے۔ اگر دشمن عہد شکنی کر کے تمہیں نقصان پہنچاتا ہے تو تمہیں بھی صرف اسی حدّ تک اجازت ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً فَانۡۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآئِنِيۡنَ“ (الانفال: 59) ترجمہ: اور اگر کسی قوم سے تُو خیانت کا خوف کرے تو اُن سے ویسا ہی کر جیسا انہوں نے کیا ہو۔ اللہ خیانت کرنے والوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اس آیت میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم دشمن سے کوئی معاہدہ کرتے ہو اور اس کی وجہ سے خود کو مأمون و محفوظ سمجھتے ہو اور اس کی طرف سے کسی حملہ کی توقّع نہیں رکھتے۔ جبکہ وہ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر معاہدہ شکنی کرتے ہوئے تم پر حملہ کرتا ہے اور تمہیں نقصان پہنچاتا ہے تو اس کی خیانت اور معاہدہ شکنی کے بدلے میں تمہیں بھی 'عَلٰى سَوَآءٍ' کے اصول کے مطابق اس سے معاہدہ ختم کرنے کی اجازت ہے۔ ایسی صورتحال میں معاہدہ ختم کرنے کے لئے تمہارا اُسی قدر اور برابر کا عمل جائز ہو گا۔ پس 'فَانۡۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ عَلٰى سَوَآءٍ' کا مطلب یہ ہے کہ بعض جگہ دشمن کا فیصلہ ہوتا ہے جو تمہارے عمل کے لئے بنیاد اور دلیل بنتا ہے۔ اس منظر میں آنحضرت ﷺ کے اس مذکورہ بالا فرمان میں ایک واضح حکمت اور ایک منصفانہ توازن صاف دکھائی دیتا ہے۔

اس کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ مثلاً حالتِ جنگ میں دشمن اگر زیادتی کرتا ہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ گو دشمن نے زیادتی کر کے عہد یا قانون توڑا ہے مگر ہم اپنے عہد کی وجہ سے اس پر زیادتی کرنے کے مجاز نہیں۔ بلکہ جتنی دشمن نے زیادتی کی ہے، خدا تعالیٰ نے 'علیٰ سوآءٍ' کے قانون کے تابع مومنوں کو اتنی برابر کی کارروائی کی اجازت دی ہے۔ روز مرّہ کی زندگی میں اسی نوع کی اور مثالیں بھی ہیں۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے: ''لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الۡجَہۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ'' (النسآء: 149) کہ اللہ تعالیٰ بُری بات کے کھلم کھلا اور بلند بانگ اظہار کو پسند نہیں فرماتا۔ یعنی اونچی آواز میں بُری بات ہو، سخت گوئی ہو، بدکلامی ہو، جھگڑے کی بات ہو اللہ تعالیٰ اسے ہرگز پسند نہیں فرماتا۔ ''اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ'' سوائے اس کے جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو۔ یعنی اگر کوئی کسی کے خلاف بدگوئی اور بدتمیزی کر رہا ہے تو اس کو اس کے جواب کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ اس طریق کو پسند نہیں کرتا، وہ خود رُک جائے تو اس کو ثواب ہو گا، یہ ایک مستحب بات ہو گی۔ مگر ہر مظلوم کا یہ حق قائم فرمادیا کہ جتنا اس پر ظلم ہوا ہے اس کا وہ اتنا بدلہ لے سکے۔

پس یہ وہ وقتی صورت اور ضرورت ہے جو اِن احکام میں صاف نظر آتی ہے۔ جہاں مسلمان کو غیر مسلم کے ورثے سے اور غیر مسلم کو مسلمان کے ورثے سے محروم قرار دیا گیا ہے۔ وہ وقتی صورت اور ضرورت مبیّنہ طور پر محاربت یعنی ایک دوسرے سے لڑائی کی حالت تھی اور مسلمانوں کو یہ حکم اُس وقت اِس لئے تھا کہ اُن سے غیر مسلم یہی سلوک روا رکھتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب فتح مکّہ کے وقت صحابہؓ کے استفسار پر یہ جو فرمایا: ''ھَلۡ تَرَکَ لَنَا عَقِیۡلٌ مِّنۡ مَنۡزِلٍ'' کہ عقیل نے میرے لئے کون سا گھر چھوڑا ہے کہ جس میں مَیں قیام کر سکوں۔ یعنی آپؐ کے چچا ابو طالب کے بیٹے عقیل نے آپؐ کی ساری موروثی جائیداد پر قبضہ کر کے

اسے بیچ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ کا اپنے آباء واجداد کی جائیدادوں میں وراثت کا حق تو موجود تھا لیکن آپؐ کو ملا اس لئے نہیں کہ وہ جائیدادیں باقی نہیں رہیں۔ پس یہاں حقِ وراثت کی نفی نہیں کی گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مسلمانوں کے وہ رشتے دار جو مسلمان نہیں ہوئے تھے ، یہ ظلم کر رہے تھے کہ حقیقی وارثوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے ان وِرثوں سے محروم کر رہے تھے۔ یہ واقعاتی شہادت ہے جس کے تناظر میں آنحضرت ﷺ کے حکم " لَا یَرِثُ الْمُؤْمِنُ الْکَافِرَ وَلَا یَرِثُ الْکَافِرُ الْمُؤْمِنَ "کو دیکھا جائے تو اس کی حکمت روشن ہو جاتی ہے اور بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ آپؐ کا یہ حکم نہ وصیّت و وراثت کے قرآنی قوانین کے مخالف ہے نہ ان سے متصادم۔ کیونکہ یہ ایک ایسی حالت سے تعلق رکھتا ہے جہاں دشمن نے جنگی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک زیادتی میں پہل کی تھی۔ اس ماحول میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ٹھیک ہے، اگر انہوں نے مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمارا حقِ وراثت کالعدم کیا ہے تو ان کے مقابل پر ہم بھی ان کا حق اس وجہ سے ختم کرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں۔ یہ " فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَآءٍ " والا قانون ہے۔

یہی قانون ایک اور حدیث میں بھی بہت متوازن الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا: "لَا یَتَوَارَثُ اَھلُ الْمِلَّتَیْنِ شَتّٰی "(ترمذی ابواب الفرائض لایتوارث اھل الملتین و ابو داؤد کتاب الفرائض باب ہل یرث المسلم الکافر) کہ دو مختلف ملّتوں والے ایک دوسرے کا ورثہ نہیں پائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں مسلمان ملّت اور حربی کافر والی ملّت مراد ہے۔ اِس میں " یَتَوَارَث "کے لفظ میں ایک تقابل پایا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا بالمقابل ورثہ نہیں پاتے۔"اَھلُ الْمِلَّتَیْنِ "میں بھی کوئی عام حکم نہیں۔ کیونکہ ساری دنیا میں ورثے کا نظام مذہب کی بناء پر نہیں، خون کے رشتے کی وجہ سے قائم ہے۔ صحابہؓ نے بھی جب ورثہ پایا تھا تو اپنے ان ماں باپ وغیرہ ہی سے ورثہ پایا تھا جو

مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ کوئی ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ عام حالات میں کسی صحابیؓ نے اپنے والدین کے ورثے سے اس وجہ سے انکار کیا ہو کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ پس یہ بات خلافِ واقعہ بھی ہے اور انسانی تاریخ کے قائم، جاری اور مسلّمہ قانون سے بھی متصادم ہے۔

اُس زمانے کے عمومی حالات یہ تھے کہ اسلام پھیل رہا تھا اور مسلمان ہونے والے اپنے مشرک یا کافر والدین کا ورثہ پا رہے تھے۔ تمام ریاستیں اور ممالک مثلاً بحرین، یمن، شام، نجران و عمان وغیرہ کے یہود و نصارٰی نیز ایران کے آتش پرستوں میں سے جو مسلمان ہوئے تھے انہوں نے اپنے ماں باپ کا ورثہ پایا تھا۔ اس لئے یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسی بات فرمائی ہو کہ اس سے تمام عالم کی مسلّمہ تاریخ کو بدلنے کا تصوّر پیدا ہوتا ہو۔ آپؐ کی شان تو یہ ہے کہ آپؐ اس حدّ تک محتاط ہیں کہ ہر بات میں سچّائی کے تمام تقاضے اعلیٰ معیار پر پورے فرماتے ہیں۔ آپؐ یہ بیان کس طرح دے سکتے ہیں کہ ساری دنیا میں رواج ہے کہ کہیں بھی کوئی ملّت دوسری ملّت والے کا نہ ورثہ پاتی ہے اور نہ ورثہ دیتی ہے۔ چنانچہ اس کے برعکس آپؐ کے قول ''یَتَوَارَثُ'' میں توازن والا تقابلی پہلو نمایاں ہے جس کا یہ معنے ہر لحاظ سے قابلِ قبول ہے کہ جہاں کوئی ایک حربی کافر دوسرے کو محروم کرتا ہے، وہاں ہمیشہ دوسرے شخص کا بھی حق ہوتا ہے کہ وہ اس محروم کرنے والے کو بھی اس کے اس حق سے محروم کر دے۔ اس مفہوم سے نہ اس فرمانِ رسولؐ پر زد پڑتی ہے نہ اس کے عملی پہلوؤں پر حرف آتا ہے اور نہ ہی وراثت کا دائمی اصول ٹوٹتا ہے۔

مختصر یہ کہ حدیث کے الفاظ میں دونوں امکانات موجود ہیں۔ خواہ تاریخ، عقل اور واقعات کے خلاف ترجمہ کیا جائے یا وہ پُر حکمت ترجمہ کیا جائے جو آنحضرت ﷺ کی منشاء کے عین مطابق ٹھہرتا ہے اور مضمون کو خوب روشن کرتا ہے اور اس سے کوئی اختلاف بھی ممکن

نہیں۔ یعنی اصول ''لَا یَتَوَارَث'' ہے کہ جہاں بھی کوئی حربی ملّت دوسری کو ورثے سے محروم کرتی ہو، وہاں قاعدہ یہ ہے کہ وہ بھی اسے اس کے حق سے محروم کر دیا کرتی ہے۔

اس بحث سے یہ قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ فرمانِ نبوی بعض جنگی حالات کے ساتھ مخصوص و محدود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اختلافِ دین کی بناء پر حقِ وراثت سے محرومی کا کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ اشارۃً بھی ایسا ذکر موجود نہیں کہ کوئی شخص دین کی وجہ سے وارث بنا ہو یا اسی بناء پر وراثت سے محروم ہوا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس قرآنِ کریم میں حقوقِ وراثت کو خونی تعلق کی بناء پر استوار کیا گیا ہے۔ مثلاً آیاتِ میراث میں فرمایا ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ'' (النساء:8) کہ مَردوں کے لئے اس ترکے میں سے ایک حصہ ہے جو والدین اور اقرباء نے چھوڑا۔ نیز ''لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوٰلِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ'' (النساء:8) عورتوں کے لئے اس ترکے میں سے ایک حصہ ہے جو والدین اور اقرباء نے چھوڑا۔ اور ''يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ'' (النساء:12) اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں نصیحت کرتا ہے۔ اور '' وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ'' (النساء:13) اور تمہارے لئے اس میں سے نصف ہو گا جو تمہاری بیویوں نے ترکہ چھوڑا۔ اور ''وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوٰلِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ''(النساء:34) اور ہم نے ہر ایک کے لئے وارث بنائے ہیں اس (مال) کے جو والدین اور اقرباء چھوڑیں۔ ایسی سب آیات میں خونی رشتوں کی بناء پر حقِ وراثت کا ہی ذکر ہے، دین کے اختلاف کی وجہ سے کسی کو محرومُ الارث قرار دینے کا کلّیۃً کوئی ذکر نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ قرآن کریم نے چونکہ اختلافِ دین و مذہب کی بناء پر وراثت کے حقوق کو قائم نہیں فرمایا اس لئے حدیث ''لَا يَرِثُ الْمُؤْمِنُ الْكَافِرَ وَلَا يَرِثُ الْكَافِرُ الْمُؤْمِنَ'' کو

سمجھنے کے لئے ان مخصوص حالات کو مدّ نظر رکھنا ضروری ہے جو اس وقت رائج تھے۔ مسلمان اور کفّار آپس میں برسرِ پیکار تھے اور کفّار مختلف انواع کی زیادتیاں کرتے تھے جس کے جواب میں قرآنِ کریم مسلمانوں کو بھی اتنے ہی جوابی سلوک کی اجازت دیتا تھا۔ یہ کوئی عام اجازت نہیں تھی بلکہ محاربت کی بناء پر اور اس کے ردّ عمل میں ایک محدود اجازت تھی۔ وراثت میں بھی کفّار کی زیادتی ثابت ہے اس لئے ان مخصوص حالاتِ محاربت میں جو اس وقت رائج تھے، آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ فرمانا قرآنی مفہوم کے عین مطابق تھا۔

جو غیر مسلم محارب ہوں اور وہ مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہوں یا محارب کفّار کے مددگار ہوں، قرآنِ کریم ان کے مالی حقوق تسلیم نہیں کرتا، تاکہ ان کی جارحانہ کارروائیوں میں ان کے اموال دشمن کی تقویّت کا باعث نہ بنیں۔ لیکن وہ غیر مسلم جو نہ خود محارب ہوں اور نہ محارب کفّار کی مدد کرتے ہوں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "لَا یَنۡہٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡکُمۡ مِّنۡ دِیَارِکُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡھُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ" (الممتحنۃ:9) کہ اللہ تمہیں ان سے منع نہیں کرتا جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں قتال نہیں کیا اور نہ تمہیں بے وطن کیا کہ تم ان سے نیکی کرو اور ان سے انصاف سے پیش آؤ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے متعلق ہرگز منع نہیں فرماتا جنہوں نے تمہارے ساتھ دین کے لئے لڑائی نہیں کی کہ ان سے دوستیاں کرو، ان سے تعلقات بڑھاؤ وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ انہوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملے میں لڑائی نہیں کی اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا تھا اس لئے "اَنۡ تَبَرُّوۡھُمۡ وَ تُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡہِمۡ" ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، نیکی کرو اور انصاف کا معاملہ کرو۔

خدا تعالیٰ تو ایسے لوگوں سے اس حدّ تک حسنِ سلوک اور نیکی وغیرہ کی تلقین فرماتا ہے تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایسے لوگوں سے حسنِ سلوک کے سب تعلقات تو بڑھائے جائیں

مگر ان کی وراثت کے بنیادی خونی اور انسانی حقوق پر خطِ تنسیخ پھیر دیا جائے۔ یہ تَبَرُّوْهُمْ اور وَ تُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ کے خلاف ہے۔ چونکہ انسان کی وراثت کو دین کے ساتھ باندھنا واضح طور پر الٰہی قانون اور انصاف کے بنیادی اور عالمی تصوّر سے متصادم ہے۔اس لئے ایسے نظریئے کو آنحضرت ﷺ کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

ہاں جس قسم کے تعلق کو منقطع کرنے کا ارشاد فرمایا وہ حکم یہ ہے کہ ان سے دوستیاں نہ بڑھائی جائیں اور گہرے معاشرتی تعلقات کو فروغ نہ دیا جائے۔ لہٰذا فرمایا: " اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" (الممتحنہ:10) کہ اللہ تمہیں محض ان لوگوں کے بارہ میں منع کرتا ہے جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے لڑائی کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا اور تمہیں نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی کہ تم انہیں دوست بناؤ۔ اور جو انہیں دوست بنائے گا تو یہی ہیں جو ظالم ہیں۔

اسلام کی رُو سے ان لوگوں سے تعلق قطع کرنے کا حکم ہے اور ان سے احسان اور انصاف کا معاملہ اس حدّ تک چھوڑنے کا حکم ہے جس حدّ تک انہوں نے ظلم کیا تھا، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ دونوں حکموں میں مطابقت اس طرح ہو گی کہ جہاں جہاں دشمن کی طرف سے زیادتیاں کی گئی تھیں، رسول کریم ﷺ نے ایسی آیات کی روشنی میں بعض مواقع پر مسلمانوں کو بھی جوابی سلوک کی اجازت دی۔ یہاں یہ بات بھی مدّ نظر رکھنی چاہئے کہ جوابی سلوک کی ایسی اجازت بھی فوراً نہیں دی بلکہ ایک وقت تک صبر کیا اور جب دیکھا کہ دشمن اس حسنِ سلوک سے فائدہ نہیں اٹھا رہا اور زیادتیوں پر زیادتیاں کر رہا ہے تو اُس وقت فرمایا کہ تمہیں بھی صرف اسی حدّ تک اجازت ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔

جہاں تک خونی رشتوں کے حقوق کا تعلق ہے تو اسلام نے ان کا غیر معمولی تحفّظ فرمایا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ”وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤى اَنۡ تُشۡرِكَ بِىۡ مَا لَيۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌۙ فَلَا تُطِعۡهُمَا وَ صَاحِبۡهُمَا فِى الدُّنۡيَا مَعۡرُوۡفًا“(لقمٰن:16) کہ اگر وہ (تیرے ماں باپ)دونوں تجھ سے جھگڑا کریں کہ تُو میرا شریک ٹھہرا جس کا تجھے علم نہیں تو ان دونوں کی اطاعت نہ کر اور ان دونوں کے ساتھ دنیا میں دستور کے مطابق رفاقت جاری رکھ۔

یہ آیت بھی صاف بتاتی ہے کہ اگر ماں باپ مشرک ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ ان کو دین کے اختلاف کی وجہ سے ان حقوق سے محروم نہیں کرتا جو ماں باپ کے اولاد پر ہوتے ہیں۔ ان حقوق میں سے بہت بڑا حق وراثت کا ہے جو ماں باپ کا اولاد پر اور اولاد کا ماں باپ پر ہوتا ہے۔ پس اس آیت میں یہ تعلیم بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی گئی ہے اور تاکید کی گئی ہے کہ ماں باپ کو ہرگز کسی بھی انسانی حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا خواہ دین کا اختلاف کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ یہ ایک عظیم الشان تعلیم ہے جس کی نظیر لانے سے دوسرے مذاہب قاصر ہیں۔

اسی طرح ایک اور آیت میں بھی یہی اصل پیش کیا گیا ہے۔ فرمایا: ”وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ اِذَاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ “ (المائدہ:6) اور پاکباز مومن عورتیں اور ان لوگوں میں سے پاکباز عورتیں بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تمہارے لئے حلال ہیں جب تم انہیں نکاح میں لاتے ہوئے ان کے حق مہر ادا کر دو۔ یعنی ان عورتوں کو جو اہلِ کتاب میں سے ہیں اور مسلمانوں کی بیویاں ہیں، ایک طرف تو ان کو ان کے اجور ادا کرنے کی تو تلقین ہو۔ یعنی ان کی زندگی میں تو ان کے حقوق اتنی سختی سے قائم کئے گئے ہوں تو یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ساتھ ہی ان کے وارث نہ بننے کی بھی بات ہو رہی ہو۔ اگر وہ اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے ورثہ نہیں پائیں گی تو اجور دینے کا جواز ہی نہیں رہتا۔ انہیں

تو ان اجور کا بھی حقدار نہیں ہونا چاہئے تھا۔ پس ایسی اہلِ کتاب عورتیں جن کے خاوند مسلمان ہوں اور وہ فوت ہو جائیں تو ان میں سے ایک کی وفات پر دوسرا لازماً مقررہ حصے کا وارث ٹھہرتا ہے۔ اسے اس سے محروم کرنے کی کوئی تعلیم قرآن کریم میں نہیں۔

اسی طرح مقتول کی دیت کے بارے میں قرآنِ کریم سوائے محارب کفّار کے مسلم اور غیر مسلم ورثاء میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ چنانچہ فرمایا: ”وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ط فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ط وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ م بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ“ (النساء:93) ترجمہ: اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو قتل کرے تو ایک مومن غلام کا آزاد کرنا ہے اور طے شدہ دیت اس کے اہل کو ادا کرنا ہوگی سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ اور اگر وہ (مقتول) تمہاری دشمن قوم سے تعلق رکھتا ہو اور وہ مومن ہو تب بھی ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد و پیمان ہوں تو اس کے اہل کو طے شدہ دیّت دینا لازم ہے اور ایک مومن غلام کا آزاد کرنا بھی۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اگر مقتول کسی دشمن قوم سے ہو لیکن مومن ہو تو پھر قاتل کے لئے ایک مومن غلام آزاد کرنا لازم ہے، اس پر دیت لازم نہیں کیونکہ دیت اس کے ورثاء کو ملے گی اور وہ چونکہ غیر مسلم ہیں، دشمن اور محارب ہیں اور مسلمانوں سے برسرِپیکار ہیں اس لئے انہیں دیت کی ادائیگی نہیں کی جائے گی۔ جبکہ مقتول کے غیر مسلم ورثاء اگر محارب نہ ہوں تو انہیں مسلمان ورثاء کی طرح دیت کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔

پس ان آیات کریمہ کی روشنی میں زیرِ بحث حدیثِ نبویؐ کے معنے بھی متعیّن ہو جاتے ہیں اورانہی معنوں میں یہ حدیث بھی قابلِ قبول قرار پاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے انسانی حقوق و معاملات کی جو کھلی اور واضح تعلیم دی ہے اس کے دائرے میں ان کو دیکھا جائے تو حقیقت افروز مفہوم یہ بنے گا کہ جہاں غیر تم سے یہ سلوک کریں وہاں تمہیں بھی حق ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ وہی جوابی سلوک کرو اور یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہیں پابند کر رہا ہے کہ تم ایسی صورت میں بھی ان کو ورثہ دو جب اوّلاً وہ تمہیں اس سے محروم کر رہے ہوں۔

اس سے ایک اور زاویہ بھی سامنے آتا ہے کہ اگر غیر مسلم وارث کو محض مذہب کی بناء پر محرومُ الارِث قرار دیا جائے تو وہ وراثت کی محرومی کے خوف سے اور مال کے حصول کے لالچ میں مسلمان ہو جائے گا۔یعنی وہ ایمان کی بنیاد پر نہیں،مالی مفادات کی بناء پر بظاہر مسلمان ہو جائے گا لیکن اندر سے کافر ہی رہے گا۔پس ایسی تعلیم اسلام قبول کرنے والے کو نعوذ باللہ عملاً منافق بنانے والی ثابت ہو گی۔

الغرض مذکورہ بالا بحث سے قطعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فرمان کا مقصد یہ ہے کہ وراثت چونکہ بنی نوع انسان کا ایک بنیادی حق ہے اس لئے جو کسی کو اِس بنیادی حق سے محروم کرے گا وہ خود بھی اس سے محروم ہو گا۔یہ ایک توازن والا اور دوطرفہ انصاف کا قانون ہے۔اس کے سوا کسی کو ورثہ سے محروم کرنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ ورنہ یہ حدیث قرآنِ کریم کے دائمی قانون سے متصادم ٹھہرے گی جبکہ اصولی بات یہ ہے کہ حدیث کسی طرح بھی قرآنِ کریم سے نہیں ٹکرا سکتی۔جب حدیث میں واضح طور پر احکام ملتے ہوں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو بھی قبول کریں اور کوئی ایسی صورت نکالیں جس سے ظاہری تضاد اور تصادم دور ہو۔لیکن یہ گستاخی ہو گی کہ کہا جائے کہ ہم قرآن کو قبول کریں گے اور حدیث کو چھوڑ دیں

گے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہو گا کہ حدیث تھی تو سچّی مگر ہم نے اسے غلط قرار دے دیا۔ گویا رسول اللہ ﷺ کو نعوذ باللہ قرآن کریم کا علم نہیں تھا یا نعوذ باللہ آپؐ نے قرآن کریم کے خلاف بات کی تھی۔ ایسا خیال کرنے والا تو عملاً اپنا تعلق رسول اللہ ﷺ سے کاٹ لے گا۔ لہٰذا نہ تو اس کا تعلق رسولؐ سے باقی رہے گا نہ قرآن سے۔

لہٰذا دوسری صورت یہ ہے کہ چونکہ حدیثِ نبویؐ قرآنِ کریم سے متضاد ہو سکتی ہے نہ متصادم۔ اس لئے ایسی بات کو جو قرآن کریم سے ہر حال میں ٹکرا رہی ہو، اس بنیاد پر ردّ کر دیا جائے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا کلام نہیں ہو سکتا۔

یا پھر تیسری صورت یہ ہے کہ حدیث کے وہ معنے تلاش کئے جائیں جن کی رُو سے بظاہر نظر آنے والا تضاد دور ہو جائے اور اس کا مفہوم عین قرآنی منشاء اور مفہوم کے مطابق ہو جائے۔ یہ طریق ہے جو سب سے صحیح اور قرینِ تقویٰ ہے۔

یہ ایک اصولی اور حقیقی صورتحال کی بحث تھی۔ لیکن کتاب 'الصارم.....' میں وراثت کے مسئلے کے ساتھ گالیوں کی معافی کو جوڑ کر یہ جو لکھا گیا ہے کہ " اسی طرح اس سے ان گالیوں کا بھی محاسبہ نہیں کیا جائے گا جو اس سے دورِ جاہلیت میں صادر ہوئیں، بنابریں ان لوگوں کو معاف کر دیا جائے گا۔" قیاس مع الفارق ہے۔ بھلا جائیداد یا وراثت کا گالیوں سے تعلق ہی کیا ہے؟ جائیدادوں اور گالیوں کا آپس میں کوئی جوڑ اور ناتا نہیں ہے۔ ان کو ایک دوسرے پر پیش کر کے ایک نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ وراثت کا قانون قرآنی اصولوں اور قوانین میں بندھا ہوا ایک معیّن اور حسابی اصول ہے۔ جبکہ گالی ایک لسانی اور جذباتی معاملہ ہے جس کی وراثت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے۔ وراثت ایک سچائی ہے اور انسانی حقوق کا محکم انسانی اور قرآنی قانون ہے جبکہ

گالی جھوٹ کی کوکھ سے جنم زدہ قابلِ ردّ چیز ہے۔ بلکہ گالی کا معنیٰ ہی ایسی بُری بات ہے جو خلافِ واقعہ ہو۔

دراصل قتلِ شاتم کے مدّعی ایک دفعہ غلط موقف کے پیچھے چلے ہیں کہ شاتمِ رسول کو قتل کیا جائے گا۔ مگر جب دوسری جانب انہیں یہ منظر دکھائی دیتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کثرت کے ساتھ بلکہ مجموعی طور پر ہی اصل شاتمین کو معاف کر دیا تھا تو اپنے اس مؤقف کو سچّا ثابت کرنے کے لئے ان واقعات کی ایسی ایسی توجیہات ڈھونڈھتے ہیں جن کا ان سے کوئی جوڑ ہے نہ آپس میں کوئی نسبت۔

علاوہ ازیں جہاںتک مستند روایات اور صحیح ترین تاریخی ریکارڈ کا تعلق ہے وہ ہمیں یہ قطعی ثبوت مہیّا کرتا ہے کہ کفّارِ مکہ کو فتح مکہ کے روز یہ معافی بیعت سے یعنی ان کے قبول اسلام سے پہلے عطا کی گئی ہے۔ یہ تو آنحضرت ﷺ کا واضح ارشاد ہے کہ اسلام قبول کرنے سے گزشتہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لٰہذا تمام گالیاں بلکہ تمام کفریہ اور شرکیہ باتیں بھی معاف ہو جاتی ہیں۔ مگر یہاں یہ بھی تو ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ یہ معافی ان لوگوں کے قبول اسلام سے قبل دی گئی تھی۔ اس سے آفتابِ نصف النہار کی طرح یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ بیعتِ اسلام سے پہلے بھی شاتمین کو معاف کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سے اجماع کا دعوٰی بھی ازخود پاش پاش ہو جاتا ہے۔

فتح مکہ کے منظر کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ اس وقت وہاں کے سارے مکین مسلمان نہیں تھے۔ رئیسِ مکّہ صفوان بن امیہ اور مکّے کے کم و بیش دو سو مشرک غزوۂ حنین میں اسلامی لشکر میں شامل تھے۔ مکّے کے لوگ عام طور پر اور رؤسائے قریش خاص طور پر آنحضرت ﷺ کی توہین و تنقیص کے مبیّنہ مجرم تھے۔ انہیں تو آناً فاناً قتل کیا جاسکتا تھا۔ لیکن نہیں کیا گیا۔ اس کی

بنیادی اور حقیقی وجہ یہی تھی کہ اسلامی شریعت میں شاتمِ رسول کو قتل کرنے کا عقیدہ موجود ہی نہیں ہے۔

یہاں یہ بھی غور طلب بات ہے کہ مکّے میں جن دو تین افراد کو قتل کیا گیا تھا انہیں بھی کتاب 'الصارم......' کے بیان کردہ اسی وراثت والے اصول سے منسلک اصول کہ " اسی طرح اس سے ان گالیوں کا بھی محاسبہ نہیں کیا جائے گا جو اس سے دورِ جاہلیت میں صادر ہوئیں، بنا بریں ان لوگوں کو معاف کر دیا جائے گا۔" کے تحت معاف کیوں نہ کیا گیا۔ الصارم...... کے اس قانون کا جس مقام پر اطلاق ہوا ہے، یہ مقتولین بھی تو وہیں پر تھے مگر ان پر اس اصول کا اطلاق کر کے ان کی جان بخشی نہیں کی گئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب 'الصارم.....' میں پیش کی گئی دلیل کوئی دلیل نہیں ہے، ایک خود ساختہ جواز ہے جس کی بنیاد محض ابہام پر ہے یا خود تضادی پر۔ اگر یہ ایک سنجیدہ دلیل تھی تو ان تین مقتولوں کے معاملے کو حل کیا جانا چاہئے تھا۔

اس کے بعد مکرّر وراثت والے مسئلے کی جانب لوٹتے ہیں۔ چنانچہ الصارم..... میں لکھا ہے "اگرچہ یہ حکم ابو طالب کی وفات کے بعد نازل ہوا، چونکہ ترکہ اس وقت تک تقسیم نہیں ہوا تھا اس لئے اسے اسلامی احکام کے مطابق تقسیم کیا جاسکتا تھا۔ لہٰذا رسول کریم ﷺ نے واضح کیا کہ جعفر اور علی کو ابو طالب کی وراثت سے حصہ طلب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگرچہ جائیداد موجود ہو اور جب ان سے فی سبیل اللہ لی گئی تو اب وہ اسے کیونکر واپس لے سکتے ہیں۔"

اس بات کو پرکھنے کا ایک زاویہ تاریخوں کا حساب بھی ہے۔ اس مسئلے کا مکمل اور تفصیلی منظر یہ ہے کہ حضرت جعفرؓ 5 نبوی میں حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ ابو طالب کی وفات اس کے پانچ سال بعد 10 نبوی میں ہوئی۔ ابو طالب کی جائیداد تقسیم ہوئی یا نہیں ہوئی، اس کا ہمارے پاس

کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ لیکن ابو طالب کی وفات کے وقت حضرت علیؓ وہیں مکّے میں مقیم تھے اور ظاہر ہے کہ اپنے والد والے موروثی گھر میں ہی مقیم تھے۔ یعنی انہوں نے اپنا حق لئے بغیر وہ جائیداد مدینے ہجرت کے ساتھ چھوڑ دی۔ ادھر حضرت جعفرؓ کی حبشہ سے واپسی تقریباً پندرہ سال بعد 7ھ میں مدینے میں ہوئی اور ایک سال بعد آپؓ جمادی الاوّل 8ھ میں جنگِ مؤتہ میں شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے تقریباً چار ماہ بعد رمضان المبارک 8ھ میں مکّہ فتح ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان کہ "مؤمن کافر کا وارث نہیں ہو گا اور کافر مؤمن کا وارث نہیں ہو گا" فتحِ مکہ کے موقعے کا ہے۔ اس وقت حضرت جعفرؓ موجود نہیں تھے۔ 'الصارم.....' کا مذکورہ بالا تحریر میں حضرت جعفرؓ کو حضرت علیؓ کے ساتھ جائیداد کے مطالبے کے معاملے میں اکٹھا کرنا بتاتا ہے مصنّف کو اس تاریخی ترتیب، واقعات اور حقائق کا علم نہیں تھا۔ لہٰذا محض ایک مفروضے پر وہ بنیاد قائم کی ہے جس کے نیچے زمین ہی کوئی نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے بعد مکّے میں عقیل نے ابو طالب کی جائیداد کو ہی غصب نہیں کیا تھا بلکہ آپؐ کی موروثی جائیداد کو بھی فروخت کر دیا تھا جس کا آپؐ نے ذکر فرمایا تھا۔ اس موقعے پر آپؐ جو فیصلہ فرماتے، فاتح ہونے کی وجہ سے اسے نافذ کرنے میں کوئی دقّت نہ تھی۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ مکّے میں تو کفارِ مکّہ نے مسلمانوں کی جائیدادیں اور اموال غصب کئے تھے، لیکن ہجرت کرنے والے مسلمانوں نے تو ان کے اموال غصب نہیں کئے تھے۔ چنانچہ ان سے یہ چھینی ہوئی جائیدادیں اور لوٹے ہوئے اموال واپس لینا چنداں مشکل نہ تھا۔ مسلمان غالب تھے اور اہلِ مکّہ مغلوب۔ اس منظر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فیصلہ کہ " مؤمن کافر کا وارث نہیں ہو گا اور کافر مومن کا وارث نہیں ہو گا۔" رحمت کا ایک ایسا فیصلہ تھا جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ یعنی جو مسلمان کفّارِ مکہ کے جبر و تشدّد کا نشانہ بنتے رہے اور وہاں انہیں ان کی ہر

مراد سے محروم کیا گیا تھا، آج وہ اپنی جائیدادوں کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے محبوب و محسن آقا و مولیٰ ﷺ کی ایک آواز پر سب حق چھوڑ رہے تھے۔ خود آپؐ بھی نمونہ پیش کرتے ہوئے اپنا حق عقیل کے لئے چھوڑ چکے تھے۔ آپؐ کے ایک اشارے پر حضرت علیؓ نے بھی اپنا حق چھوڑ دیا تھا اور اسی طرح دیگر صحابہؓ میں سے بھی جس کا کوئی حق مکّے میں بنتا تھا، اس نے بھی وہ سب چھوڑ دیا۔

یہ بھی عفو و درگزر اور کرم و احسان کی ایک ایسی حسین ادا تھی جس نے نہ صرف قریشِ مکّہ کے بلکہ سارے عرب کے دلوں کو اسلام کے، آپؐ کے اور خالقِ حقیقی کے قدموں میں لا ڈالا تھا۔

افسوس ہے کہ ایسے دلکش اور حسین مضمون کو کتاب 'الصارم.....' میں سبّ و شتم کے چکر میں الجھا کر تار تار کر دیا گیا ہے۔ سبّ و شتم کی سزاؤں کے جھوٹے ذخیرے جمع کرنے کی بجائے اگر رسول اللہ ﷺ کی ان احسان خیز فیصلوں اور رحمت افزا نمونوں کے حقیقی اور سچے مجموعے تیار کئے جاتے تو دنیا اس محسنِ انسانیت (ﷺ) کی طرف اڈتی چلی آتی، بالکل اسی طرح جس طرح مکّے کے ظالم آپؐ کے حسن و احسان کی تجلّیات کے مشاہدے کر کے ایک دوسرے سے بڑھ بڑھ کر اپنے دلوں کو آپؐ کے قدموں پر ڈال رہے تھے۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کتاب ''الصارم'' کے یہ استدلالات خلافِ حقیقت، خلافِ قرآن اور خلافِ سنّتِ رسولؐ ہیں۔ لہٰذا اس کتاب کو اپنے عقائد کی بنیاد بنانا ایک جھوٹا اقدام ہے۔

ذوالخویصرہ اور کتاب 'الصارم.....'

اسلامی تاریخ میں ذوالخویصرہ نامی ایک شخص اپنے مذموم کردار کی وجہ سے مشہور ہے جس کا ذکر روایات میں متعدد بار آیا ہے۔ یہ بنو تمیم قبیلے کا ایک فتنہ پرداز اور گستاخ شخص تھا جس نے غزوۂ حنین سے واپسی پر جعّرانہ کے مقام پر آنحضرت صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر اموال کی تقسیم کے سلسلے میں بے انصافی کا الزام لگایا تھا۔ وہ آپؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جو کچھ آپؐ نے آج کیا ہے وہ اس نے دیکھا ہے۔ آپؐ نے اس سے پوچھا: ''تو نے کیا دیکھا ہے؟'' وہ کہنے لگا کہ آج آپؐ نے انصاف نہیں کیا۔ آپؐ نے فرمایا: '' تم پر افسوس۔ اگر میں انصاف نہ کروں گا تو دنیا میں اور کون ہے جو انصاف کرے گا۔ اگر میں نے انصاف نہیں کیا پھر تو تُو خائب و خاسر ہو گیا۔'' اس کی اس گستاخی پر صحابہؓ غیرت وغصّے میں اٹھے۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے تو یہ بھی عرض کی: ''یارسول اللہ! مجھے اجازت دیں میں اس کی گردن اُڑا دوں۔'' آپؐ نے فرمایا: ''دَعْهُ فَإِنَّ لَهُ أَصْحَابًا يَحْقِرُ أَحَدُكُمْ صَلَاتَهُ مَعَ صَلَاتِهِمْ، يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيَهُمْ ،يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّيْنِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ''۔ (بخاری کتاب المناقب باب علامات النبوّۃ و مسلم کتاب الزکوٰۃ باب ذکر الخوارج وصفاتھم و مسند احمدؒ مسند المکثرین من الصحابہؓ مسند ابی سعید خدریؓ) ''اس کو رہنے دو، کیونکہ اس جیسے اور بھی اس کے ساتھی ہیں۔ تم ان کی نمازوں کے مقابل پر اپنی نمازوں کو اور ان کے روزوں کے مقابل پر اپنے روزوں کو حقیر جانو گے۔ یہ قرآن بہت پڑھیں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ یہ دین سے اس طرح نکلیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے (یا تیر شکار کے پار ہو جاتا ہے)۔''

یعنی یہ لوگ بظاہر دینی احکامات کی پابندی اور عبادات کی ادائیگی میں اس قدر غلوّ کریں گے کہ ان کے مقابل پر دوسرے لوگ اپنی عبادت کو کم اور ادنیٰ سمجھیں گے لیکن باطنی طور پر یہ ہدایت اور نور سے خالی ہوں گے۔ چنانچہ بعد میں یہ شخص اور اس کے قبیلے کے لوگ اس گروہ کے سرغنے بنے جو حضرت علیؓ کے زمانے میں فتنوں میں بنیادی کردار ادا کرنے والے تھے۔

کتاب 'الصارم.....' میں دیگر روایات کے ساتھ یہ بھی لکھاہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر حضرت عمرؓ کو یہ کہہ کر اس کی گردن اڑانے کی اجازت نہ دی تھی کہ "لوگ باتیں کریں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرواتے تھے۔"

یہاں انسان حیران ہوتا ہے اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفی ﷺ کے عفوو درگزر اور لطف و احسان کے دامن کی کائنات سے بھی ورے پھیلی ہوئی وسعتوں پر کہ ایک شخص کی فتنہ و شرّ خیز حالت کو چشمِ کشفی سے دیکھ بھی رہے ہیں مگر اسے چادرِ رحمت میں ڈھانپتے بھی چلے جاتے ہیں۔ آپؐ نے یہ فرما کر کہ "لوگ باتیں کریں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرواتے تھے۔" اسے اپنے گروہِ اصحاب سے باہر بھی نہیں نکالتے۔ سبحان اللہ۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

اس پر کتاب' الصارم.....' کا تبصرہ یہ ہے: "اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم لَمْ یَمْنَعْ عُمَرَ مِنْ قَتْلِہٖ اِلَّا لِئَلَّایَتَحَدَّثَ النَّاسُ اَنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ وَلَمْ یَمْنَعْہُ لِکَوْنِہٖ فِیْ نَفْسِہٖ مَعْصُوْماً۔" (جزء الاوّل: باب ما جری فی تقسیم غنائم حنین۔ صفحہ 123) کہ رسول اللہ ﷺ کے عمرؓ کو روکنے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ شخص بذاتِ خود معصوم الدّم ہے۔ بلکہ آپؐ نے صرف اس لئے روک دیا تھا کہ لوگ یہ مشہور کر دیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اپنی سند اور اصولِ درایت کے لحاظ سے یہ روایت کس درجے کی ہے؟ یہ بحث اپنی جگہ ہے مگر اس تبصرے کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ تھا تو واجب القتل مگر قتل نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی شہرت خراب نہ ہو۔ گویا ایک طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہر توہین کرنے والے کو قتل کیا جائے گا۔ وہ مرتد ہو جاتا ہے یا اس کا عہد ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا واجب القتل ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ واقعہ بھی پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کو قتل نہ کرنے کا ارشاد فرمایا تھا۔ اس قتل نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ایسا نہ ہو کہ لوگ آپؐ کے بارے میں یہ باتیں کریں کہ آپؐ لوگوں کو قتل کرواتے تھے۔ یعنی نعوذ باللہ اپنی رسالت کو بدنامی کے داغ سے پاک رکھنے کے لئے آپؐ نے عمرؓ کو منع کر دیا کہ وہ اس گستاخ کو قتل نہ کریں۔ اگر الصارم..... کی یہ دلیل تسلیم کر لی جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

1: کسی گستاخ کو قتل نہ کیا جائے کیونکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کا نام بدنام ہوتا ہے۔

2: یہ وجہ ہر زمانے کی طرح آج بھی قائم ہے کہ ایک مسلمان جب کسی کو توہین کی وجہ سے قتل کرتا ہے تو لوگ باتیں کرتے ہیں بلکہ اسے بکثرت شائع کرتے ہیں۔ اس لئے اس اصول کے تحت آج بہت زیادہ ضرورت ہے کہ کسی کو بھی اس وجہ سے قتل نہ کیا جائے۔

3: 'الصارم.....' اور اس نوع کی دیگر کتابوں میں ایسی روایات درج کی گئی ہیں جن کے مطابق آنحضرت ﷺ نے بعض لوگوں کو گستاخی اور توہین کی وجہ سے قتل کروایا تھا۔ 'الصارم......' میں قتل کرنے کی جتنی روایات پیش کی گئی ہیں، وہ یہ بتاتی ہیں کہ آپؐ نے نعوذ باللہ ہمیشہ اور مسلسل اپنے اس مذکورہ بالا قول کے صریحاً خلاف قتل کروائے۔ اس کتاب میں جتنی مثالیں بھی دی گئی ہیں وہ سب اس مذکورہ بالا نتیجے کے خلاف جاتی ہیں۔ ایسے متضاد دلائل یا مؤقف جہاں مضحکہ خیز ہیں وہاں ایسے واقعات کے ذکر سے لازماً رسول اللہ ﷺ کی بدنامی بھی ہوتی ہے۔

مستشرقین ایسے واقعات کو لپک کر لیتے ہیں اوران کے ذریعے آپؐ کو بدنام کرتے ہیں۔سارے عالم میں آپؐ کو نعوذ باللہ ظالم اور انسانی خون سے کھیلنے والا ثابت کرنے کی ان کی کوشش مسلسل جاری ہے۔اس ناپاک مہم میں ان کے ہتھیار یہی روایات ہیں جو 'اپنے ہی دوستوں' نے جمع کر کے پیش کی ہیں۔

4: 'الصارم ......' کے اس مذکورہ بالا تبصرے سے اصل اصول تو یہی قائم ہوا ہے کہ ضروری نہیں کہ شاتم یا گستاخ کو قتل کیا جائے۔مثلاً عبداللہ بن ابی بن سلول اور اس کے ساتھیوں نے آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی زوجہ مطہرہ کی نعوذ باللہ بدنامی اور تذلیل کی کوشش کی مگر وہ قتل نہیں ہوا بلکہ اپنی طبعی موت مرا۔اس کے قتل نہ کرنے کی کوئی بھی توجیہہ یا عذر تراش لیا جائے۔ تو اس سے اصل اصول تو یہی قائم ہوا کہ کسی بھی عذر سے ایسے شخص کو قتل نہیں کیا جائے گا۔

5: رسول اللہ ﷺ کا فرمان یہ ہے کہ لوگ باتیں نہ کریں کہ آپؐ اپنے لوگوں کو مرواتے تھے۔اپنے اس قول میں انتہائی واضح الفاظ میں آپؐ نے یہ بتایا ہے کہ آپؐ لوگوں کو ہرگز نہیں مرواتے تھے۔ مگر اس کے ساتھ حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ 'اپنے ہی دوست' کہتے ہیں کہ نہیں، آپؐ انہیں مرواتے تھے اور آپؐ نے انہیں واقعۃً مروایا۔اور اگر کوئی کسی کو مار دیتا تھا تو آپؐ اسے شاباش اور انعام واکرام سے نوازتے تھے یا کم از کم اسے کچھ نہ کہتے تھے اور مرنے والے کا خون رائیگاں قرار دے دیتے تھے۔پس رسول اللہ ﷺ اور ان لوگوں کے خیالوں میں بُعد المشرقین و المغربین ہے۔یہ لوگ در حقیقت خود رسول اللہ ﷺ کی بدنامی کا موجب بنتے ہیں۔دشمن جب دشمنی کی وجہ سے توہین کرنے کی یا بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی اس روش کو دشمنی پر تعبیر کر کے بے وقعت سمجھا جاتا ہے۔ مگر اصل توہین اور بدنامی وہ ہے جو خود پیروکار الٹے نمونے

اور جھوٹے موقف اختیار کر کے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے ان کے پیشوا یہ کہہ گئے ہیں کہ ۔

"امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں"

جیسا کہ پہلے عرض کی گئی ہے کہ کتاب الصارم میں متعدد روایات تحریر کی گئی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجو کرنے والوں یا شتم کرنے والوں کو عملاً اس طرح قتل کروایا کہ اسے اپنا دشمن قرار دے کر اس سے کفایت طلب کی ۔ گویا جب تک وہ قتل نہ ہو گیا، آپؐ کو چین نہ آیا۔ نعوذ باللہ

ذوالخویصرہ والی اس مذکورۃ الصدر روایت کے بارے میں بہت اہم بات یہ ہے کہ صحیح مسلم میں امام مسلم نے اسے "کتاب الزکوٰۃ باب ذکر الخوارج وصفاتھم" میں درج کیا ہے۔ آپؐ کے مطابق یہ شخص اور اس کے ساتھی خوارج کے بانی مبانی تھے۔ ان کی اسلام دشمنی بڑی واضح ہے۔ انہوں نے عملاً اسلام کی جمعیت کو بیحد نقصان پہنچایا ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کہ اسے قتل کرنے سے صحابہؓ کو روک دیا گیا تھا۔

اسی ضمن میں 'الصارم.....' میں ایک عنوان یہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ " كَانُوْا يَرَوْنَ قَتْلَ مَنْ عَلِمُوْا اَنَّهُ مِنَ الْخَوَارِجِ " کہ صحابہؓ خارجیوں میں سے جس کے بارے میں علم ہوتا اسے قتل کر دیتے تھے۔

اس عنوان کے تحت یہ واقعہ درج کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ الذّاریات، والمرسلات اور والنّازعات کے کیا معنے ہیں؟ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: "اپنے سر

پر سے کپڑا اتارو۔ جب دیکھا تو اس کے بال کانوں تک لمبے تھے، فرمایا: بخدا! اگر میں تمہارے بال منڈے ہوئے دیکھتا تو تمہارا سر اڑا دیتا۔"(الصارم صفحہ 128:)

'الصارم.....' میں دیئے گئے عنوان میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ صحابہؓ خارجیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ مگر تعجب ہے کہ ثبوت کے لئے جو واقعہ پیش کیا گیا ہے، اس میں کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ نہ ہی اس طرح کی کوئی مثال ہے کہ صحابہؓ میں سے کسی نے کسی ایسے حلیے والے کو قتل کیا تھا۔ یعنی خارجی جیسا حلیہ نہ رکھنے والے کو قتل نہ کرنا دلیل بن کس طرح سکتا ہے کہ صحابہؓ خارجیوں کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ پس یہ تو محض ایک مفروضہ ہے اس کے سوا اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کے برعکس مسلّمہ حقیقت یہ ہے کہ سوائے محارب فسادیوں کے یا لڑائیوں اور جھڑپوں میں لڑنے والے شخص کے قتل کے علاوہ عام گستاخوں، بدزبانوں یا خارجیوں وغیرہ کے قتل کا کوئی قانون نہیں تھا جس پر صحابہؓ عمل پیرا تھے۔

کتاب 'الصارم.....' کے مذکورہ بالا دعوے کی قلعی اس سے بھی کھل جاتی ہے کہ خارجیوں نے تو خروج ہی حضرت علیؓ کے دور میں کیا تھا۔ اس سے پہلے ان کا تو کوئی وجود نہیں تھا، نہ ہی ان کی کوئی علامت، کوئی نام یا گروہ وغیرہ تھا۔ لہٰذا حلیے کی تخصیص کی بات ہی بے معنیٰ ہے۔ پس حضرت عمرؓ والی اس روایت کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ خارجی کے قصّے والی یہ روایت لازماً جعلی ہے جو کتاب " الصارم" میں درج ہے۔

اس سارے مسئلے کے ساتھ جو بات اس کتاب میں نظر انداز کی گئی ہے، یہ ہے کہ عکرمہ مولیٰ حضرت ابن عباسؓ خارجی تھا۔ کتاب ' الصارم..... ' میں اس کا نام بار بار جپا گیا ہے اور اس سے بار بار روایات لی گئی ہیں۔ اس سے ہر قاری اس کتاب کے معیار کا بھی ایک اچھا اندازہ کر سکتا ہے۔ یہ بھی اس روایت کے جعلی ہونے کا ایک ثبوت ہے۔

حضرت عمرؓ کے واقعے والی اس روایت کے ساتھ اس کتاب میں یہ خوفناک تبصرہ بھی کیا گیاہے کہ "اِنَّ الۡعَفۡوَعَنۡ ذٰلِكَ كَانَ فِيۡ حَالِ الضُّعۡفِ وَالۡاِسۡتِئۡلَافِ" (زیرِ عنوان: كَانُوۡا يَرَوۡنَ قَتۡلَ مَنۡ عَلِمُوۡا اَنَّهٗ مِنَ الۡخَوَارِجِ۔ صفحہ 128) لوگوں کو اس لئے معاف کیا جاتا تھا کہ اسلام کمزور تھا اور لوگوں کی تالیف کی ضرورت تھی۔

اسے حکمت نہیں، مداہنت کہتے ہیں۔ زمین و آسمان شہادت دیتے ہیں کہ کسی بھی حالت میں اور کسی بھی دَور میں نہ اسلام کبھی کمزور تھا نہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی اصولوں کی سودا بازی کی تھی۔ آپؐ بفضلہٖ تعالیٰ و عونہٖ طاقتور تھے اور اسلام بھی طاقتور تھا۔ اسی لئے آپؐ اور صحابہؓ توہین اور سبّ و شتم پر عفو و درگزر کرتے تھے کیونکہ ہمیشہ طاقتور معاف کرتا ہے، کمزور معاف نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کمزور تو خود طاقتور کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

اسلام کے خوبصورت اصول 'تالیفِ قلوب' کا منظر بھی یہ نہیں ہے کہ یہ کمزوری کے باعث یا کمزوری کو چھپانے کے لئے کی جاتی ہے۔ یہ تو اسلام کا قوّت اور بالاتری کا ایک ممتاز اصول ہے۔ اس سنہری اصول کی وجوہات یا حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ کمزور اور ضرورتمند کی مدد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اس شخص کے معاملے کو کتاب 'الصارم.....' (باب "متی اضمر المنافقون النفاق" صفحہ 154:) میں آگے جا کر پھر پیش کیا گیا ہے اور وہاں مسلم کی یہ روایت بھی پیش کی گئی ہے کہ حضرت خالدؓ نے کہا: یا رسول اللہ! کیا میں اس کی گردن نہ اڑا دوں؟ فرمایا: "نہیں، ممکن ہے یہ نماز پڑھتا ہو"، خالدؓ نے کہا: "بہت سے نمازی ایسی بات کہتے ہیں جو اُن کے دل میں نہیں ہوتی۔" اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مجھے اس بات کا حکم نہیں دیا گیا کہ میں لوگوں کے دل چیر کر اور بطن پھاڑ کر دیکھا کروں۔" (مسلم کتاب الزکوۃ باب ذکر الخوارج و صفاتھم)

رسول اللہ ﷺ کا یہ کیسا اعلیٰ جواب ہے جو سونے کے حروف سے لکھا جانے والا اور ہیروں سے سجایا جانے کا حقدار ہے۔ اس میں آپؐ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بتادیا ہے کہ

☆ کسی کے دل کے حالات کو کوئی نہیں جان سکتا جب تک کہ وہ خود انہیں ظاہر نہ کرے۔ اس لئے یہ سوچ کر کہ فلاں ایسا ہو گا، کسی قسم کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

☆ کسی کے ایمان کے بارے میں کوئی دوسرا شخص فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود اپنے ایمان یا عدمِ ایمان کا اظہار یا اعلان نہ کرے۔

☆ کسی کو کوئی مرتد قرار نہیں دے سکتا جب تک کہ مرتد خود اپنے ارتداد کا اظہار یا اعلان نہ کرے۔

☆ فتویٰ صرف قول یا فعل کے ظاہر پر ہی لگ سکتا ہے۔

☆ جس کے بارے میں خیال بھی ہو کہ وہ نماز پڑھتا ہو گا، اسے بھی قتل کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ کجا یہ کہ جو نماز پڑھ رہا ہو اسے قتل کیا جائے۔

مگر افسوس ہے کہ ان کتابوں کی تشہیر کرنے والے یہ سب 'جرائم' رسول اللہ ﷺ ہی کا نام لے کر کرتے ہیں یا انہیں آپؐ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور زمین کو بے گناہوں اور معصوموں کے قتل سے اور ان کے خون سے رنگتے چلے جاتے ہیں۔

شارعِ اسلام ﷺ کی پیش فرمودہ تعریفِ مسلم:

مذکورہ بالا روایت میں جو جواب رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو دیا ہے، ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کا اظہار آپؐ نے ایک سے زائد مرتبہ فرمایا ہے۔

چنانچہ ذیل میں تین اقتباس پیش کئے جارہے ہیں۔ جن سے الم نشرح ہے کہ کسی کے اسلام سے کوئی دوسرا انکار نہیں کر سکتا۔ یعنی کوئی دوسرے شخص کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا وہ فیصلہ ہے جو امن و سلامتی کے قیام، روحِ کافر گری کے قلع قمع اور امّت سے کشت وخون کی روک تھام کے لئے ایک انتہائی کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے مدینے میں مردم شماری کے وقت ہر اس شخص کو مسلمان شمار فرمایا جو اپنی زبان سے صرف یہ اظہار کرتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا:

''اُكْتُبُوْا لِي مَنْ تَلَفَّظَ بِالْاِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ'' (بخاری کتاب الجہاد باب کتابۃ الامام الناس۔ مسلم کتاب الایمان باب الاستسرار بالایمان للخائف) کہ میرے لئے ہر اس شخص کا نام لکھ دو جو اپنے منہ سے مسلمان ہونے کا اظہار کرتا ہے۔

پھر آپؐ نے ہر اس شخص کو مسلمان شمار فرمایا ''مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَ اَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَ ذِمَّةُ رَسُوْلِهِ فَلَا تُخْفِرُوْا اللّٰهَ فِيْ ذِمَّتِه۔'' (بخاری کتاب الصلاۃ باب فضل استقبال القبلۃ) کہ جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلے کو اپنا قبلہ قرار دے، ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مسلمان ہے۔ ایسے شخص کی حفاظت کرنا خدا اور اس کے رسول کے ذمّے ہے۔ پس تم اے مسلمانو! خدا کے ذمّے کو ہرگز نہ توڑنا۔

یعنی ایسی تاکید فرمائی کہ ان صفات یا اعمال والا شخص ایسا مستند مسلمان ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (ﷺ) اس کی اور اس کے اسلام کی ضمانت دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے۔

علاوہ ازیں ایک واقعہ ایسا بھی ظہور میں آیا جو رسول اللہ ﷺ کے اس جواب سے بالکل مشابہ تھا جو آپؐ نے ذوالخویصرہ کے بارے میں حضرت خالد بن ولیدؓ کو ارشاد فرمایا تھا۔

چنانچہ وہ واقعہ 7ھ کا ہے۔ جب مَیْفَعَہ کے سرِیّے میں کفّار شکست کھا کر بھاگ گئے تو حضرت اسامہ بن زیدؓ اور آپؐ کے ایک انصاری ساتھی کو میفعہ کا ایک شخص نَہِیک بن مرداس (بعض کتبِ تاریخ نے یہ نام مرداس بن نہیک بیان کیا ہے) اپنی بکریاں لے کر ایک پہاڑی پر چڑھتا نظر آیا۔ انہوں نے اسے جالیا اور جب اسے مارنے لگے تو اس نے جھٹ سے کلمہ طیّبہ پڑھ لیا۔ یعنی اپنی زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کر لیا۔ یہ سن کر وہ انصاری تو پیچھے ہٹ گئے مگر حضرت اسامہؓ نے اس پر وار کیا اور اسے قتل کر دیا اور اس کی بکریاں قبضے میں کر لیں۔ انہوں نے مدینے پہنچ کر جب آنحضرت ﷺ کو اس واقعے کی تفصیل بتائی تو آپؐ کا دل افسوس سے چھلک گیا۔ حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا:

”مَنْ لَّکَ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ؟ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! اِنَّمَا قَالَھَا مَخَافَۃَ السِّلَاحِ۔ قَالَ أَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِہٖ حَتّٰی تَعْلَمَ مِنْ أَجْلِ ذٰلِكَ قَالَھَا أَمْ لَا۔ مَنْ لَّکَ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ؟ فَمَا زَالَ یَقُوْلُھَا حَتّٰی وَدِدْتُّ أَنِّیْ لَمْ أُسْلِمْ اِلَّا یَوْمَئِذٍ“ (ابوداؤد کتاب الجہاد باب علیٰ مایقاتل المشرکین وزرقانی ذکر خمس سرایا قبل موتہ)

ترجمہ: ”اے اسامہ! قیامت کے روز لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کے مقابل پر تیرا کون مددگار ہوگا؟ میں نے عرض کی: یارسول اللہ! ”اس نے تو تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا۔“ آپؐ نے (غم سے بھر کر) فرمایا: ”تو نے اس کا دل کیوں نہ چیر دیکھا کہ تجھے علم ہو جاتا کہ اس نے تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا یا اس کے بغیر۔ قیامت کے روز لَآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ کے مقابل پر تیرا کون مددگار ہوگا؟“

اسامہؓ کہتے ہیں: ''آنحضرت ﷺ یہ دوہراتے جاتے تھے یہاںتک کہ میں نے یہ خواہش کی کہ کاش میں اس روز تک مسلمان ہی نہ ہوا ہوتا۔''

اس واقعے میں ایک غیر معمولی تاکید کا منظر ہے جو یہ خوبصورت اور دائمی تعلیم پیش کرتا ہے کہ اگر کوئی اپنے مسلمان ہونے کا جہراً اقرار کرے تو رسول اللہ ﷺ نے کسی کو اسے ردّ کرنے کا حق نہیں دیا۔ اسے تسلیم کرنا ضروری ہے خواہ وہ یہ اعلان کیسے ہی حالات میں کر رہا ہو۔ دل کے حالات تو صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے لیکن فتوٰی ہمیشہ ظاہر پر ہی قرار پاتا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کا اظہار بتکرار رسول اللہ ﷺ نے یہاں ذوالخویصرہ والے قصے میں بھی فرمایا ہے۔

بالفاظ دیگر جب انسان کسی کی زبان سے اسلام کے اقرار کو ردّ کر کے اس کے دل کے ارادوں کو جاننے کا دعوٰی کرتا ہے تو اس کا یہ فعل دعوٰئے خدائی یا خدائی اختیارات کو ہاتھ میں لینے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) نے ایسے خیالات یا فیصلوں کی اسلامی تعلیم میں کوئی گنجائش نہیں رکھی۔

عبد اللہ بن ابیّ بن سلول کا معاملہ:

کتاب 'الصارم.....' میں رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابیّ بن سلول کا قصہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جب اس نے خود کو مدینے کا معزّز ترین شخص قرار دے کر کہا تھا کہ وہ مدینے سے ذلیل ترین شخص کو نکال دے گا۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں ذلیل ترین گستاخی تھی جس نے جذباتی لحاظ سے صحابہؓ کے دلوں کو چیر کر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے آپؐ سے اس کے قتل کی اجازت چاہی مگر آپؐ نے یہ کہتے ہوئے اس کی اجازت نہ دی کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو مدینے میں بہت سے لوگ اس کی ہمدردی میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ نیز آپؐ نے فرمایا: '' لِئَلَّا يَتَحَدَّثَ النَّاسُ اَنَّ

مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ'' تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ باتیں کریں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس فیصلے، اس سلوک اور اس ارشاد پر 'الصارم۔۔' میں یہ تبصرہ تحریر ہے کہ

''فَعَلِمَ اَنَّ مَنْ آذَی النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم بِمِثْلِ ھٰذَا الْکَلَامِ جَازَ قَتْلُہٗ۔وَاِنَّمَا تَرَکَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم قَتْلَہٗ لَمَّا خِیْفَ فِیْ قَتْلِہٖ مِنْ نُفُوْرِ النَّاسِ عَنِ الْاِسْلَامِ لَمَّا کَانَ ضَعِیْفا۔'' (زیر عنوان 'ما جری فی تقسیم غنائم حنین۔ صفحہ:123) ترجمہ: پس معلوم ہوا کہ جو رسول اللہ ﷺ کو اس طرح کلام سے اذیّت پہنچائے، اس کا قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے اسے اس خوف کی وجہ سے قتل نہ کیا کہ لوگ اسلام سے بدک جائیں گے جبکہ اسلام ضعف میں تھا۔

یہ ایک انتہائی کمزور اور بودی دلیل ہے اور بتکرار پیش کی جاتی ہے۔ 'الصارم.....' کا یہ استدلال کسی طور پر اور کسی قیمت پر درست نہیں مانا جا سکتا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نعوذ باللہ نعوذ باللہ دل میں کوئی منافقت رکھنے والے یا مداہنت کرنے والے تو نہیں تھے کہ بنیادی اصولوں کا کسی انجانے خوف کی وجہ سے سودا کر لیتے تھے۔ پس یہ دلیل اپنی تمام تر نامعقولیت کی وجہ سے بیک جنبشِ قلم ردّ کئے جانے کے لائق ہے۔

اس کے برعکس یہاں بھی رسول اللہ ﷺ کی ردائے عفوو درگز اور لطف و احسان کی وسعت ملاحظہ فرمائیں کہ گستاخیوں میں اخلاق و شرافت کی تمام حدود پھلانگ جانے والے شخص کو بھی ''لِئَلَّا یَتَحَدَّثَ النَّاسُ اَنَّ مُحَمَّدًا یَقْتُلُ اَصْحَابَہٗ'' فرما کر اپنے اصحاب میں شامل رکھتے ہیں۔اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

لیکن آنحضرت ﷺ کے اس کلام کے پیش نظر ایک انتہائی اور اہم قابلِ غور بات یہ ہے کہ آپؐ کے رُخِ انور کو اور اسلام کے حسین اور پاک چہرے کو ہر ایسے فعل کی گرد سے بچانا ضروری ہے جو مذہب کی مبادیات کے خلاف ہونے کی وجہ سے اسے داغدار کر دے۔ آپؐ کی تعلیم اور اسلام کی شریعت کے اندر ایک کشش ہے جو قربانیوں پر استوار ہے اور جذبات کی انگیخت سے پاک ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا عبد اللہ بن ابیّ بن سلول سے سلوک یا اس کے بارے میں آپؐ کا یہ فیصلہ 'الصارم...... 'میں مذکور قتلِ شاتم والے نظریئے کا بذاتِ خود ردّ ہے۔ 'الصارم' کا یہ استدلال چونکہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے اور ارشاد سے براہِ راست متصادم ہے اس لئے یقیناً قابلِ ردّ ہے۔

الصارم کی اسی عبارت میں اسے قتل نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے: "لَمَّا كَانَ ضَعِيْفاً" کہ اس وقت اسلام ابھی کمزوری کی حالت میں تھا۔

یہ دلیل بھی واضح طور پر خلافِ حقیقت اور خلافِ حق ہے۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں پیش کردہ واقعات و حقائق ثابت کریں گے کہ نہ اسلام کسی وقت کمزور تھا نہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو اپنی تمامتر زندگی میں کبھی کسی قسم کا خوف لاحق ہوا تھا۔ یہ فقرہ تو اسلام کے دشمنوں کی یا اسلام کے 'اپنے دوستوں' کی دلیل ہے۔ جو بیک نوکِ قلم لائقِ ردّ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اسے درگزر کرنا آپؐ کی قوّت اور آپؐ کے جبروت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ ہر نوع کی مقدرت رکھتے ہوئے بھی دوسروں کو معاف فرماتے تھے۔

جہاں تک اس مذکورۃ الصدر واقعے کے زمانے کا تعلق ہے تو یہ غزوۂ بنی مصطلق سے واپسی کے وقت یعنی ماہِ شعبان 5 ھ کا ہے۔ اس واقعے سے قبل غزوہ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ بنی مصطلق جیسے بڑے بڑے معرکوں کے علاوہ دیگر متعدد چھوٹے چھوٹے غزوات و سرایا میں مسلمان نمایاں

طور پر فتحیاب ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ بنو قینقاع کا واقعہ بھی ہو چکا تھا۔ نیز کعب بن اشرف وغیرہ کے واقعات بھی رونما ہو چکے تھے۔ ان تمام واقعات میں تو اسلام کو کسی کمزوری یا ضعف کا سامنا نہیں ہوا۔ پھر صرف ایک عبد اللہ بن ابیّ بن سلول کے قتل کے لئے اسلام میں کونسا ضعف پیدا ہو گیا تھا کہ جس کی وجہ سے بظاہر ایک نحیف اور معذرت خواہانہ رخ اختیار کرنا لابدّی تھا۔ ایسا دوہرا معیار اور دورُخی یا نام نہاد 'حکمتِ عملی' رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا بذاتِ خود آپؐ کی اور آپؐ کے منصب کی توہین ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دلیل جڑ سے ہی کھوکھلی ہے اور قطعی طور پر بودی اور جھوٹی ہے۔ ایسی ہی دلیلیں ہیں جنہیں اسلام دشمن عناصر ہاتھ لمبے کر کر کے لیتے ہیں اور انہی کو استعمال کر کے اسلام پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

پھر اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو ہر دوسری طاقت سے ہر زمانے میں طاقتور اور غالب تھے۔ اگر کمزوری کی وجہ سے ہی کسی کو قتل نہیں کیا گیا تو فتح مکّہ کے وقت تو کمزوری کوئی نہیں تھی۔ اس وقت صرف چند ایک کے سوا باقی سب شاتموں، توہین کے مرتکبوں، ہرزہ سراؤں، ظالموں، قاتلوں اور جابروں کو بیک جنبشِ زبان معاف کر دیا گیا۔ اصول تو بہر حال اصول ہوتا ہے۔ اگر اصول یہ ہے کہ شاتم کو ہر حال میں قتل کرنا ہے تو سوال یہ ہے کہ یہ اصول یہاں کیوں ترک کیا گیا؟

دنیا کا سب سے طاقتور انسان، محمد رسول اللہ ﷺ

جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر لکھا ہے کہ نہ اسلام کسی وقت بے طاقت تھا، نہ نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کسی پہلو سے کبھی کمزور تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جسے دنیا کی کوئی دلیل، کوئی منطق اور کوئی طاقت ردّ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اس سلسلے میں حسبِ ذیل حقائق ملاحظہ ہوں۔

ا :عفو کا حکم جب مکّے میں اسلام کی مخالفت اور آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے صحابہ پر ظلم و جبر انتہائی شدّت اختیار کر گیا تو ایک موقعے پر حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ چند اور صحابہؓ کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی : ”یارسول اللہؐ! ہم مشرک تھے تو ہم معزّز تھے۔ کوئی ہماری جانب آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ لیکن جب سے ہم مسلمان ہوئے ہیں کمزور اور ناتواں ہو گئے ہیں۔ ہمیں ذلّت کے ساتھ کفّار کے مظالم سہنے پڑتے ہیں۔ پس یارسول اللہؐ! آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم ظلم کرنے والے کفّار کا مقابلہ کر سکیں۔“ آپؐ نے جواباً فرمایا: ”اُمِرْتُ بِالْعَفْوِ۔ فَلَا تُقَاتِلُوْا“ کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عفو کا حکم ہے۔ پس میں تمہیں لڑنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

آنحضرت ﷺ کا یہ کلام ایک غیر معمولی غالب عظمت کا کلام ہے۔ ایک طرف آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کفار کے تمام ظلم و جبر برداشت کرتے چلے جارہے ہیں۔ جس سے بادی النظر میں یہی دکھائی دیتا ہے کہ انتہائی کمزوری کی حالت ہے، مگر دوسری طرف یہ فرماتے ہیں کہ عفو کا حکم ہے۔ یعنی معاف کرنے کا حکم ہے۔ یعنی آپؐ ایسی حالت میں ہیں کہ ان سب مخالفوں سے طاقتور اور ان پر غالب ہیں اور وہ آپؐ کے ہی رحم و کرم پر ہیں۔

معاف کرنے کی صلاحیّت ہمیشہ طاقتور میں ہوتی ہے۔ کمزور، شکست خوردہ اور ہارے ہوئے انسان کی دی ہوئی معافی اور عفو کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی؟ پس رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ”مجھے عفو کا حکم ہے، لہٰذا تمہیں مقابلے میں بھی لڑنے کی اجازت نہیں ہے،“ ایک عظیم الشان واقعاتی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمامتر طاقتوں کے مالک واحد و یگانہ خدا کی طاقت تھی۔ اس کے فرشتوں کی فوجیں تھیں جو انفرادی طور پر بھی آپؐ کے ہر دشمن کے لئے اور بحیثیت مجموعی بھی وہ آپؐ کے تمام دشمنوں کے لئے کافی

تھیں۔ آپؐ کے دشمنوں کی تباہی و بربادی صرف اور صرف آپؐ کے ایک اشارۂ ابرو کی منتظر تھی۔ یہ محض کوئی دعوٰی نہیں ہے بلکہ واقعات و شواہد سے تائید یافتہ ایسی ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ انسانیت کی اور انسان کے خون کی حفاظت کرنے والا اور ان کی ربوبیت کے لئے تڑپنے والا دل رکھتے تھے۔ آپؐ ان کی ہلاکت کے لئے نہیں، انہیں محفوظ کر کے اور زندگی دے کر خدائے واحد و یگانہ سے منسلک کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو کہ

۲: پہاڑوں کے فرشتے کی پیشکش شوّال 10 نبویؐ میں رسول اللہ ﷺ نے تبلیغ کے لئے عرب کے ایک بڑے شہر طائف کا سفر اختیار کیا۔ یہاں بنو ثقیف آباد تھے۔ ان کے رئیسِ اعظم عبد یالیل نے نہ صرف یہ کہ آپؐ کا پیغام نہ سنا بلکہ آپؐ کے پیچھے شہر کے اوباش اور آوارہ لوگ بھی لگا دیئے۔ انہوں نے آپؐ پر پتھر برسائے اور آپؐ کو سر تا پا لہولہان کر دیا۔ مسلسل تین میل تک یہ لوگ آپؐ کے تعاقب میں رہے اور گالی گلوچ کرتے اور پتھر برساتے رہے۔

یہاں سے مکہ واپس آتے ہوئے آپؐ کے پاس پہاڑوں کا فرشتہ آیا اور کہنے لگا: " اللہ تعالیٰ نے مجھے آپؐ کے پاس بھیجا ہے تا اگر ارشاد ہو تو میں پہلو کے یہ دونوں پہاڑ ان لوگوں پر پیوست کر کے ان کا خاتمہ کر دوں۔" آپؐ نے فرمایا: " ہرگز نہیں۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انہی لوگوں میں سے وہ لوگ پیدا کر دے گا جو خدائے واحد کی پرستش کریں گے۔"

یہ واقعہ گزر جانے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ محبوبِ کبریا حضرت محمد مصطفی ﷺ کمزور تھے اور اسلام ضعیف تھا۔ یہ واقعہ تو یہ ثابت کرتا ہے کہ آپؐ کے ساتھ قادرِ مطلق خدا کی وہ طاقت و قدرت تھی جو قوموں کو پلک جھپکنے میں پہاڑوں تلے دفن کر سکتی تھی۔ مگر آپؐ باجود اس طاقت پر ایک طرح کا اختیار رکھنے کے کسی انتقام کی بجائے انسانی خون کی حفاظت کرنے کو

اس لئے ترجیح دیتے تھے کہ آپؐ کو یہ امید تھی کہ آپؐ کے ذریعے ہلاکتوں سے محفوظ کردہ انسان ضرور خدائے واحد و یگانہ کی پرستش کی طرف مائل ہوگا۔ آپؐ انتہائی طاقتور ہونے کے باوجود عفوو درگزر اور صبر و رضا کو فوقیت دیتے تھے۔ اسی کا اظہار آپؐ نے فرمایا تھا کہ "اُمِرْتُ بِالْعَفْوِ۔ فَلَا تُقَاتِلُوْا۔"

۳: ابوجہل کا خوف پھر مکّے میں روز مرّہ ہونے والے واقعات بھی ثابت کرتے ہیں کہ باوجود ہر طرح کے جور و جبر کے آپؐ کے مخالف سردار آپؐ سے لرزاں تھے۔ مثلاً ایک دفعہ اراشہ نامی شخص مکے میں اونٹ بیچنے آیا۔ ابوجہل نے وہ اونٹ اس سے خرید لئے۔ مگر اونٹوں پر قبضہ لینے کے بعد قیمت ادا کرنے میں حیل و حجت کرنے لگا۔ اس پر اراشہ جو مکے میں ایک اجنبی اور بے یار و مددگار تھا، بہت پریشان ہوا۔ چند دن تک ابوجہل کی منت و سماجت کرنے کے بعد آخر ایک دن جبکہ بعض رؤساء قریش خانہ کعبہ کے پاس مجلس جمائے بیٹھے تھے، وہ ان لوگوں کے پاس گیا اور کہنے لگا: " اے معزّزین قریش! آپ میں سے ایک شخص ابوالحکم نے میرے اونٹوں کی قیمت دبا رکھی ہے۔ آپ مہربانی کر کے مجھے یہ قیمت دلوا دیں۔" قریش کو شرارت جو سوجھی تو کہنے لگے: " ایک شخص یہاں محمد بن عبداللہ نامی رہتا ہے تم اس کے پاس جاؤ۔ وہ قیمت دلا دے گا۔" ان کی اس سے غرض یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ تو بہر حال انکار ہی کریں گے اور اس طرح باہر کے لوگوں میں آپؐ کی سبکی ہوگی۔ جب اراشہ وہاں سے رخصت ہوا تو قریش نے اس کے پیچھے ایک آدمی کر دیا کہ دیکھو کیا تماشہ بنتا ہے۔ چنانچہ اراشہ اپنی سادگی میں آنحضرت ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا: " میں ایک مسافر ہوں اور آپ کے شہر کے ایک رئیس ابوالحکم نے میری رقم دبا رکھی ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ مجھے یہ رقم دلوا سکتے ہیں۔ پس آپ مہربانی کر کے مجھے میری رقم دلوا دیں۔" آپؐ فوراً اٹھے اور فرمایا: " چلو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" چنانچہ آپؐ

اسے لے کر ابو جہل کے مکان پر آئے اور دروازے پر دستک دی۔ ابو جہل باہر آیا تو آپؐ کو دیکھ کر ہکّا بکّارہ گیا اور خاموشی سے آپؐ کا منہ دیکھنے لگا۔ آپؐ نے فرمایا: " یہ شخص کہتا ہے کہ اس کے پیسے آپؐ کی طرف نکلتے ہیں۔ یہ ایک مسافر ہے آپ اس کا حق کیوں نہیں دیتے؟" اس وقت ابو جہل کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ کہنے لگا: " محمد! ٹھہرو، میں ابھی اس کی رقم لاتا ہوں۔" چنانچہ وہ اندر گیا اور اراشہ کی رقم لا کر اسی وقت اس کے حوالے کر دی۔

وہ آدمی، جسے انہوں نے اراشہ کے تعاقب میں بھیجا تھا، جب واپس رؤسائے قریش کے پاس آیا تو انہوں نے اس سے روئیداد سنی۔ اس آدمی نے انہیں بتایا: " واللہ! میں نے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا ہے اور وہ یہ کہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جا کر ابو الحکم کے دروازے پر دستک دی تو ابو الحکم نے باہر آ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا تو اس وقت اس کی حالت ایسی تھی کہ گویا ایک قالب بے روح ہے اور جونہی کہ اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ اس کی رقم ادا کر دو، اسی وقت اس نے اندر سے لا کر پائی پائی اس کے سامنے رکھ دی۔"

تھوڑی دیر کے بعد ابو جہل بھی اسی مجلس میں آ پہنچا۔ اسے دیکھتے ہی سب لوگ اسے طعنے دینے لگے کہ اسے کیا ہو گیا تھا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس قدر ڈر گیا۔ اس نے کہا: "خدا کی قسم! جب میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے دروازے پر دیکھا تو مجھے یوں نظر آیا کہ اس کے ساتھ لگا ہوا ایک مست اور غضبناک اونٹ کھڑا ہے اور میں سمجھتا تھا کہ اگر ذرا بھی چون وچرا کروں گا تو وہ مجھے چبا جائے گا۔" (سیرت ابن ہشام، جزو اوّل، صفحہ:258، 259 زیر عنوان ابو جہل والاراشی۔ الناشر مکتبہ التوفیقیہ الازھر مصر)

یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طاقت کا ترجمان ہے جو آپؐ کو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ یہ طاقت ایسی تھی جس کے سامنے دنیا کی ہر طاقت بے زور و بے حیثیت تھی۔

اس طاقت کو آپؐ کے مخالف اور آپؐ کے ارد گرد لوگ اچھی طرح محسوس و مشاہدہ کرتے تھے۔ چنانچہ بدر کی لڑائی کے لئے جب مکہ کے رؤساء اور جنگجو لوگ تیار ہوئے تو ابو لہب اور امیّہ بن خلف جو وہاں کے بڑے رؤساء میں سے تھے اور رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ پر تشدّد میں بھی پیش پیش تھے، جنگ میں جانے سے خوفزدہ بلکہ لرزاں تھے۔ آپؐ کا سامنا کرتے ہوئے انہیں جیسے موت سامنے کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ انہیں رسول اللہ ﷺ کی پیشگوئیوں کے باعث چڑھتے ہوئے سورج کی طرح یقین تھا کہ اگر وہ جنگ میں شامل ہوئے تو لازماً قتل ہوں گے۔

۴: آپؐ کے ہمراہ الٰہی طاقت کا ایک اور مظاہرہ 7ھ کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوۂ ذات الرّقاع سے واپس جانبِ مدینہ رواں تھے۔ راستے میں دوپہر ایک وادی میں پڑی۔ آنحضرت ﷺ قیلولے کے لئے یہیں اتر گئے۔ صحابہؓ بھی ستانے کے لئے درختوں کا سایہ تلاش کرتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ آپؐ نے ایک ببول کے درخت پر اپنی تلوار لٹکائی اور آرام فرمانے لگے۔ ابھی کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ ایک شخص آیا۔ اس نے آپؐ کی تلوار اتار لی۔ آپؐ بیدار ہو گئے۔ وہ شخص تلوار سونت کر کہنے لگا: " اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟" آپؐ نے فرمایا: "میرا اللہ۔" آپؐ کے اس جواب میں نصرت الٰہی کی کوئی ایسی تجلّی تھی کہ وہ آپؐ کے اس پرُاعتماد جواب کی ایسی خارق عادت ہیبت اس پر طاری ہوئی کہ وہ لرز گیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ آپؐ نے تلوار اٹھائی اور اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "اب مجھ سے تجھے کون بچا سکتا ہے؟" اس پر وہ آپؐ سے عفو و درگزر کی درخواست کرنے لگا اور آپؐ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔" اس نے جواب دیا: "میں یہ نہیں مانتا لیکن میں آپؐ سے یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ

آپؐ سے کبھی نہیں لڑوں گا اور نہ ان لوگوں کے ساتھ شامل ہوں گا جو آپؐ سے لڑتے ہیں۔'' آپؐ نے اسے چھوڑ دیا۔

حضرت جابرؓ بیان فرماتے ہیں کہ اس شخص نے واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہے جو دنیا میں سب سے بہتر ہے۔(بخاری کتاب المغازی غزوہ ذات الرقاع وکتاب الجہاد باب من علق سیفہ' والسیرۃ الحلبیۃ غزوۃ ذات الرقاع)

رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی ایسی خارق عادت تائید و طاقت کے ہوتے ہوئے یہ کس طرح گمان کیا جا سکتا ہے کہ نعوذ باللہ کبھی اسلام میں ضعف تھا یا آپؐ کمزور تھے۔ آپؐ نے ہمیشہ باوجود غالب، قوی اور با اختیار ہونے کے آپؐ پر جان لیوا حملے کرنے والے ہر دشمن کو بخش دیا اور یہاں مذکورہ بالا واقعے میں بھی ایسے ہی ایک جانی دشمن پر عفو و رحمت کا دامن وسیع کر دینا جو آپؐ پر قتل کے لئے تلوار سونت چکا تھا، آپ ؐکی عالمین کی وسعتوں سے وسیع تر رحمت کا عکّاس ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ ؐکو اگر کسی نے کبھی تکلیف پہنچائی تو آپؐ نے اس سے ہرگز انتقام نہیں لیا۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ یا اس کے محارم کی ہتک یا بے حرمتی کی جاتی تو پھر آپؐ اللہ تعالیٰ کی خاطر انتقام لیتے تھے۔(مسلم کتاب الفضائل باب مباعدتہٖ الاثام......)

رسول اللہ ﷺ کی طرف قتل و خون کی کہانیوں پر مشتمل جعلی اور وضعی روایتیں تراشنے والے اور ان روایتوں کو ہر ممکن سچا ثابت کرنے کی سعی کرنے والے اور انہیں آپؐ کی طرف منسوب کرنے والے کاش دیکھتے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ساری زندگی میں صرف معدودے چند افراد کے لئے سزائے موت کا اعلان فرمایا تھا۔ انہیں چاہئے تو یہ تھا کہ ان واقعات کے جواز میں قوی دلائل پیش کر کے ثابت کرتے کہ آپؐ کی تجویز کردہ ان سزاؤں کے پیچھے اللہ

تعالیٰ کے محارم کی بے حرمتی تھی یا قصاص تھا۔ یا پھر کوئی قومی جرائم تھے، جن کی پاداش میں انہیں یہ سزائیں سنائی گئی تھیں۔ مگر انہوں نے ان سزاؤں کو بھی اور ان کے ساتھ وضعی روایات کے ڈھیر کو بھی رسول اللہ ﷺ کی پاک سیرت کو داغدار کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور دنیا میں وہ کام کر دکھایا جو منشائے رسولؐ کے خلاف تھا۔ جس سے بچنے کے لئے آپؐ واضح طور پر اظہار فرما چکے تھے کہ ''لِئَلَّا يَتَحَدَّثَ النَّاسُ اَنَّ مُحَمَّدًا يَقْتُلُ اَصْحَابَه'' تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ یہ باتیں کریں کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔ مگر یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی اس سچّی اور پاک خواہش کے علی الرغم یہ ثابت کرنے کی کوششیں انتہاء تک پہنچا دیں کہ واقعۃً آپؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے تھے۔ انّاللہ وانّاالیہ راجعون

۵: ایک بڑی فوج کے مقابل پر تنہا غزوۂ حنین کے موقعے پر اسلامی لشکر بارہ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ یعنی اس میں دس ہزار وہی قدّوسی تھے جو فتحِ مکّہ کے لئے آپؐ کے ہمراہ تھے اور دو ہزار افراد مکّہ سے بھی شامل ہو گئے تھے۔ پہلے کبھی بھی اسلامی لشکر اتنی بڑی تعداد کو نہیں پہنچا تھا۔ اس کثرت کو دیکھ کر بعض لوگوں کو فخر بھی ہوا اور عُجب بھی۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا: ''لَنْ نَغْلِبَ الْيَوْمَ مِنْ قِلَّةٍ'' کہ آج ہم کم تعداد کی وجہ سے نہیں جیتیں گے۔ یہ ایک نخوت کا کلمہ تھا جو کسی کی زبان سے ادا ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ اظہار تھا کہ پہلے تو اسلامی لشکر کو کم تعداد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اب ہماری تعداد ہی اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر بھی ہم جیت جائیں گے۔ ایسا اظہار آنحضرت ﷺ کے مزاج اور فطرت کے قطعی خلاف تھا۔ چنانچہ لکھا ہے: ''فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَى النَّبِيّ صلی اللہ علیہ وسلم'' (ابنِ سعد و زرقانی غزوۂ حنین) کہ یہ کلمۂ عُجب آنحضرت ﷺ پر شاقّ تھا۔ اللہ تعالیٰ کو تکبّر ویسے ہی پسند نہیں اس لئے اسلامی لشکر میدانِ جنگ میں اس کے نتائج سے برَی نہ ہو سکا۔ اس کیفیّت کا ذکر کرتے ہوئے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَيَوْمَ حُنَيْنٍ لا إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ'' (التوبۃ:25) کہ حنین کا دن، جب تمہاری کثرت نے تمہیں عُجب میں مبتلا کر دیا تھا۔

اسلامی لشکر جب حنین کے میدان میں پہنچا تو اِرد گرد کمین گاہوں میں چھپے ہوئے دشمن کے تیر اندازوں نے دیکھا کہ وہ ان پر خوب بھرپور حملہ کرسکتے ہیں اور وہ عین ان کے نشانہ پر ہیں تو انہوں نے یکدم تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ اسی لمحے اس کی دیگر فوج نے بھی ان کے ساتھ یکجان ہو کر بھرپور حملہ کیا۔ مکّے کے نو مسلم جو اسلامی فوج میں افراد کی کثرت دیکھ کر اس میں شامل ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ آج بہادری کے جوہر دکھائیں گے، اس ناگہانی حملے سے بوکھلا گئے اور اس کی شدّت سے حواس باختہ ہو کر واپس مکّے کی طرف بھاگنے لگے۔ پرانے مسلمان تو اس قسم کے شدائد کے مقابلے کے عادی تھے۔ مگر دو ہزار نو مسلم اور ان کے ساتھ مشرک بھی جب سہ طرفہ پُر زور حملے سے اپنے گھوڑوں اور اونٹوں سمیت پلٹ کر بھاگے تو ان کی بھگدڑ کے باعث اصل اسلامی لشکر کے گھوڑے اور اونٹ بھی بدک گئے۔ اس طرح سارا لشکر ہی بھگدڑ کا شکار ہو کر پیچھے کی طرف بھاگا۔ صرف چٹانوں سے زیادہ مضبوط اور پہاڑوں سے زیادہ راسخ، آنحضرت ﷺ کی اولوالعزم ذات تھی جو نیزوں اور تیروں کی اس سہ رُخی بوچھاڑ میں پورے وقار کے ساتھ ایستادہ تھی۔ آپؐ دو زرہیں اور خَود پہنے ہوئے سفید خچر پر سوار، ڈھال تھامے ہوئے، براہِ راست خدا تعالیٰ کی حفاظت میں سینہ سپر تھے۔ آپؐ کے رنگ میں رنگین صحابہؓ بھی ہر حالت میں آپؐ پر جان نچھاور کرنے والے تھے۔ ان میں سے چند وہ تھے جو بھگدڑ کے ریلے میں کسی قدر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے لیکن چند ثانیوں میں ہی آپؐ کی طرف لپک آئے تھے۔ بعض وہ تھے جو سواریوں کی سرکشی کے باعث ان سے کُود کر فوراً آپؐ کے پاس پہنچ گئے تھے اور بہت سے وہ تھے جو سواریوں کو بزور موڑ کر آپؐ کے ارد گرد آنے کے لئے جدّوجہد میں تھے۔

اُدھر آنحضرت ﷺ بارش کی طرح برستے نیزوں اور تیروں میں بارہ ہزار میں سے چند جانثار صحابہؓ کے ساتھ کھڑے تھے۔ شروع میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عباس، حضرت ابو سفیان بن الحارث، ان کے بیٹے حضرت جعفر بن ابی سفیان، ابو سفیان کے بھائی حضرت ربیعہ بن حارث، حضرت اسامہ بن زید اور حضرت ایمن بن عبید رضی اللہ عنہم آپؐ کے پاس تھے۔ (ابن ہشام وزرقانی غزوۂ حنین)

تیروں کی اس موسلا دھار بارش سے بچاؤ کا بظاہر ایک ہی ذریعہ تھا کہ پیچھے ہٹ جایا جائے جہاں ایک تنگ راستہ تھا اور اس میں سے بھی ایک وقت میں چند آدمی ہی گزر سکتے تھے۔ اس کے سوا بچنے کا ہر راستہ مسدود بھی تھا اور پُر خطر بھی، لیکن یہی لمحہ تھا جو فیصلہ کن تھا۔ چنانچہ اسی لمحے رسول اللہ ﷺ نے بجائے بچاؤ کی راہ اختیار کرنے کے اپنی سواری کو ایڑ لگائی اور سرعت سے اس جانب مزید آگے بڑھنا شروع کر دیا جو تینوں جانب سے تیروں کے عین درمیان تھی۔ یہاں آپؐ نے ایک پُر جلال آواز کے ساتھ فرمایا:

”أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ   أَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبْ“

کہ میں ایک نبی ہوں، میں جھوٹا نہیں ہوں اور میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔ اس پُر جلال آواز میں پیغام تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا سچا نبی ہوں۔ اسی ناتے خدا تعالیٰ میری مدد بھی فرماتا ہے اور حفاظت بھی۔ اس میں ایک ذرّہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ دعویٰ آج میں نیزوں کی انیوں، تیروں کی نوکوں اور تلواروں کی دھاروں پر بلند کر رہا ہوں اور یاد رکھو اس وقت موت کے خطرناک مقام پر کھڑا ہو کر بھی دشمن کے حملے سے محفوظ ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے خدائی کا مقام دے دو۔ میں تو صرف ایک انسان ہوں اور تم جانتے ہو کہ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں اور خدا تعالیٰ کا ایک بندہ ہوں۔

آپؐ کے ساتھ کونسی طاقت تھی؟ اس کا اعلان آپؐ نے کچھ دنوں پہلے ہی یعنی فتح مکہ کے وقت بھی اور بعد میں حجۃ الوداع کے موقع پر بھی فرمایا تھا کہ

''لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، لَااِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَ نَصَرَ عَبْدَهٗ وَ هَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ'' کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ایک ہے۔ جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے کی نصرت فرمائی اور صرف اسی اکیلے نے تمام لشکروں کو شکست دی۔ (بخاری کتاب الحج باب من لم یقرب الکعبۃ) یعنی آپؐ کے ساتھ اللہ تعالیٰ تھا اور اسی کی طاقت تھی جس نے آپؐ کو ہر میدان اور ہر موقع پر فتح نصیب بنایا تھا۔

بہر حال حنین کے میدان میں اس اعلان کے بعد آپؐ نے حضرت عبّاسؓ کو بلایا۔ ان کی آواز بلند تھی۔ آپؐ نے فرمایا عبّاس! بلند آواز سے پکار کر کہو کہ اے میرے وہ ساتھیو! جنہوں نے حدیبیہ کے دن درخت کے نیچے بیعت کی تھی۔ اور اے وہ دوستو! جو سورۃ البقرہ کے زمانہ سے (یعنی اسلام کے بالکل ابتدائی زمانہ سے جب سورۃ البقرہ کا نزول ہوا) مسلمان ہو۔ خدا کا رسولؐ تم کو بلاتا ہے۔

آپؐ نے اپنی سواری سے نیچے اتر کر زمین سے مٹھی بھر کنکریاں لیں اور دشمن کی طرف پھینکیں اور فرمایا ''شَاهَتِ الْوُجُوْهُ'' کہ دشمنوں کے چہرے بگڑ جائیں، اب زوردار حملہ کرو اور دشمن پر خوب وار کرو۔ یہ آواز سنتے ہی صحابہؓ نے ٹوٹ کر ایسی بے خودی سے حملہ کیا کہ دشمن شکست کھا کر پسپا ہو گیا۔ (مسلم کتاب الجہاد باغزوۃ حنین و سنن الدارمی کتاب السیر)

رسول اللہ ﷺ کے پاک وجود میں اللہ تعالیٰ کی جو تجلّی اور طاقت غزوۂ حنین کے روز تھی اور جس کے ساتھ آپؐ اکیلے ہی ہر طاقت پر غالب تھے، وہی طاقت روزِ اوّل سے آپؐ کے شاملِ حال تھی۔ اس حقیقت کو جھٹلا کر آپؐ کے بارے میں ایسا تبصرہ کہ آپؐ نے کسی سے انتقام اس لئے نہ لیا یا کسی کو سزا اس لئے نہ دی یا کسی سے لڑائی اس لئے نہ کی یا کسی کو قتل اس لئے نہ کرایا کہ اس وقت اسلام یا مسلمان کی حالت ضعف کی تھی، دشمنانِ اسلام اور دشمنانِ رسولؐ کا فعل ہے۔ ایسا تبصرہ آپؐ کی پاک ذات پر بدنما داغ لگانے کی بدنما جسارت ہے۔ الغرض اسی نوع کے دیگر واقعات میں سے ایک ایک واقعہ ببانگِ دہل ان لوگوں کی تردید کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خوف کی وجہ سے کسی کو قتل نہ کیا کہ اسلام حالتِ ضعف میں تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ آپؐ کو حکمِ خداوندی صرف صبر کا تھا۔ سچائی کے ساتھ اگر صبر کی طاقت ہو تو وہ ہر دوسری طاقت سے زیادہ طاقتور ہے جو کامیابی سے شرطیہ ہمکنار کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی کامیابی اور فتوحات اس حقیقت کا عملی ثبوت ہیں۔

پس رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن ابی بن سلول وغیرہ توہین کے مرتکب لوگوں کو اسی وجہ سے قتل نہیں کیا تھا کہ تا اس جواز کو ہی ختم کر دیا جائے اور تا ایسا نہ ہو کہ توہین اور سبّ و شتم کرنے والے کو لوگ قتل کرنا شروع کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عفو و درگزر اور صبر و رحمت کے جذبات اور قربانیوں اور دعاؤں کے آنسوؤں کے ساتھ جو بند باندھا تھا، 'اپنے ہی دوستوں' نے کمزور اور جعلی روایتوں کے بھالوں سے اس میں حتّی الامکان شگاف ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے صبر و ضبط اور عفو و درگزر کے غیر معمولی نمونوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی نظرِ بصیرت ایسے فتنوں کو دیکھ رہی تھی جو آپؐ ہی کے لئے ایسے جذبات کی بنیاد پر جھوٹے اور ظالمانہ رُخ اختیار کرنے والے تھے۔ جن ہتھیاروں سے جہاں

انسان پر توہینِ رسولؐ کے الزام لگا کر قتل و خون کا بازار گرم کیا جانے والا تھا، وہاں انہی ہتھیاروں کے ذریعے اسلام اور مقدّس بانیٔ اسلام کی پاک ذات پر حملوں کے لئے غیر مسلموں کی قلمیں اور زبانیں غلاظت اگلنے والی تھیں۔ اور آج یہ منظر اپنی پوری جولانی کے ساتھ دنیا کے سامنے ہے۔ العیاذ باللہ۔ الحفیظ والامان

یہودی کا ’ اَلسَّامُ عَلَیۡکَ ‘ کہنا

’الصارم......‘ میں یہ واقعہ تین طرح کی روایتوں کے ساتھ لکھا ہے۔ ایک روایت حضرت عائشہؓ کی بھی ہے۔ آپؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس چند یہودی آئے اور کہا: ’اَلسَّامُ عَلَیْكَ‘۔ آپؓ فرماتی ہیں کہ میں سمجھ گئی کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔ چنانچہ میں نے جواب میں کہا: ’عَلَیْکُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ‘ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے عائشہ! ذرا ٹھہرو، اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِیْ الْاَمْرِ کُلِّہٖ“ کہ اللہ تعالیٰ بردبار ہے اور ہر کام میں بردباری کو پسند فرماتا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کی: ”یا رسول اللہ! جو انہوں نے کہا تھا، کیا آپ نے سنا نہیں؟“ آپؐ نے فرمایا: ” میں نے بھی تو ’وَعَلَیْکُمْ‘ کہہ دیا تھا۔“

(’الصارم.....‘ زیر عنوان، تحیّۃ الیہود للرّسول وصحبہ، صفحہ 150،151)

معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس یہودی کو جواب میں ’عَلَیْکُم ‘ کہا تھا جو کسی طرح کتابوں میں ’وَعَلَیْکُم‘ لکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ وَعَلَیْکُم کا معنیٰ و مطلب ہے ” اور تم پر بھی“۔ لیکن ’و‘ کے بغیر عَلَیْکُم کا معنی ہے ”تم پر“۔ چنانچہ قاضی عیاض اپنی کتاب ’الشفاؔ‘ میں جو روایت لائے ہیں، منطقی اور واقعاتی لحاظ سے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ’ ’ قَالَ، اِنَّ

الْیَہُوْدَ اِذَا سَلَّمَ اَحَدَکُمْ یَقُوْلُ ' اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ ' فَقُوْلُوْا ' عَلَیْکُمْ '"(الشفا..... فصل فی اسباب عفوہ ﷺ عن بعض من اذاہ، مکتبہ الغزالی دمشق و دارالفیحاء۔ الطبعۃ الاولیٰ 2000ء) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی یہودی تمہیں سلام کی بجائے 'اَلسَّامُ عَلَیْکُمْ' کہے تو تم اسے جواباً 'علیکم' کہہ دیا کرو۔ اس میں 'عَلَیْکُمْ ' کے ساتھ 'و' نہیں ہے۔ واللہ اعلم

لفظ 'السّام' کے معنٰی 'موت' کے ہیں۔ کتبِ حدیث میں اس مضمون کی مختلف روایات درج ہیں۔ نیز تین مختلف روایات 'الصارم......' میں بھی درج ہیں۔ ان سے محسوس ہوتا ہے کہ شاید ایسا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ ہوا ہے۔ بہر حال یہ ایک بار ہوا یا جتنی بار بھی ہوا ہے، یہود کی طرف سے ہر بار سخت گستاخی کا مظاہرہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے والے کی الفاظ کی اوٹ میں چھپی نیّت کو بھانپ کر اسے ویسا ہی جواب لوٹایا۔ مگر یہ بالکل ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اسے نہ قتل کروایا اور نہ ہی کوئی اور سزا دینے کا ارشاد فرمایا۔ یہ روایت رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے حسین دریچوں سے صبر، جذباتِ غضب پر حیرت انگیز ضبط، عفو و درگزر، وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی وغیرہ خوبیوں کے دلکش رنگ دکھاتی ہے۔ آپؐ ایک فتح مند، تمام دنیوی طاقتوں کے جامع اور دنیوی جاہ و جلال کو اپنے قدموں تلے رکھنے والے شہنشاہِ دوعالم تھے جو کسی بھی گستاخ کو کسی بھی نوع کی سزا دینے پر قادر تھے۔ مگر قربان جائیں اس صبر و ضبط کے عالی مرتبت پیکر پر جو گستاخ کی گستاخی کو بغیر کسی جسمانی گزند کے اس طرح اس کی طرف واپس لوٹا دیتا ہے کہ وہ اسی کے منہ پر الٹ جاتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ دوسروں کو اس گستاخ پر سختی کرنے سے بھی کلّیۃً روک دیتا ہے۔ یہ وسیع دل ہے اور یہ پاک نمونہ ہے حبیبِ کبریا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کا جو دنیا میں تمام انسانیت کی اور ہر انسانی خون کی حفاظت کرنے والا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ آپؐ کی پاک سیرت کو چھپانے کے لئے یا اس گستاخ کو سزا نہ دینے یا قتل نہ کرنے کا جو انتہائی

لاغر اور فضول جواز پیش کیا گیا ہے، یہ ہے: "اِنَّ ھٰذَا کَانَ فِی حَالِ ضُعْفِ الْاِسْلَامِ، اَلَا تَرَی اَنَّہُ قَالَ لِعَایِٔشَۃَ: مَھْلًا یَا عَایِٔشَۃُ، فَاِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِیْ الْاَمْرِ کُلِّہِ" (ایضاً صفحہ 151:) کہ یہ اسلام کے ضعف کے حال کی بات ہے۔ کیا تو یہ نہیں دیکھتا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ بردبار ہے اور ہر کام میں بردباری و نرمی کو پسند فرماتا ہے۔

جیسا کہ پہلے مستند واقعات اور قطعی حقائق سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ اسلام کبھی بھی ضعف کی حالت میں نہ تھا۔ اس بارے میں یہاں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مگر آگے جا کر کتاب 'الصارم.....' میں اپنے اس جواب کی تائید میں چند نام پیش کر کے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ جواب ان مالکیوں، شافعیوں اور حنبلیوں نے بھی پیش کیا ہے۔ پھر اس پر خود ہی گونہ تنقید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ جواب محلّ نظر ہے کیونکہ یہ واقعہ کعب بن اشرف کے قتل کے بعد کا ہے اور اس وقت تو اسلام طاقت پکڑ چکا تھا۔ یعنی خود ایک طرح سے جواب بھی تحریر کیا ہے اور ساتھ معلوم بھی ہے کہ بات بن نہیں رہی۔ اس لئے یہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ یہ جواب محلِ نظر ہے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود اپنی دلیل وہیں رکھی ہے کہ ضعفِ اسلام کے باعث گستاخ کو سزا نہ دی گئی تھی۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ کتاب ' الصارم.....' اپنی پہلی دلیل کو بھول چکی ہے کیونکہ جب ابیّ بن ابی سلول نے گستاخی کا کلمہ کہا تھا تو وہ 5ھ میں کہا تھا اور وہاں اس کتاب میں دلیل یہ قائم کی گئی تھی کہ اس وقت اسلام ضعف میں تھا اس لئے سزا نہیں دی گئی۔ جبکہ کعب کا واقع 2ھ کا ہے۔ یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ کعب کے زمانہ میں اسلام طاقت پکڑ چکا تھا۔ اس صورتحال میں یہ واضح ہے کہ یہ لکھنے والے خود اپنے اندر ہی تضاد و ابہام کا شکار ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس یہودی کو قتل نہیں کیا یا قتل کی اجازت نہیں دی، تو آپؐ کے اس عمل سے چونکہ یہ صاف نظر آرہاہے کہ شدید گستاخوں کو جو آپؐ کے رُوبرو بھی آپؐ پر موت بھیجتے تھے، آپؐ اپنی رحمتِ خاص سے انہیں سزا نہیں دیتے تھے۔ اس لئے حسبِ ذیل جواز نکالنے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ایسی گالی نہیں تھی کہ جس سے عہد ٹوٹ جاتاہے۔ (جیسا کہ پہلے گزر چکاہے۔ یہ قتل کا جواز اس طرح بھی نکالتے ہیں کہ عہد توڑنے کی وجہ سے ناقضِ عہد قتل کیا جاتاہے)۔ یعنی کسی نہ کسی بہانے کوئی جواز نکالا جاتا ہے۔ ساری کتاب میں روایات اور استدلالات سے اسی طرح کھیلا گیاہے اور ہر روایت کو پرکھنے کا معیار الگ الگ بنایا گیا ہے۔

اس واقعے کے بارے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب صحابہؓ نے سنا کہ یہودی نے 'اَلسَّامُ عَلَيْكَ' کہا تو صحابہؓ نے اسے قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ جو آپؐ نے نہیں دی۔ اس پر تبصرہ یہ کیا گیاہے کہ اس سے یہ بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ ایسی گستاخی کی سزا قتل سمجھتے تھے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے چونکہ منع کر دیا اس لئے انہوں نے قتل نہ کیا۔

یہ تضاد ہے جو اس واقعے پر بحث میں موجود ہے جو اس کتاب میں کی گئی ہے۔ ایک طرف یہ کہا جارہاہے کہ یہ گالی ایسی نہیں تھی کہ جس کی وجہ سے قتل کیا جاتا اور دوسری طرف یہ کہا جارہاہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ ایسی گستاخی کی سزا قتل سمجھتے تھے۔ (ایضاً صفحہ: 150 تا 152) یعنی صحابہؓ کے نزدیک وہ گالی اس معیار کی تھی کہ جس کی وجہ سے وہ یہودی واجب القتل تھا۔

یہاں گالیوں کا معیار بھی زیرِ بحث ہے کہ کس معیار کی گالی ہو تو عہد ٹوٹے گا اور اس کی بناء پر وہ شاتم قتل کیا جائے گا۔ گالی اس معیار سے کم ہو گی تو عہد نہیں ٹوٹے گا لہٰذا وہ قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہاں یہ بحث تو نظر آتی ہے مگر یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ گالی کے معیار کا فیصلہ کون

کرے گا؟ اس پر کسی فیصلے کو نہ پا کر ہر قاتل تلوار اٹھائے پھرتا ہے اور اپنا فتوٰی صادر کر کے کشت وخون کی ہولی کھیلتا چلا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کو قبول نہ کر کے یا اس پر اپنے من پسند جوازوں کے پردے ڈال کر آپؐ کی منشاء کے برخلاف بحثوں میں الجھ گئے ہیں اور قتل وخون کو آپؐ کی طرف منسوب کرنے کی جسارت کرتے چلے جاتے ہیں۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ اس واقعے کو کسی بھی پہلو سے دیکھ لیں۔ اس سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ 'صحابہؓ ایسی گستاخی کی سزا قتل سمجھتے تھے۔' بلکہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ میں سے کسی ایک، دو یا چند نے اپنے پیارے محبوب نبی ﷺ کے لئے محبت و غیرت میں غصے کی وجہ سے اس یہودی کو قتل کرنے کے لئے اجازت چاہی مگر رسول اللہ ﷺ نے اپنے واضح اور دوٹوک فیصلے سے ثابت فرمایا کہ ان کے اظہارِ غیرت کا یہ رُخ درست نہیں ہے۔ لہٰذا آپؐ نے ان کو قتل کرنے کی اجازت نہ دی۔ آپؐ نے یہ ثابت فرمایا کہ حکمِ الٰہی کے مطابق ہر اذیّت اور تکلیف کے وقت صبر اور عفو کا دامن نہیں چھوڑنا۔ اپنے کسی عمل سے غیروں کو یہ موقع نہیں دینا کہ وہ یہ بات کر سکیں کہ محمد (ﷺ) اپنے لوگوں کو قتل کرواتے تھے۔

جہاںتک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ کوئی ایسی گالی نہ تھی کہ جس سے عہد ٹوٹ جاتا ہے۔ (یعنی کوئی معیاری گالی ہوگی تو عہد ٹوٹے گا اور پھر عہد توڑنے والا قتل کیا جاتا ہے) یہ استدلال بھی غلط ہے۔ کیونکہ ہلاکت کی بددعا بھی ایک بدترین گالی ہے۔ اگر یہ گالی نہیں ہے تو اس کے بالمقابل باقی اکثر واقعات جنہیں وضعی روایات میں مختلف افراد کے قتل کی بنیاد بنایا گیا ہے، ان کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہتی۔ مثلاً ایک شخص اپنے مقصد کے حل کے لئے رسول اللہ ﷺ کی طرف ایک خلافِ واقعہ بات منسوب کرتا ہے تو اسے صرف اسی بات پر گستاخ قرار

دے کر اسے قتل کرنے کے لئے لوگوں کو بھیجا جاتا ہے (دیکھیں روایت نمبر 12)۔ اگر بنظرِ انصاف دیکھا جائے تو یہ معاملہ بد دعا سے کسی پہلو میں بھی سنگین نہ تھا۔ مگر بقول 'الصارم.....' اسے قتل کرایا گیا۔ جبکہ اس کے برعکس بد دعا دینے والے کو بچایا گیا۔ الغرض اس کتاب میں اکثر ایسے واقعات درج کئے گئے ہیں جن میں ایسی کوئی بات نہ تھی کہ جس کی وجہ سے کسی کو قتل کیا جاتا۔ مگر اس پر انتہائی تکلّف کے ساتھ سبّ و شتم کا طغرہ سجا کر اسے بطور جواز پیش کیا گیا ہے۔

اس واقعے میں حضرت عائشہؓ کا ردّ عمل اور یہودی کو جواب دینا بتاتا ہے کہ اس کی یہ بد دعا گالی سے بھی بدتر، بد اثر اور زیادہ چبھن رکھتی تھی کہ حضرت عائشہؓ جیسی متحمل، بردبار اور متوازن عورت بھی تڑپ اٹھی اور ردّ عمل ظاہر کرنے لگی۔ ایک شخص کی ایسی بد حرکت کو ایسی گالی قرار نہ دینا جس سے 'الصارم.....' کا مزعومہ عہد نہیں ٹوٹتا، عمداً سچائی چھپانے کے برابر ہے۔

بغض و عناد میں لپٹی ہوئی اس شخص کی بد دعا خود رسول اللہ ﷺ نے بھی شدّت سے محسوس کی تھی۔ جس کے لئے آپؐ نے فوراً اسی پُر شدّت ردّ عمل کے طور پر اپنے ان طبعی جذباتِ رحمت کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ نرمی اختیار کرنا ہر دوسرے جذبے سے بہتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود حلیم و بُردبار ہے وہ نرمی کو پسند فرماتا ہے۔

علاوہ ازیں اسی مذکورہ بالا عادتِ یہود کے تسلسل میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی ایک روایت ہے جو شاتمِ رسولؐ کے سزا کے فلسفہ پر تفصیلی روشنی مہیّا کرتی ہے۔ یہ روایت تفسیر درّ منثور میں مسند احمد اور طبرانی وغیرہ کتب کے حوالہ سے زیر آیت " وَإِذَا جَآؤُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ" (المجادلہ:9) درج ہے۔ درّ منثور میں اس کی سند کو محقق کے حوالہ سے حسن قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے " عَنْ اِبْنِ عُمَرَ، اَنَّ الْيَهُوْدَ كَانُوْا يَقُوْلُوْنَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم سَامٌ

عَلَيْكَ۔ يُرِيْدُوْنَ بِذٰلِكَ شَتْمَهُ، ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ: لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ۔ فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ: ''وَاِذَا جَآؤُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ'' (الدرّ المنثور، لامام السیوطی مطبوعہ مرکز ہجر والدّراسات العربیۃ والاسلامیۃ۔ تفسیر سورۃ المجادلہ) کہ یہودی رسول اللہ ﷺ کی پاس آتے تو آپؐ کو ''سَامٌ عَلَيْكَ'' کہتے۔ یعنی آپؐ پر موت آئے۔ اس سے ان کا ارادہ آپؐ پر شتم ہوتا تھا۔ پھر اپنے آپ سے کہتے (یا آپس میں بات کرتے) کہ (اگر یہ سچا نبی ہے تو) جو ہم کہتے ہیں اس کی وجہ سے اللہ ہمیں عذاب میں کیوں مبتلا نہیں کرتا۔ تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ''أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَإِذَا جَاؤُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِيْ أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ'' (المجادلہ:9) ترجمہ: کیا تو نے ان کی طرف نظر نہیں دوڑائی جنہیں خفیہ مشوروں سے منع کیا گیا مگر وہ پھر وہی کچھ کرنے لگے جس سے ان کو منع کیا گیا تھا؟ اور وہ گناہ، سرکشی اور رسول کی نافرمانی کے متعلق باہم خفیہ مشورے کرتے ہیں۔ جب وہ تیرے پاس آتے ہیں تو وہ اس طریق پر تجھ سے خیر سگالی کا اظہار کرتے ہیں جس طریق پر اللہ نے تجھ پر سلام نہیں بھیجا اور وہ اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں، ان سے نپٹنے کو جہنّم کافی ہوگی۔ وہ اس میں داخل ہوں گے۔ پس کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔

تفسیر درّ منثور میں مذکور اس روایت کو آیت قرآنیہ کی تصدیق حاصل ہے کہ وہ تجھ پر شتم کے بعد اس کی سزا کا مطالبہ کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے اس دنیا میں کوئی سزا مقرر نہیں فرمائی۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی کسی کو اس وجہ سے سزا نہیں دی۔ ہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے قرآن کریم میں جو سزا مقرر فرمائی وہ اخروی زندگی میں جہنم کی آگ ہے جس میں وہ جلیں گے۔

اللہ تعالیٰ جب دنیا میں اپنا نبی اور رسول بھیجتا ہے تو وہ زمین پر اس کا نمائندہ ہوتا ہے۔ وہ اس کے لئے سب انسانوں سے زیادہ غیرت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے اس کی تکذیب و تکفیر یعنی اسے جھوٹا کہنا اور اس کی سچائی کا انکار کرنا اس کی سب سے بڑی توہین ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرسَل دنیا میں اپنے وقت کا سب سے سچا انسان ہوتا ہے۔ اسے کذّاب یا جھوٹا قرار دینا اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی گستاخی ہے اور اس مرسل کی انتہائی توہین اور اس پر کھلا کھلا شتم ہے۔ اس کے زمانہ میں ایسے لوگ بے شمار ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ توہین و شتمِ رسولؐ اس کی سزا انسان کے ہاتھ میں دے دیتا تو سب مکذّب و مکفّر تہِ تیغ کر دیئے جاتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے مرسَل کو یا اس کے متبعین کو مکذّبین کے قتل کے احکام نہیں دیئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی تکذیب، توہین یا گستاخی کے بدلہ میں بسا اوقات دردناک عذابوں سے بستیوں کی بستیاں ہلاک کر دیتا ہے مگر یہ وہ خود کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس سلوک سے صاف واضح ہے کہ اس نے اپنے نبی اور رسول کی تکذیب اور توہین کی سزا کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں دی۔ وہ اگر اس دنیا میں کسی کو سزا دیتا ہے تو اپنے طریقوں سے خود دیتا ہے۔ کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں دیتا۔ پھر اگلے جہان میں انہیں جہنم کی وعید دیتا ہے۔

الغرض یہ ثابت شدہ سچائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کریم ﷺ نے کسی کو توہین رسالت کی سزا میں کسی گستاخ اور شاتم کو قتل کرنے کا کوئی حکم ارشاد نہیں فرمایا۔ پھر کتاب " الصارم" کا بَل دے دے کر جواز نکالنے کی کوشش کرنا ایک عبث مشق ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کو گالی پہنچتی ہے؟

یہ بھی ایک سوال ہے جس کا جواب خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے۔ اس کا جو جواب آپؐ نے مہیّا فرمایا ہے، اس قضیئے کا مکمل حل پیش کرتا ہے۔ چنانچہ آپؐ کا اسوہ یہ تھا کہ

آپؐ نے زبان درازی کرنے والوں، سبّ و شتم کرنے والوں، لعن طعن کرنے والوں، توہین و تذلیل کے مرتکب لوگوں کے ایسے حملوں کا جواب صرف یہ دیا: "اَلَا تَرَوْنَ کَیْفَ یَصْرِفُ اللّٰہُ عَنِّی شَتْمَ قُرَیْشٍ وَلَعْنَھُمْ، یَشْتُمُوْنَ مُذَمَّمًا وَیَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَاَنَا مُحَمَّدٌ۔" (الصارم......زیر عنوان ' اللہ تعالیٰ یحمی رسولہ ویصرف عنہ اذی الناس' صفحہ 115) حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح کفّار کی گالیوں اور ان کی لعنت کو مجھ سے دور رکھتا ہے۔ وہ تو مذمّم کو گالی دیتے ہیں اور مذمّم پر لعنت کرتے ہیں مگر میں تو محمد ہوں (ﷺ)۔ یہ حدیث بخاری کتاب المناقب باب ماجاء فی اسماء الرّسول ﷺ سے لی گئی ہے۔

آپؐ کا پُر اعتماد اور بیّنہ پر استوار یہ جملہ ثابت کرتا ہے کہ وہ باتیں یا وہ لقب القاب جو گستاخوں کی جانب سے آپؐ کی طرف منسوب کئے گئے، وہ آپؐ کی طرف نہیں بلکہ ان کے ایک مزعومہ فرد کی طرف منسوب کئے گئے تھے۔ آپؐ کی ذات پر چونکہ وہ چسپاں ہی نہیں ہوتے تھے اس لئے وہ گالی اور وہ لعنت آپؐ کو نہیں پہنچتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے مزعومہ مذمم کو ایسا کہتے ہیں اور یقیناً آپؐ وہ نہیں ہیں۔ آپؐ ایک الگ محمّد وجود ہیں جس کا کسی بھی مذمّم کے ساتھ کوئی مس تک نہیں۔ آپؐ کی ذات تذلیل کرنے والوں کے وہم و گمان سے برتر ہے۔ آپؐ کا وجود ہی اور ہے جو ہر پہلو سے محمد ہے۔ اس کا ہر قول محمد، ہر فعل محمد، ہر سوچ محمد اور ہر فکر محمد ہے، ﷺ۔ کوئی ایسا الزام آپؐ پر چسپاں ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپؐ ان کی توہین سے کلّیۃً بری ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت پیش فرما کر آپؐ نے انتہائی پُر اعتماد سچائی کے ساتھ آپؐ کی طرف منسوب کی گئی ہر منفی بات کا ہمیشہ ہمیش کے لئے ردّ فرما دیا ہے۔ پس خاطر جمع رکھنی چاہیے کہ اس فرمان کے بعد در حقیقت کوئی گالی آپؐ تک نہیں پہنچتی۔

لہٰذا اگر کسی نے اپنے زعم میں آنحضرت ﷺ کو گالی دی بھی ہو تو آپؐ کے اس پیش فرمودہ پُر حقیقت اور سچے اصول کے ہوتے ہوئے آپؐ کو اس کا ہدف قرار دینا، بذاتِ خود آپؐ کی شان میں گستاخی ہے۔ آپؐ کو عمداً، تکلّفاً اور زبردستی اس گالی کا مورد ٹھہرانے کی جسارت ہے۔

آپؐ کے اس قول یا بیان فرمودہ اصول میں دراصل آپؐ کے متبعین کے لئے بڑا واضح سبق تھا کہ دشمن جو بھی اور جب بھی کوئی منفی بات آپؐ کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرے گا، وہ آپؐ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔ آپؐ وہ مزعومہ وجود نہیں ہیں جس کی طرف کوئی مذمت منسوب ہو سکتی ہو۔ آپؐ محمد ہیں (ﷺ) یعنی مجسّم حمد اور تعریف۔ آپؐ کا نام بھی محمد ہے اور کام بھی محمد۔ چنانچہ کسی کی منفی بات، گالی گلوچ وغیرہ وغیرہ آپؐ تک نہ پہنچ سکتے ہیں نہ آپؐ کی شان میں ذرّہ بھر بھی تخفیف یا تنقیص کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپؐ نے خود یہ ضمانت فراہم فرمائی ہے کہ " اللہ تعالیٰ مجھ سے کفّار کی گالیوں اور ان کی لعنت کو دور رکھتا ہے۔" پس اس ضمانت کو دل سے تسلیم کر کے شاتمین کو قتل کرنے کے غلط عقیدے کو ترک کر کے اسلام کی تعلیم کو اپنانا اور سنّتِ رسولؐ پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس سے پہلے اسلام کے خلاف دشمن کو بہت سا مواد مل چکا ہے جس کے ذریعے وہ سیّد المعصومین رحمۃٌ للعالمین ﷺ پر ظالمانہ حملے کرتے ہیں۔ اسلام کی حسین اور عفو و درگزر پر مبنی اور امن و سلامتی پر استوار تعلیم اور اس پر رسول اللہ ﷺ کا خوبصورت نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی اور دعوت و عمل کے لئے عملی اقدام کی ضرورت ہے۔

امّت کا فرض ہے کہ وہ شاتمِ رسولؐ کو معاف نہ کرے!!

'الصارم.....' میں متعدد مرتبہ لکھا گیا ہے: ''اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم کَانَ لَہُ اَنْ یَعْفُوَ عَمَّنْ شَتَمَہُ وَ سَبَّہُ فِی حَیَاتِہِ، وَلَیْسَ لِلْاُمَّۃِ اَنْ تَعْفُوَ عَنْ ذٰلِکَ''(الصارم.....زیر عنوان 'متی اضمر المنافقون النفاق' صفحہ 153) کہ نبی کریم ﷺ کا کام تو تھا کہ آپؐ اپنی زندگی میں آپؐ پر سبّ و شتم کرنے والے کو معاف کریں مگر امت کے لئے ایسا نہیں ہے کہ وہ معاف کرے۔

یہ بالکل خلافِ قرآن بیان ہے، غلط تعلیم ہے جو اسوۂ رسول ﷺ کے خلاف اور آپؐ کی اطاعت واتباع سے انکار یا فرار کا بہانہ ہے۔ صحابہؓ کے پاک نمونے بھی قطعی طور پر اسے ردّ کرتے ہیں۔ یہ کشت وخون کے رسیا لوگوں کا صرف ایک دعوٰی ہے جس کے تحقّق کے لئے ان کے پاس کوئی ثبوت اور دلیل نہیں۔ قرآن کریم میں توہین رسولؐ کے مرتکب کی سزا اگر قتل ہوتی تو یہ بالکل ہی ناممکن تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس پر عمل نہ فرماتے۔ آپؐ تو کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنُ، مجسّم قرآن تھے۔ یہ کہنا کہ سزا کے حکم کے ہوتے ہوئے بھی آپؐ نے اس پر عمل نہ فرمایا، آپؐ پر قرآن کریم کی تعلیم پر عمل نہ کرنے کا الزام قائم کرنا ہے۔ یہ ایک بھیانک جسارت ہے جو رسول اللہ ﷺ کے خلاف کی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صحیح مستند تاریخی ریکارڈ میں اور روایاتِ صحیحہ اور صحیح آثارِ صحابہؓ میں متعدد واقعات ہیں جو انتہائی وضاحت کے ساتھ یہ ہدایت و رہنمائی مہیّا کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو کسی بھی گستاخ کو سزا دینے کی اجازت عطا نہیں فرمائی۔ اس کتاب میں بھی ایسے واقعات کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ مگر اس روشن نمونے کے ہوتے ہوئے اس کے برخلاف ایک واضح ہٹ دھرمی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے شرعی نمونے کو ردّ کرنے کے نعرے بلند کئے گئے ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جہاں بھی کسی نے آپؐ سے کسی کو قتل کرنے کا پوچھا ہے تو آپؐ نے اسے اس سے روکا ہے اور اسے قتل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ نیز اس کا پوچھنا ہی بتاتا ہے کہ اس کے لئے آپؐ کی اجازت درکار تھی۔ کسی کو بھی کھلا

اختیار نہ تھا کہ وہ از خود کسی کو قتل کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ الغرض سنّت وحدیثِ رسولؐ واضح طور پر گواہ ہیں کہ آپؐ ہمیشہ قتل کرنے سے روکتے تھے۔ کسی کا از خود یہ اختیار لینا آپؐ کی نافرمانی ہے اور آپؐ سے آگے ہو جانے کی جسارت ہے۔

دراصل قتلِ گستاخ کا یہ جھوٹا نعرہ ایک بدبختی کی جڑ ہے جس میں امّت جکڑی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شارع اسلام نبی خیر الانام ﷺ سے آگے نکل کر ایک نئی شریعت اختراع کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا "اَلْاِمَامُ جُنَّةٌ یُقَاتَلُ مِنْ وَّرَاۤئِهٖ" (بخاری کتاب الجہاد والسیر باب یقاتل من وراء الامام.....) کہ امام ڈھال ہوتا ہے، اس کے پیچھے لڑا جاتا ہے۔ اس سے آگے نہیں۔ لیکن مذکورہ بالا قسم کے خوفناک مقولے تراش کر رسول اللہ ﷺ سے آگے بڑھا گیا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مستند روایات کا ایک مجموعہ ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ آپؐ نے بعض جذباتی لمحوں میں قتل کی اجازت مانگنے پر بھی اس کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ صحابہؓ کی اطاعت کا یہ کمال نمونہ تھا کہ اپنی انتہائی غیرت کی وجہ سے جن گستاخوں کے قتل کے لئے انہوں نے اپنے حبیب ﷺ سے اجازت طلب کی تھی، ان میں سے کئی ایک ایسے بھی تھے جو آپؐ کی وفات کے بعد زندہ تھے، صحابہؓ نے آپؐ کے بعد بھی انہیں قتل نہیں کیا۔ صحابہؓ کا یہ پاک نمونہ افرادِ امّت کے لئے ایک مشعلِ راہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ان نجوم سے رہنمائی کا حصول رشد و ہدایت کا موجب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ آپؐ کی امّت تھے اور امّت کے اعلیٰ ترین نمونے اور مجسّم اطاعت تھے۔ انہوں نے جب ایسا نہیں کیا اور آپؐ نے انہیں ایسا کرنے نہیں دیا تو پھر کسی اور کا یہ کہنا کہ "نبی کریم ﷺ کا کام تو تھا کہ آپؐ اپنی زندگی میں آپؐ پر سبّ و شتم کرنے والے کو معاف کریں مگر امت کے لئے ایسا نہیں ہے کہ وہ معاف کرے" کلّیۃً ایک جھوٹا نعرہ ہے۔ ایسے جھوٹے

نعرے کا رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے مقدّس خلفاء اور صحابہؓ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ صحابہؓ اطاعتِ رسولؐ میں امّت کے لئے بہترین اور سب سے اعلیٰ و اَولیٰ نمونہ تھے، اور انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

یہ نعرہ اس وجہ سے بھی قطعی طور پر جھوٹا نعرہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خلفاء نے جو آپؐ کے امّتی بھی تھے، کسی کو اس وجہ سے نہ قتل کیا نہ کسی سے کرایا۔ اپنے خلفاء کے بارہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے :

"عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَآءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ تَمَسَّكُوْا بِهَا، وَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔ (سنن ابی داؤد کتاب السنّۃ باب فی لزوم السنّۃ و جامع ترمذی ابواب العلم باب ما جاء فی اخذ بالسنّۃ واجتناب البدعۃ) کہ تم پر فرض ہے میری اور میرے خلفائے راشدین مہدیّین کی سنّت کو لازم پکڑو، اس سے چمٹے رہو اور اس کو اپنی داڑھوں سے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو۔

اپنے امّتیوں کے لئے رسول اللہ ﷺ کی یہ تاکید ہے۔ اگر آپؐ نے خود شاتم رسولؐ کے قتل کی سنّت قائم نہیں کی اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء نے بھی یہ سنّت قائم نہیں کی تو پھر اس کے قائلین کس کی سنّت پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی اور کی سنّت کا تو ذکر نہیں فرمایا۔ پس یہ خود تراشیدہ اور گمراہ کن نعرے ہیں جن کا شریعتِ اسلامیہ اور سنّتِ رسولؐ و سنّتِ خلفاء سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

یہ نعرہ کس کا ہے اور کس نے اختراع کیا ہے اور کب اختراع کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ میں سے بہرحال کسی کا نہیں ہے۔ یہ نعرہ یا دعویٰ یقیناً بعد کی اختراع

ہے۔ یہ ظالمانہ نعرہ اس لئے بھی ردّ کرنے کے لائق ہے کہ یہ دیگر بہت سی آیات کے ساتھ درجِ ذیل آیاتِ کریمہ کے بھی صریحاً خلاف ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ أُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَن کَانَ یَرْجُو اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْآخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا(الاحزاب:22) ترجمہ: یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسول میں نیک نمونہ ہے ہر شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

قُلْ إِن کُنتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُونِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُورٌ رَّحِیْمٌ o قُلْ أَطِیْعُواْ اللّٰہَ وَالرَّسُولَ فإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبُّ الْکَافِرِیْنَ(آل عمران:32،33)

ترجمہ: تو کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔ تو کہہ دے اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ پس اگر وہ پھر جائیں تو یقیناً اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

پھر اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے:

’’مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ‘‘(النساء:81) کہ جو اس رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔

الغرض قرآن کریم میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا بار بار حکم آیا ہے۔ آپؐ نے جس کام سے اپنی نگرانی میں صحابہؓ کو بار بار روکا تھا اسے کسی جذباتی مسئلے کی آڑ لے کر جائز قرار دینا آپؐ کی حکم عدولی ہے بلکہ اوپر والی آیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی ہے۔ آپؐ

کے بعد خلفائے راشدین ہیں جن کی سنّت پر عمل کی آپؐ نے تاکید فرمائی ہے۔ اگر خلفائے راشدین نے بھی ایسا نہیں کیا تو پھر کسی اور امّتی کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ قتل و خون کے نعرے تراشے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کی ایک غرض مکارم اخلاق کی تتمیم تھی۔ آپؐ نے صبر وضبط کا جو عالی شان نمونہ خود پیش فرمایا وہی خُلق اور وہی وصف آپؐ اپنی امّت میں بھی پیدا کرنے کے خواہش مند تھے اور فی الحقیقت آپؐ نے وہ اخلاق ان میں اس طرح پیدا فرمائے کہ جس کی نظیر کسی اور نبی کی امّت میں نہیں ملتی۔ مگر افسوس ہے کہ ایک عرصے بعد ان نورانی نمونوں پر گرد ڈالنے کے لئے عجیب وغریب روایات بھی اختراع کی گئیں اور صحیح روایات کی تشریحات بھی الٹ دی گئیں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

جہاں یہ صورتحال انتہائی افسوسناک ہے وہاں رسول اللہ ﷺ نے اپنے سچے غلاموں کو یہ تسلی بھی فراہم کر دی تھی کہ " اَلَا تَرَوْنَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّي شَتْمَ قُرَيْشٍ وَلَعْنَهُمْ، يَشْتُمُوْنَ مُذَمَّمًا وَ يَلْعَنُوْنَ مُذَمَّمًا وَ اَنَا مُحَمَّدٌ۔" (الصارم......زیر عنوان ' اللہ تعالیٰ یحمی رسولہ و یصرف عنہ اذی الناس' صفحہ 115:) کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مجھ سے کفّار کی گالیوں اور ان کی لعنت کو دور رکھتا ہے۔ وہ تو مذمّم کو گالی دیتے ہیں اور مذمّم پر لعنت کرتے ہیں مگر میں تو محمد ہوں (ﷺ)۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہمیں یہ ضمانت مہیّا فرماتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دشمنوں کی گالیوں سے بچایا تھا اور آپؐ ہمیشہ محمد ہی تھے تو آج 'اپنے ہی دوستوں' کی اڑائی ہوئی گرد سے بھی آپؐ کلّیۃً پاک ہیں اور تا روزِ قیامت پاک ہی رہیں گے۔ انشاء اللہ

رسول اللہ ﷺ کے ناموس کی حفاظت کے لئے آپؐ سے سچی غیرت، محبت اور فدائیت کا تقاضا یہ ہے کہ قتل و غارت سے اپنے دل و دماغ کو خون آلود کرنے کی بجائے آپؐ کے

پاک اسوے پر عمل کرتے ہوئے آپؐ کے خصائل و اخلاق کی نقل کی جائے اور آپؐ کے رنگ اختیار کئے جائیں تاکہ دنیا حُسنِ محمدی سے آگاہ ہو۔

قرآن کریم کو گالیاں:

"اِذَا سَمِعَهُ الْمُشْرِكُوْنَ سَبُّوْا الْقُرْآنَ" (بخاری کتاب تفسیر القرآن، باب لا تجہر بصلاتک ولا تخافت بہا) کہ مشرک جب قرآن کریم کی تلاوت سنتے تو اسے گالیاں دیتے تھے۔

شریعت نے نزول کے اعتبار سے قرآن کریم اور رسول کریم ﷺ کا ایک ہی معاملہ قرار دیا ہے۔ 'الصارم.....' اور اس نوع کی کتابوں میں آپؐ کی توہین و تنقیص اور سبّ و شتم کے مسئلے پر بیحد زور دیا گیا ہے مگر جو قرآن کریم کو گالی دیتا ہے، ان کتب میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اس کے لئے کسی غیرت کا اظہار نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن کریم کے گستاخ کو بھی ویسی ہی سزا کا مستحق ہونا چاہیئے۔ جبکہ اسے بالکل مس بھی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ جرم ایک ہی ہے۔ کیونکہ آیت کریمہ "وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ آمِنُواْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُواْ نُؤْمِنُ بِمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءهُ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَهُم" (البقرہ :92) یہ آیت بتاتی ہے کہ جن دلائل و وجوہ سے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لازم ہے، انہی دلائل و وجوہ سے قرآن کریم پر ایمان لازم ہے۔ دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر ان دلائل کا انکار کریں تو اسلام ہی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس پر ایمان لے آؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں جو ہم پر اتارا گیا جبکہ وہ اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے علاوہ (اتارا گیا) ہے۔ حالانکہ وہ حق ہے جو اس کی تصدیق کر رہا ہے جو ان کے پاس ہے۔"

پس دلیل کی مساوات پر مدلول کی مساوات ماننی لازمی ہے۔یعنی اگر رسول اللہ ﷺ پر سبّ کی سزا قتل تھی تو قرآن کریم پر سبّ کی سزا بھی وہی ہے کیونکہ نزول کے اعتبار سے دونوں میں مساوات ہے۔اسی وجہ سے روایاتِ صحیحہ میں کسی جگہ بھی رسول اللہ ﷺ کے شاتم اور قرآن کریم پر سبّ کرنے والے کے قتل کا کوئی واقعہ درج نہیں ہوا۔معلوم ہوتا ہے کہ شاتمِ رسولؐ کے قتل کے واقعات وضع کرنے والے قرآن کریم کے مسئلے سے غافل رہ گئے تھے، اس لئے اس بارے میں روایات نہ گھڑی گئیں۔ورنہ رسول اللہ ﷺ اور قرآن کریم کی توہین کا مسئلہ ایک ہی تھا۔

''امّتی باعث رسوائی پیغمبرؐ ہیں'':

کتاب' الصارم..... 'میں لکھا ہے: ''قَدْ قَدِمْنَا اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم کَانَ یَسْمَعُ مِنَ الْکُفَّارِ وَالْمُنَافِقِیْنَ فِی اَوَّلِ الْاِسْلَامِ اَذًی کَثِیْرًا، وَکَانَ یَصْبِرُ عَلَیْهِ امْتِثَالاً لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی(وَلَا تُطِعِ الْکَافِرِیْنَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَدَعْ أَذَاهُمْ)(سورۃ الاحزاب :49)لِاَنَّ اِقَامَةَ الْحُدُوْدِ عَلَیْهِمْ کَانَ یُفْضِی اِلَی فِتْنَةٍ عَظِیْمَةٍ وَ مُفْسِدَةٍ اَعْظَمُ مِنْ مُفْسِدَةِ الصَّبْرِ عَلَی کَلِمَاتِهِمْ۔ فَلَمَّا فَتَحَ اللّٰهُ مَکَّةَ وَ دَخَلَ النَّاسُ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَرَأَةً قَالَ فِیْهَا۔ (جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِم) (سورۃ التوبہ:73)وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی:(لَئِن لَّمْ یَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوبِهِم مَّرَضٌ) اِلَی قَوْلِهٖ تَعَالٰی (أَیْنَمَا ثُقِفُوا أُخِذُوا وَقُتِّلُوا تَقْتِیْلاً)۔'' (سورۃ التوبہ:61،62)

کتاب' الصارم.....' کا ترجمہ کرتے ہوئے پروفیسر غلام احمد حریری نے اس عبارت کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ: '' ہم تحریر کر چکے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کفار و منافقین سے آغازِ اسلام

میں ایذا دینے والی باتیں سنتے مگر حکمِ خداوندی کی تعمیل میں صبر و تحمّل سے کام لیتے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ''کفّار اور منافقوں کی اطاعت نہ کیجئے اور ان کی ایذا کو نظر انداز کیجئے۔'' ان کو شرعی سزا دی جاتی تو اس سے عظیم فتنہ و فساد کا اندیشہ تھا جو اُن کے اذیّت والے کلمات پر صبر کرنے سے بھی عظیم تر ہوتا۔ جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوئے تو سورۃ التوبہ کی آیت نازل ہوئی : ''کفار اور منافقین کے خلاف جہاد کر۔'' نیز فرمایا: ''اگر منافق اور وہ جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہے اور جو (مدینہ شہر میں) بری خبریں اڑایا کرتے ہیں (اپنے کردار) سے باز نہ آئیں گے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے۔ پھر وہ تمہارے پڑوس میں نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن، وہ بھی پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور جان سے مار ڈالے گئے۔''

'الصارم......' کی اس عبارت میں حسبِ ذیل بنیادی غلطیاں موجود ہیں۔

۱: پہلی آیت وَلَا تُطِعِ..... سورۃ الاحزاب کی ہے۔ سورۃ الاحزاب مدنی سورۃ ہے جس کا نزول 5 ھ میں شروع ہوا۔ اس میں کوئی آیت مکّے کی حالت پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مکّے کے حالات پہلے تھے۔ ان کے لئے تعلیم اس وقت ہی نازل ہونی چاہئے تھی۔ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی وہاں سے ہجرت کی وجہ سے جب وہ صورتحال نہ رہی، وہ جبر و تشدّد ختم ہو گیا اور وہ دَور گزر گیا تو اس کے بعد اس کے لئے حکم کے نزول کی ضرورت ہی کوئی نہ تھی۔

۲: مکّے میں منافقین نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :وَمِمَّنْ حَوْلَكُم مِّنَ الاَعْرَابِ مُنَافِقُونَ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ مَرَدُواْ عَلَى النِّفَاقِ۔(سورۃ التوبہ:101) کہ تمہارے ارد گرد بدَوِیوں میں منافق ہیں یا اہلِ مدینہ میں ہیں جو نفاق پر ڈٹے ہوئے ہیں۔

یہ آیت ایک حتمی صورتحال بیان کرتی ہے کہ مکے میں منافق کبھی بھی نہیں تھے، وہاں یا مومن تھے یا کافر۔ یہ دو ہی گروہ تھے۔ منافق صرف مدینے میں یا اس کے ارد گرد تھے۔ اس لئے قرآن کریم کے مطابق اُس زیرِ بحث آیت کو مکی زندگی پر چسپاں کرنا واضح غلطی ہے۔

۳: کتاب 'الصارم.....' کی زیرِ بحث تحریر یہ ثابت کرتی ہے کہ صبر کی تعلیم صرف اس وقت تک ہے جب انسان کمزور ہو۔ جب طاقت ہو تو صبر کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ تعلیم یا یہ اصول اسلام کا نہیں ہے۔ کسی اور مذہب کا ہو تو الگ بات ہے۔ اسے اسلام یا رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنا ان کی توہین ہے۔ کمزوری کے وقت صبر کرنے اور طاقت کے وقت تلوار اٹھا لینے کو بے اصولی تو کہا جا سکتا ہے کوئی تعلیم اور اصول نہیں کہا جا سکتا۔

۴: پھر یہ کہا گیا ہے کہ '' ان کو شرعی سزا دی جاتی تو اس سے عظیم فتنہ وفساد کا اندیشہ تھا جو اُن کے اذیّت والے کلمات پر صبر کرنے سے بھی عظیم تر ہوتا۔''

اس عبارت میں یہ تضاد بھی جھانکتا دکھائی دیتا ہے کہ دراصل وہ کمزور نہ تھے۔ وہ سزا دینے کی طاقت رکھتے تھے مگر فتنے کے بڑھنے کے اندیشے سے سزا دینے سے رکے رہے۔ ایک طرف اسے شرعی سزا کہا جا رہا ہے اور دوسری طرف کسی خوف سے اس سے گریز بھی بتایا جا رہا ہے۔ اس طرزِ عمل کو مداہنت کہا جاتا ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے اصولی اور بنیادی طور پر منع فرمایا ہے۔ رسول کریم ﷺ کا دامن ایسی طرزِ عمل سے ہمیشہ اور کلّیۃً پاک ہے۔

۵: سورۃ التوبہ اور الاحزاب کی دوسری آیات کو توہین اور اذیت والے مسئلے کے ساتھ منسلک کرنا بھی درست نہیں ہے۔ دونوں آیات کے جنگ اور محاربت کے ماحول اور منظر ہیں۔ ان آیات میں توہین یا اذیّت کی باتیں کرنے والوں پر تلوار اٹھانے کی کوئی تعلیم نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ان آیات کا منطوق یہی مناظر ہوتے تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ نعوذ باللہ رسول کریم

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کبھی ان پر عمل نہیں کیا کیونکہ آپؐ نے کبھی کفار اور منافقین پر تلوار نہیں اٹھائی۔ آپؐ نے صرف محارب اور جنگ مسلّط کرنے والوں پر دفاعی ضرورت کے تحت تلوار اٹھائی تھی۔

یہ تو کتاب 'الصارم.....' کی اُس تحریر پر کچھ تبصرہ تھا، جس میں کمزوری کی حالت پر صبر اور طاقت کی حالت میں تلوار اٹھانے کا نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ مگر ظلم کی انتہاء ہے کہ شاتمِ رسولؐ کو قتل کرنے کے دعویداروں نے قتل و خون کے نظریئے کو صرف اپنے تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کی سند کو عفوو درگزر کے شہنشاہ رحمۃ للعالمین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف منسوب کیا ہے۔ انہوں نے آپؐ کی قوّتِ قدسیہ اور تاثیرِ روحانیہ کو بھی اپنے کھوکھلے دلائل اور کِرم خوردہ سہاروں کی طرح ایسا کمزور قرار دیا ہے کہ گویا اگر تلوار آپؐ کے قبضۂ قدرت میں نہ ہوتی تو آپؐ کبھی بھی وہ عظیم رُوحانی انقلاب پیدا نہ کر سکتے جو آپؐ نے چند سالوں میں کر کے دکھا دیا تھا۔ اُن کے نزدیک آپؐ کی مکّی زندگی (نعوذ باللہ) محض ایک لاچاری اور کمزوری کی دلیل تھی اور آپؐ کی اصل طاقت، آپؐ کی تلوار تھی۔ چنانچہ دیکھیں کہ جماعتِ اسلامی کے امیر مولوی مودودی صاحب کس دلیری اور اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں :

"رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم 13 برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے وعظ و تلقین کا جو موثر انداز ہو سکتا تھا اُسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے، واضح حُجّتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیّر العقول مُعجزے دکھائے۔ اپنے اخلاق اور پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کیلئے مفید ہو سکتا تھا لیکن آپ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت کے روشن ہو جانے کے باوجود آپ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔........ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی۔.......... تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت

کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ روحوں کی کثافتیں دُور ہو گئیں اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہیں رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی جو اسلام کو اِس سُرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہوگئی تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اِسلام کی تلوار نے ان پَردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے۔"(الجہاد فی الاسلام" باب چہارم، اشاعت اسلام اور تلوار، صفحہ 174، 173 ایڈیشن 1990ء ناشر ادارہ ترجمان القرآن)

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں:

"یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اس کو اسلامی حکومت کے زیر نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اُصول و مسلک کی طرف دعوت دی مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوّت حاصل کرتے ہی رومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بعد حضرت ابو بکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انہوں نے روم اور ایران دونوں کی غیر اسلامی حکومتوں پر حملہ کیا اور حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو آخری مراحل تک پہنچا دیا۔"(حقیقت جہاد، صفحہ 65، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور 1964ء)

یعنی وہ انتہائی گندہ اور سخت بہیمانہ الزام ہے جو اسلام کے اشدّ ترین متعصب دشمنوں کی طرف سے آنحضرت صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پاک ذات پر لگایا جاتا تھا۔ جیسے یورپ کے یاوہ گو مستشرقین

گزشتہ صدی تک عیسائی دنیا میں اُچھالتے اور دنیا کو اسلام سے متنفّر کرتے رہے ہیں وہ دراصل خود ان مسلمان رہنماؤں کی طرف سے اس مقدّس رسولؐ کی پاک ذات پر لگایا جا تا رہا ہے۔

یہ وہی پتھر ہے جو اس سے پہلے جارجؔ سیل اور سمتھؔ اور ڈوزیؔ نے آنحضرت ﷺ پر پھینکا تھا۔ یہ وہی الزام ہے جو گاندھی جی نے آپؐ پر اُس وقت لگایا تھا جب وہ اسلام کی تعلیم سے ابھی پوری طرح آشنا نہیں تھے اورانہوں نے محض دشمنانِ اسلام یا اسلام کے "اپنے ہی دوستوں" کی کہی ہوئی باتوں کو سُن کر یہ تأثر قائم کر لیا تھا۔ چنانچہ گاندھیؔ جی کے الفاظ میں:

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کی فیصلہ کُن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

اور ڈوزیؔ (Dozi) کہتا ہے کہ: "محمدؐ کے جرنیل ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر تلقین کرتے تھے۔"

اور سمتھؔ (Smith) کو دعویٰ ہے کہ جرنیلوں کا کیا سوال، خود " آپؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لے کر مختلف اقوام کے پاس جاتے ہیں۔۔"

اور جارجؔ سیل (George Sale) یہ فیصلہ دیتا ہے کہ: "جب آپؐ کی جمعیت بڑھ گئی تو آپؐ نے دعویٰ کیا کہ مجھے ان پر حملہ کرنے اور بزورِ شمشیر بُت پرستی مٹا کر دینِ حق قائم کرنے کی اجازت منجانب اللہ مِل گئی ہے۔"

اِن سب دشمنانِ اسلام کی تحریریں پڑھیں اور پھر مولوی مودودیؔ کی مندرجہ بالا عبارت کا مطالعہ کریں۔ کیا یہ بعینہٖ وہی الزام نہیں جو اِس سے پہلے بیسیوں دشمنانِ اسلام نے رحیم و کریم رسول ﷺ کی ذات پر لگایا تھا۔ بلکہ یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا اور اس سے

بہت بڑھ کر آپؐ کی قوّتِ قدسیہ پر حملہ کرنے والا۔ آپ دشمنانِ اسلام کی عبارتیں پڑھ کر دیکھ لیں، کہیں بھی آپ کو آنحضرت ﷺ کی قوّتِ قدسیہ کی مزعومہ کمزوری اور معجزات کی ناطاقتی کا ایسا ہولناک نقشہ نظر نہیں آئے گا جیسا مولوی مودودیؔ نے کھینچا ہے۔ یعنی آپؐ کی مسلسل تیرہ سال کی دعوتِ اسلام تو دلوں کو فتح کرنے سے قاصر رہی مگر تلوار اور جبروت نے دلوں کو فتح کر لیا۔ وعظ و تلقین کے موثر سے موثر انداز تو صحرائی ہواؤں کی نذر ہو گئے مگر نیزوں کی اَنی نے دلوں کی گہرائیوں تک اسلام پہنچا دیا۔ آپؐ کے ”مضبوط دلائل“ تو عقلِ انسانی میں جاگزیں نہ ہو سکے مگر گُرزوں کی مار خَودوں کو توڑ کر اُن کی عقلوں کو قائل کر گئی۔ واضح بحثیں اُن کی قوّتِ استدلال کو متأثر نہ کر سکیں مگر گھوڑوں کی ٹاپوں نے ان کو اسلام کی صداقتوں کے تمام راز سمجھا دیئے۔ فصاحت بلاغت بے کار گئی اور زورِ خطابت دلوں کو اِس درجہ گرما نہ سکا کہ اسلام کا نور اُن کے دلوں میں چمک اُٹھتا حتّٰی کہ خود عرش کے خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والے محیّر العقول مُعجزے بھی خائب و خاسر رہے اور ایک ادنیٰ سی پاک تبدیلی بھی پیدا نہ کر سکے لیکن.........”جب داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی.....۔“ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ کِس قدر مضحکہ خیز ہے یہ تصوّر اور کیسے تحقیر آمیز الفاظ ہیں کہ جن کو پڑھ کر رونا آتا ہے کہ یہ ایک ”اسلامی راہنما“ کے قلم سے نکلے ہیں جو رسولؐ کی محبت کا دعویدار ہے۔ مولانا کے اِن الفاظ کو پڑھیئے اور ”میزان الحق“ کے کینہ توز مصنّف پادری فنڈر (Revd Dr C.G. Pfander) کے اِن الفاظ کا مطالعہ کیجئے:

”اب حضرت محمدؐ تیرہ سال تک نرمی و مہربانی کے وسائل سے اپنے دین کی اشاعت میں کوشش کر چکے تھے۔..... لہٰذا اب سے آنحضرتؐ ”اَلنّبی بالسیف“ کہلائے یعنی نبیٔ تیغ زن بن گئے اور اس وقت سے اسلام کی مضبوط ترین و کارگر دلیل تلوار ہی قرار پائی۔“ (میزان الحق صفحہ: 468)

وہ مزید لکھتا ہے: "اگر ہم حضرت محمد (ﷺ) اور اُن کے تابعین کے چال چلن پر غور کریں تو ایسا معلوم ہو گا کہ اب وہ خیال کرنے لگ گئے تھے کہ عقبہ کے موضوع و مقبول اخلاقی قواعد کی پابندی اُن کے لئے ضروری نہ تھی۔ اب خدا اُن سے فقط یہی ایک بات طلب کرتا تھا کہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور تیغ و تیر اور خنجر و شمشیر سے قتل پر قتل کرتے رہیں۔"
(میزان الحق صفحہ:499)

اور اس کے بعد یہ مصنف حضرت مسیحؑ کی مظلومی کا بڑے فخر سے نعوذ باللہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے مزعومہ جبر کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"آپ کو خداوند یسوع مسیح کلمۃ اللہ اور حضرت محمد (ﷺ) بن عبد اللہ میں سے ایک کو پسند کرنا ہے۔ یا تو اُس کو پسند کرنا ہے جو نیکی کرتا پھرا یا اُس کو جو "النّبی بالسیف" کہلاتا ہے۔" (تتمہ، میزان الحق)

پھر مولانا مودودیؒ کی تائید میں ایک اَور اسلام دشمن مسٹر ہنری کوپی (Copey Henry) کے مندرجہ ذیل الفاظ پڑھئے:

"........اور اپنی نبوّت کے تیرھویں سال آپ نے اِس امر کا اظہار کیا کہ خدا نے مجھ کو نہ صرف بغرضِ مدافعت جنگ کرنے کی اجازت دی ہے بلکہ اپنا دین بزورِ شمشیر پھیلانے کی بھی اجازت دی ہے۔" (اہلِ عرب کی سپین کی تاریخ از ہنری کوپی جلد اوّل صفحہ 39 مطبوعہ بوسٹن۔ ماخوذ از "مقدمہ تحقیق الجہاد" صفحہ:31)

اور ڈاکٹر اے سپرنگر (Aloy Spranger) کے یہ الفاظ پڑھئے جو مولانا مودودی کی ہم خیالی میں اِس رائے کا اظہار کرتے ہیں:۔

"اب پیغمبر (صلعم) نے فتنے کے دفع کرنے کیلئے اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کا قانون خدا کے نام سے شائع کیا اور اس وقت سے یہ قاعدہ آپ کے (نعوذ باللہ) خونی مذہب کا نعرۂ جنگ ہو گیا۔"

وہ دشمنانِ اسلام جو آنحضرت ﷺ کے شدید ترین معاندین میں شمار ہوتے ہیں۔ بُغض وعناد سے جن کے سینے کھولتے ہیں۔ جو نفرت کی آگ میں جلتے ہیں اگر وہ آنحضرت ﷺ پر جبر کا الزام لگائیں تو تعجب نہیں۔ غم تو بہت ہوتا ہے مگر تعجب نہیں۔ ہاں تعجب ان پر ہے اور حَیف اُن پر جو اس معصوم اور مظلوم رسول ﷺ کی پیروی کا دَم بھر کر بھی آپؐ کی مقدس ذات پر بربریّت کا الزام لگانے کی جسارت کرتے ہیں۔(کم و بیش یہ تین صفحے حضرت صاحبزادہ مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابعؒ کی کتاب "مذہب کے نام پر خون" سے مأخوذ ہیں۔")

ایک سنہری اصول، ایک قیمتی سبق:

یہ سچائی کس طرح ترک کی جا سکتی ہے کہ قتل کرنے سے توہین کرنے والا شاتم اور گستاخ تو قتل ہو کر مر جاتا ہے مگر اس کی گالی یا اس کی بات جو وہ کر گیا ہے، وہ اس کے قتل سے نہیں مٹتی۔ وہ توہین اس کے قتل کے باوجود قائم اور باقی رہتی ہے۔ ہاں سازشوں اور فتنوں کے لیڈر یا سرغنے جو کہ چند ایک ہوتے ہیں، اگر مارے جائے تو ان کی موت کے ساتھ سازشیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی ایسے لوگوں کے قتل کا حکم نہیں فرمایا جو آپؐ کی توہین یا آپؐ پر سبّ و شتم کے مرتکب ہوئے تھے۔ ہاں ان معدودے چند ایک کو سزائے موت دی جو فتنوں کے بانی مبانی تھے یا دیگر بڑے قومی جرموں کے مرتکب تھے۔ کیونکہ ان کے منظر سے ہٹ جانے سے یہ جرم پھلنے پھولنے اور پھیلنے سے رک جاتے ہیں بلکہ اکثر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کثرت سے عام لوگ قتل و خون سے بچ جاتے ہیں۔ لیکن توہین کرنے والے کو اگر

قتل کیا جائے تو وہ باتیں باقی رہ جاتی ہیں جو اُن کی غلیظ زبانوں سے نکلتی ہیں اور اس وقت تک نہیں مٹتیں جب تک ان کا جواب دے کر انہیں نہ مٹایا جائے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے یہ ایک انتہائی سنہری اصول اور ایک قیمتی سبق عطا فرمایا ہے: لِيَهۡلِكَ مَنۡ هَلَكَ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحۡيٰى مَنۡ حَىَّ عَنۡۢ بَيِّنَةٍ(الانفال:43) کہ جو ہلاک ہو وہ کھلی کھلی حجّت کی رُو سے ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہو وہ کھلی کھلی حجّت کی رُو سے زندہ رہے۔ یعنی اصل ہلاکت جسم کی نہیں دلیل کی ہے اور بیّنہ کی ہے اور اصل زندگی بھی دلیل اور بیّنہ کی ہے۔ کیونکہ انسان تو مر جاتا ہے مگر بیّنہ نہیں مرتی۔ پس یہ حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پاک نمونہ ایک بیّنہ ہے اور اسلام کی روشن تعلیم ایک بیّنہ ہے۔ انہیں کسی زبردستی یا درشتی اور سختی کی ضرورت نہیں۔ انہیں قتل و غارت اور کشت و خون کی بھی ہرگز حاجت نہیں۔ انہیں دراصل سچائی، نیک عمل اور دلیل و برہان کی ضرورت ہے۔ یہ عناصر ہیں جو ہر حال میں اور ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے نرمی اختیار کرنے کی تعلیم پر مبنی اپنے فرمودات میں دراصل اسی بات کی فکر فرمائی ہے کہ اگر ایک شخص کو اس وجہ سے قتل کر دیا گیا کہ اس نے آپؐ پر کوئی الزام لگایا یا کوئی تہمت باندھی تھی یا آپؐ کی شان میں گستاخی کی تھی تو یہ بیّنہ ٹوٹ جائے گی۔ یعنی لوگ باتیں کریں گے کہ آپؐ الزام یا تہمت دور نہیں کرسکتے بلکہ لوگوں کو قتل کرواکے زبان بند کرواتے ہیں۔ گویا آپؐ کی تعلیم میں نعوذ باللہ کوئی علمی طاقت نہیں تھی، آپؐ کے اسوۂ حسنہ میں کوئی قوّتِ قدسیہ نہیں تھی اور آپؐ کی سنّتِ مبارکہ میں کوئی روحانی تاثیر نہیں تھی کہ اپنے اوپر سے الزام دور کر سکتی۔ چنانچہ اس حقیقت سے، گو ہے یہ کڑوی، کون انکار کر سکتا ہے کہ تشدّد اور شدّت پسندی اور غارت گری کے باعث بُری شہرت اسلام کی مقدّرہ ترقی کی راہ میں بڑی روکیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہر ممکن قربانی دے کر ان روکوں کو دور فرمایا تھا۔ یہ درحقیقت

امّت کے لئے ایک نمونہ، ایک اسوہ اور ایک لائحہ عمل تھا جو آپؐ نے خود اپنے عمل سے پیش فرمایا تھا۔ مگر قتل وخون اور غارتگری کے شوقین آپؐ کی خوبصورت سیرت کے دلکش پہلو پیش کرنے اور ان پر عمل کرنے کی بجائے آپؐ کی منشاء کے خلاف آپؐ کی طرف ایسے ایسے قتل منسوب کرتے ہیں جو نہ آپؐ نے کئے، نہ کروائے۔ بلکہ یہ لوگ ایسی سزاؤں کو بھی آپؐ کی ذات اور آپؐ کے ناموس سے مُعَنْوَن کر کے پیش کرتے ہیں جو قصاص، محاربت، فساد فی الارض اور قومی جرموں کی واضح ذیل میں آتے ہیں۔ حالانکہ ان سزاؤں کا آپؐ کے ناموس سے کسی نوع کا ناتا نہیں تھا۔ یہ صرف ان کے سنگین جرموں کی طبعی اور عادلانہ جزائیں تھیں جو انہیں دی گئی تھیں۔ انہیں ناحق طور پر گستاخی و توہین کے عنوانوں میں لپیٹ کر سب سے معصوم نبیؐ، انسانی خون کے محافظ نبیؐ، نبیٔ رحمت اور رحمۃٌ للعالمین ﷺ کی طرف منسوب کرنا آپؐ پر انتہائی گھناؤنا ظلم ہے۔ پس یہ ایک بہت بڑی صداقت ہے کہ اس رؤوف و رحیم نبیؐ کے پاک اور پُر رحمت ہاتھ ایک ادنیٰ سے ظلم اور ایک قطرہ برابر خون سے بھی یکسر پاک ہیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍوَ بَارِکْ وَ سَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

کتاب ”الصّارم المسلول“ کا پس منظر:

اس باب کے آخر میں یہ جائزہ بھی قارئین کی نذر ہے کہ یہ کتاب کب، کیوں، کس پس منظر اور کس صورتحال میں تحریر ہوئی؟ چنانچہ اس بارے میں مدراس یونیورسٹی شعبہ عربی، فارسی اور اردو کے ریڈر محمد یوسف کوکن عمری صاحب اپنی کتاب ”امام ابن تیمیہ“ میں زیرِ عنوان ” آنحضرتؐ کی شان میں ایک نصرانی کی گستاخی اور ہنگامہ“ تحریر فرماتے ہیں:

”رجب 693ھ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایک زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ امام ابن تیمیہ کے غیر معمولی علم و فضل کا ایک نمایاں ثبوت بھی

لوگوں کو مل گیا۔ دمشق میں بہت سے نصرانی رہا کرتے تھے۔ صلیبی لڑائیوں کی بناء پر نصرانیوں (عیسائیوں) اور مسلمانوں میں ایک زمانہ سے عداوت چلی آرہی تھی۔ جب صلاح الدّین ایوبی نے ملکِ شام صلیبیوں سے واپس لے لیا تو ان نصرانیں کا طرزِ عمل بدل گیا۔ وہ بظاہر مسلمانوں کے دوست تھے مگر باطن میں اسلام اور مسلمانوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ کبھی کبھی اس کا نتیجہ سبّ و توہینِ رسولؐ کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا تھا۔ شہاب الدّین احمد بن حجی المتوفّٰی 682ھ عربوں کا امیر تھا۔ وہ اپنی فوج کو لے کر سلطانِ مصر کی جانب سے تاتاریوں کے خلاف لڑنے کے لئے 680ھ میں دمشق آیا تھا۔ اس کا لڑکا عساف دمشق میں بس گیا تھا۔ اس کے پاس ایک نصرانی (عیسائی) کاتب ملازم تھا۔ اس نے آنحضرت صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی شان میں کئی مرتبہ نازیبا الفاظ استعمال کئے تھے۔ اس کی یہ حرکتیں مسلمانوں کو بہت ناگوار گزریں۔ امام ابنِ تیمیہ نے شیخ الشافعیہ شیخ زین الدّین ابو محمد عبد اللہ .... الفارقی المتوفّٰی 703ھ کو ساتھ لے کر دمشق کے نائب سلطنت امیر عزّ الدّین ایبک الحموی المتوفّٰی 703ھ سے ملاقات کی اور اس نصرانی کاتب کی گستاخیوں کی اطلاع دی۔ امیر موصوف نے وعدہ کیا کہ وہ نصرانی کاتب کو بلا کر اس معاملے کی تحقیق کرے گا۔ چنانچہ یہ دونوں شیخ وہاں سے واپس ہوئے تو ان کے ساتھ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ راستے ہی میں اس نصرانی سے مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ اس کے ساتھ ایک عرب بدّو بھی تھا۔ اس کو دیکھ کر مسلمانوں نے کچھ برا بھلا کہنا شروع کیا۔ وہ عرب بدّو نصرانی کی حمایت پر کمربستہ ہو گیا۔ اور اس نے کہا کہ یہ نصرانی تم لوگوں سے اچھا ہی ہے۔ یہ سن کر سارا مجمع مشتعل ہو گیا اور دونوں پر اتنے پتھر برسائے گئے کہ دونوں زخمی ہو گئے۔ جب امیر عزّ الدّین ایبک الحموی کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہت ہی افروختہ ہو گیا۔ اس نے خیال کیا کہ مجمع کی یہ حرکت محض امام ابن تیمیہ اور شیخ زین الدّین الفارقی کے اشارے سے ہوئی ہے۔ اس نے فوراً ان دونوں کو بلا بھیجا۔ اپنے سامنے انہیں درّے لگوائے اور پھر انہیں مدرسۂ عذارویہ میں بند کرا دیا۔

امیر عساف ابن احمد بن حجی اور شاذّ الدوادین..... نصرانی کی حمایت پر کمر بستہ ہو گئے۔ اس کی وجہ سے خود مسلمانوں میں سخت اختلاف اور انتشار پیدا ہو گیا۔ نائبِ سلطنت نے اس مسئلے کے متعلق کئی مجلسیں منعقد کیں اور علمائے وقت سے بحثیں کیں۔ امام ابن تیمیہ نے اس مسئلہ پر ایک ضخیم کتاب ہی لکھ ڈالی جو" مجلس دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن" سے " الصارم المسلول علیٰ شاتم الرّسولؐ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں اس مسئلے پر چار پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ پہلا یہ کہ نبی کریم ﷺ کے گالی دینے والے کو چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر قتل کر دینا چاہئے۔ دوسرا یہ کہ اس کا قتل واجب ہے چاہے وہ ذمی ہی کیوں نہ ہو، زرِ فدیہ لے کر یا اس کے ساتھ احسان کر کے اس کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ تیسرا یہ کہ گالی دینے والے کو چاہے وہ مسلمان ہو یا کافر، قتل کر دینا چاہئے۔ اس سے توبہ نہیں کروانی چاہئے۔ اگر یہ معاملہ سلطان تک پہنچ جائے اور اس پر الزام ثابت ہو جائے تو توبہ کرنے پر بھی اس کی حد ساقط نہیں ہوتی۔ چوتھا یہ کہ نبیؐ کریم ﷺ کو گالی دینے والا کافر ہے چاہے وہ اس کو حلال سمجھے یا حلال نہ سمجھے۔

اس مسئلے کی نوعیت چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ یہ کتاب امام ابن تیمیہ کے وسعتِ علم اور ان کے اجتہادات و استنباطات کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ قرآن مجید، احادیثِ رسولؐ اور آثارِ صحابہؓ و تابعین و اقوال ائمّہ سلف کو جس زور و قوّت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کتاب کے مطالعے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس ایک مسئلے پر اتنی بڑی ضخیم کتاب کا لکھ دینا ان کے غیر معمولی علم و فضل کی ایک زبردست شہادت ہے۔

امام ابن تیمیہ کی اس مدلّل بحث کے فوراً بعد ہی اس نصرانی نے اسلام قبول کر لیا اور نائب سلطنت کے سامنے اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس نے آنحضرت ﷺ کی شان میں بے ادبی نہیں کی اور اس پر محض جھوٹی تہمت لگائی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

امام ابن تیمیہ کی تحریر کے بعد اس نصرانی کو بچانے کے لئے ایک تدبیر نکالی گئی تھی۔"(امام ابن تیمیہ۔مطبوعہ نعمان پبلیکیشنز۔شائع شدہ2014ء،صفحہ98تا100)

کتاب" امام ابن تیمیہ" کے بارے میں اس اقتباس کا سر سری جائزہ لیا جائے تو اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔

اوّل : یہ ماحول کیا تھا اور اس ماحول میں امام ابن تیمیہ کا اپنا کردار کیسا تھا؟

دوم : یہ کہ اس کتاب کی ماہیّت اور حیثیت کیا ثابت ہوتی ہے ؟

اوّل پہلو کے منظر اور ماحول میں

۱) امام ابنِ تیمیہ کے طرزِ عمل میں بلوہ خیزی نمایاں ہے۔

۲) قرآنی حکم کے تحت اولوالامر کی اطاعت کی بجائے کھلی کھلی بغاوت موجود ہے۔

۳) واضح طور پر ملکی قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی جسارت کی گئی ہے۔

دوسرے پہلو کے لحاظ سے

۱) جس سرعت سے یہ کتاب تحریر کی گئی ہے اس میں تحقیق بلکہ سچائی کا حق ادا نہیں ہوا۔

۲) جس ماحول اور اثر میں کتاب لکھی گئی ہے، متشدّدانہ اور باغیانہ ہے۔

۳) ہنگامی طور پر تصنیف کی گئی اس کتاب میں جو روایات استعمال کی گئی ہیں ان میں سے اکثر کے مأخذ معدوم ہیں۔

۴) اس کتاب کی بنیاد اور غرض کے جو چار پہلو بتائے گئے ہیں، وہ اس موقع پر بھی پورے نہیں ہو سکے۔ جس سے عملاً یہ کتاب اسی وقت ردّ کر دی گئی تھی۔ یعنی وہ عیسائی خواہ جان بچانے کی غرض سے، منافقت سے یا حقیقی ایمان کی وجہ سے مسلمان ہوا، یہ سزا اس سے ساقط کر دی گئی اور اسے قتل نہیں کیا گیا۔ یعنی کتاب کی غرض یہ تھی کہ شاتمِ رسول ؐ کو بہر حال قتل کیا جائے گا، قابلِ عمل نہ سمجھا گیا۔

۵) اس کتاب میں جو علم و فضل ہے اس کا کسی حد تک حال ہم گزشتہ صفحات میں واضح کر آئیں ہیں۔

٦) محمد یوسف کوکن صاحب کی اس تحریر کو آج اپنے وطنِ عزیز کے حالات پر پیش کریں تو اس وقت کے دمشق کا اور یہاں کا منظر بعینہٖ ایک ہی ہے۔ کسی شخص پر تہمت بھی جھوٹی لگائی جاتی ہے، بلوہ بھی کیا جاتا ہے، ایک شخص کو ملزم قرار دے کر جبر و تشدّد کا نشانہ بنایا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات ماورائے عدالت جان سے مار دیا جاتا ہے۔ ہاں کوئی ملزم اگر بچ جائے اور اس کا مقدّمہ عدالت میں پہنچ جائے تو عدالت میں وہ الزام بھی جھوٹا ثابت ہوتا ہے اور ملزم قتل سے بچ بھی جاتا ہے۔ الغرض نو سو سال بعد بھی ماحول اور فضا وہی ہے جو غاصبانہ، ظالمانہ اور متشدّدانہ ہے۔

یہ باب ہمیں توجہ دلاتا ہے کہ کتاب ''الصارم المسلول'' کی بجائے کثرت سے قرآن کریم اور سنّت و احادیثِ نبویہ ؐ کی امن و سلامتی اور عفو و درگزر والی تعلیمات کی ترویج دی جائے۔ اسلام کا اصل اور سچّا ورثہ یہ ہے۔

*****

یٰا رَبِّ صَلِّ عَلیٰ نَبِیِّکَ دَائِمًا

فِی ھٰذِہِ الدُّنْیَا وَ بَعْثٍ ثَانٍ

باب چہارم

قتلِ شاتم کے مسئلے پر اجماع کا ڈھونگ

*****

اجماع سے مراد امّتِ مسلمہ کے اربابِ حلّ و عقد اور اجتہاد کا ملکہ رکھنے والے اصحابِ علم کا کسی ایسے مسئلے کے بارے میں اتفاق ہے جس کی ٹھیک ٹھیک وضاحت قرآن یا سنّتِ ثابتہ میں موجود نہ ہو۔ صحابہؓ کے ایسے اتفاق اور اجماع کو اہلِ السنّت والجماعت حجّتِ شرعیہ تسلیم کرتے ہیں۔ (محاضرات فی تاریخ المذاہب الفقھیّۃ صفحہ 73،72۔ از الاستاذ محمد ابو زہرہ۔ مطبوعہ مطبع المدنی ناشر جمیعۃ الدّراسات الاسلامیۃ)

صحابہؓ کے بعد آنے والے مجتہدین کے اتفاق کی کیا اہمیّت ہے؟ اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اصولاً یہ اتفاق بھی اجماع اور واجب التسلیم ہے۔ بعض دوسرے اہلِ علم کا کہنا ہے کہ دورِ صحابہؓ کے بعد ایسے اجماع کا وجود مشتبہ ہے۔ نہ یہ معیّن ہے کہ بعد کے زمانے میں کون کون علماء درجہ اجتہاد پر فائز تھے اور کہاں کہاں اور کس کس ملک میں وہ رہتے تھے۔ اور نہ کسی مسئلے پر ان سب کے اتفاق کا علم عملاً میسّر آسکتا ہے۔ ''لَا یُمْکِنُ اَنْ یَّتَفِقَ الْعُلَمَاءُ فِی کُلِّ الْاَقَالِیْمِ الْاِسْلَامِیَّۃِ الْمُتَنَاہِیَّۃِ عَلَی رَأْیٍ وَاحِدٍ'' (محاضرات فی تاریخ المذاہب الفقھیّۃ صفحہ 74) کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام ممالک اسلامیہ کے علماء ایک رائے پر متفق ہوں۔

امام مالکؒ اہلِ مدینہ کے اجماع کو بھی بطور حجّتِ شرعیہ تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ اہلِ مدینہ صحابہؓ کے عملِ مستمر کے شاہد اور گواہ ہیں اور ان کے اتفاق کو جو انتخابِ خلافت کے سلسلے میں تھا واجب التسلیم مانا گیا ہے۔ (محاضرات فی تاریخ المذاہب الفقھیّۃ صفحہ 78 از الاستاذ محمد ابو زہرہ مطبوعہ مطبع

المدنی ناشر جمیعۃ الدّراسات الاسلامیۃ۔ و مالک بن انس صفحہ 174 از عبد الحلیم الجندی مطبوعہ دارالمعارف القاھرہ مصر 1983.)

شیعہ بھی اپنے مجتہد علماء کے اجماع کو شرعی حجّت اور واجب التسلیم قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا یہ اجماع اگر غلط ہوتا تو امام غائب خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ ضرور ظاہر ہو کر اس کی تصحیح فرما دیتے۔ (محاضرات فی تاریخ المذاہب الفقھیّۃ صفحہ 77)

اجماع کے بارے میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی حیثیت نہ قرآن مجید یا حدیث کی سی ہے نہ اس کے مقابل پر اس کا کوئی مقام ہے۔ ہاں وہ ان کے تابع ہو تو اس کی کوئی حیثیت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ آیاتِ قرآنیہ یا احادیث صحیحہ میں تبدّل نہیں ہو سکتا اور یہ مقام اجماع کا بہر حال نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی مجدّد بارہویں صدی تحریر فرماتے ہیں۔

”یہ ممکن ہے کہ جس بات پر آیت صادق آتی ہے، وہ اجماع کے مطلب کی موافقت میں نہ ہو۔“ (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر۔ ترجمہ صفحہ 204 مطبوعہ 1960 ناشر اردو اکیڈمی سندھ کراچی)

پس اگر اجماع کسی غلط موقف پر قرار دیا جا رہا ہو اور آیتِ قرآنی یا صحیح حدیث اس کے خلاف کھڑی ہو تو وہ اجماع نہیں کہلا سکتا۔ وہ یقیناً بگڑا ہوا مسئلہ ہے۔

اجماع کے حجت ہونے پر بھی علمائے امّت میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ”قَالَ جَمَاعَةٌ مِنْهُمُ الرَّازِيُّ وَالآمَدِيُّ، اِنَّهٗ لَا يُفِيْدُ اِلَّا الظَّنَّ۔“ (ارشاد الفحول للشوکانیؒ۔ مطبع دار الفضیلۃ للنشر و التوزیع الریاض۔ صفحہ 375۔ المقصد الثانی۔ الاجماع و فیہ ابحاث، البحث الثالث) کہ علماء کی ایک جماعت جن میں امام رازی اور علاّمہ آمدی بھی شامل ہیں، اس خیال کے قائل ہیں کہ اجماع سے یقین نہیں، صرف

ظنّ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک اجماعِ صحابہؓ کا تعلق ہے تو علماء کی بھاری اکثریت قائل ہے کہ ”اِجْمَاعُ الصَّحَابَةِ حُجَّةٌ بِلَا خِلَافٍ“(ایضاً صفحہ 388۔البحث السابع) کہ صحابہؓ کا اجماع صحیح حجّت ہے۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

قتلِ شاتم کے مسئلے پر نام نہاد اجماع کی پگڈنڈی:

قتلِ شاتم پر نام نہاد اجماع کی پگڈنڈی بظاہر (ابو عبد اللہ) محمد بن سَحْنُون سے شروع ہوتی ہے۔(یہ نام دونوں طرح یعنی 'س' کی فتحہ اور 'س' کی ضمّہ کے ساتھ بولا جاتا ہے) یہ شام کے قبیلہ تنوخ سے تھے۔ المغرب (مراکش) میں اپنے دور کے مالکی فقہ کے ایک بڑے عالم اور مفتی قرار دیئے گئے ہیں۔ جو202ھ میں پیدا ہوئے اور256ھ میں فوت ہوئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پیشے کے لحاظ سے یہ ایک سکول استاد تھے۔ ان کے والد (سحنون) عبد السلام بن سعید التنوخی المغربی القَیروانی بھی مالکی فقہ کے ایک عظیم عالم قرار دیئے گئے ہیں۔ لکھا ہے کہ انہوں نے حضرت امام مالکؒ کے شاگردوں ابن القاسم، ابن وہب اور اشہب سے براہِ راست علم حاصل کیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محمد ابن سحنون نے قریباً دوسو (200) کتب تصنیف کیں۔ان کی طرف منسوب ایک کتاب ”فتاوٰی ابن سحنون“ جو ادارہ دار ابن القیم للنشر والتوزیع الریاض سعودی عرب اور ادارہ دارابن عفان للنشر والتوزیع القاہرہ مصر کی مشترکہ اشاعت ہے، 2011ء میں پہلی بار طبع ہوئی۔ یہ انٹرنیٹ پر موجود ہے۔اس کے دیباچے میں ان کی بیس کے قریب کتب کے نام درج ہیں۔ جن میں ایک کتاب کا نام ”رسالة فیمن سبّ النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ بھی ہے۔یعنی یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے والے کی بابت ہے۔ مگر یہ کتاب عملاً دستیاب نہیں ہے۔ بلکہ

یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کبھی تھی بھی یا نہیں۔ بہر حال یہ ان کی طرف منسوبہ کتب کی فہرست میں شامل ہے۔

محمد بن سحنون کی ان مزعومہ یا ان کی طرف منسوب دو صد کتب میں سے جرمن محقق ڈاکٹر سبستیان گوئینتھر (Dr Sabestian Guenther) کے مطابق چوبیس (24) کتب کے بارے میں خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ ان کی ہیں۔ لیکن ان میں سے صرف تین (3) ہیں جو محفوظ ہیں۔ وہ اپنے تحقیقی مقالے "Advice for Teachers" میں لکھتے ہیں کہ ابن سحنون کی صرف ایک کتاب یعنی ''کتاب آداب المعلّمین'' ہے جو اُن کی اپنی تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔

یہ مذکورہ بالا کتاب فتووں کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس میں اساتذہ و معلّمین کو تعلیم و تدریس کے آداب و طریق بتائے گئے ہیں۔

جہاں تک دوسری کتاب '' فتاوٰی ابن سحنون'' کا تعلق ہے تو یہ ان کی اپنی تصنیف نہیں ہے بلکہ بعد میں مختلف لوگوں نے فتاوٰی جمع کئے ہیں اور اس مجموعے کو ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس میں عام دینی اور فقہی مسائل مذکور ہیں۔ توہین و تنقیص النبیؐ پر کوئی بحث موجود نہیں ہے۔

تیسری کتاب ''کتابُ الاَجوِبَہ'' ہے۔ یہ کتاب سوالات و جوابات کی طرز پر مرتب کی گئی ہے۔ اس میں بھی توہین و تنقیص النبیؐ پر کوئی سوال و جواب نہیں ہے۔ یہ بھی ابن سحنون کی اپنی تألیف نہیں ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک شاگرد محمد سالم نے ترتیب دی ہے اور اس میں دوسروں نے بھی اضافے کئے ہیں۔

ان کتابوں کے بارے میں مالکی فقہ کے عالم امام ابو العباس احمد بن عبد العزیز الھلالی المالکی المغربی اپنی کتاب " نور البصر " میں لکھتے ہیں:"وَقَدْ حَذَّرَ الْعُلَمَاءُ مِنْ تَأْلِيْفٍ مَوْجُوْدَةٍ بِأَيْدِى النَّاسِ تُنْسَبُ إِلَى الْأَئِمَّةِ، وَ نِسْبَتُهَا بَاطِلَةٌ"کہ علماء نے لوگوں کو ان کے پاس موجود تالیفات سے خبر دار کیا ہے جو ائمّہ کی طرف منسوب ہوتی ہیں اور حال یہ ہے کہ وہ (ان ائمّہ کی طرف) باطل طور پر منسوب ہیں۔(نور البصر فی شرح خطبۃ المختصر صفحہ 130 دار یوسف بن تاشفین۔ مکتبہ امام مالکؒ)

امام الحجوی کتاب " الفکر السّامی "میں لکھتے ہیں:" وَ حَذَّرُوْا مِنْ أَجْوِبَةِ مُحَمَّدِ بْنِ سَحْنُوْنَ، فَلَا تَجُوْزُ الفَتْوٰى مِنْهَا بِوَجْهٍ مِنَ الْوَجْه، "کہ انہوں نے محمد بن سحنون کی(طرف منسوب) کتاب 'الاجوبہ' سے خبر دار کیا ہے کہ ایک وجہ سے اس سے فتوٰی (لینا) جائز نہیں۔ (الفکر السّامی فی تاریخ الفقہ الاسلامی۔ محمد بن الحسن الحجوی الثعالبی۔ المکتبہ التوفیقیہ۔ ونور البصر صفحہ 130) یہ مذکورہ بالا حقائق انٹرنیٹ پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

ان حقائق کے تناظر میں آسانی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بنیاد جو محمد بن سحنون کے فتاوٰی پر قائم کی گئی تھی بالکل کمزور اور بے اعتبار بنیاد ہے۔ ایسی بنیادوں پر تو دم بھر کے لئے ریت کے گھروندے بھی نہیں ٹھہرتے کجا یہ کہ ان پر بنیادی مذہبی عقائد کو استوار کیا جائے۔

قتلِ شاتم کے بارے میں دستیاب کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن سحنون کے حوالے سب سے پہلے سپین کے قاضی عیاض نے اپنی کتاب " الشفا" میں دیئے ہیں۔انہوں نے یہ حوالے درج کرتے ہوئے ان کی درایت یا ان کے استناد کی کوئی فکر نہیں کی۔ انہوں نے ابن سحنون کی کسی کتاب کا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا۔ وہ علمی تحقیق کا حق ادا کئے بغیر انہیں درج کرتے چلے گئے ہیں۔یعنی یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ محض بے سند اور لاپتہ عبارتیں ہیں۔

قاضی عیاض نے شاتمِ رسولؐ کے قتل کے فتاوٰی اور مختلف مسالک کے فقہاء کی جو تحریریں یا اقوال جمع کئے ہیں یا ان کی طرف منسوب کئے ہیں، وہ انہیں اس نظریئے کی تقویّت کے لئے بار بار استعمال کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کا ایسا کرنا اس مخصوص نظریئے کو کسی طور بھی سچا ثابت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ تحریریں یا اقوال بنیادی طور پر قرآن کریم، سنّتِ نبوی اور سیرت و شمائلِ نبوی ﷺ کے کلّیۃً مخالف اور متصادم ہیں۔ مخصوص محرّکات، منظر اور پس منظر میں ان فقہاء و علماء کے دیئے گئے فتووں سے کسی طرح بھی شریعت نہیں بدل سکتی۔

ابن سحنون کی طرف منسوب فتوے اگر ایک لمحے کے لئے ان کے اپنے فتوے تسلیم بھی کر لئے جائیں تو بھی ابن سحنون کو بعض لوگوں کی طرف سے دیا گیا مقام یا ان کی اپنی تصنیفی خدمات انہیں شارع تو نہیں بنا سکتیں۔ اسی طرح بعض مخصوص مسلک کے علماء کا نام نہاد اجماع شریعت میں تبدیلی پیدا کرنے کی اہلیّت نہیں رکھتا۔

پھر یہ بھی ایک الگ بحث ہے کہ ابن سحنون خود مالکی مسلک کے ہیں۔ ان کے فتوے یا تحریریں دوسرے مسالک کے لئے کیونکر قابلِ عمل قرار دیئے جاسکتے ہیں اور وہ کیوں ان کے لئے حجت ٹھہرا دیئے گئے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ چونکہ مذہب کی آڑ میں قتل و خون مقصود تھا، اس لئے ان کے فتووں کو باوجود اختلاف مسلک کے اس ذہنیّت کے علماء نے اختیار کیا اور ان سے حجّت لی۔

اس خاص موضوع کے علاوہ ابن سحنون کا نام عام طور پر کسی مسئلے میں کہیں ایسے مقام کے طور پر نظر نہیں آتا کہ وہ ایسے عالم یا امام قرار پائے گئے ہوں کہ ان کے فتوے اہمیّت کے ساتھ حجت سمجھے گئے ہوں۔ ویسے بھی وہ کوئی ایسے قابلِ تقلید امام نہیں تھے۔ پس صاف ظاہر ہے کہ ابن سحنون کا نام اور ان کی طرف منسوب کئے گئے نظریات ایک خاص مکتبۂ فکر کے لوگوں کو

صرف مخصوص مقاصد کے لئے محبوب تھے اور آج بھی بغیر کسی تحقیق کے محض اپنے ایسے ہی مقاصد کے حصول کے لئے ان کا نام گھسیٹا جاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر کی سطور سے ظاہر ہے کہ ابن سحنون کے بعد سپین کے قاضی عیاض اجماع کی اس نام نہاد پگڈنڈی پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ قاضی عیاض، ابنِ سحنون کے تقریباً دو اڑھائی سو سال بعد یعنی چوتھی صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپؐ کے اخلاق و شمائل پر بہت خوبصورت کتاب "الشفاء بتعریف حقوق المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم" مرتب کی مگر افسوس ہے کہ اس کے آخری باب میں قتلِ شاتم کے خوفناک مسئلے کو ثابت کرنے کی کوشش میں ساری کتاب کے حسن کو داغدار کر دیا ہے۔

پھر قاضی عیاض کے تقریباً دو سو سال بعد امام ابن تیمیہ کا زمانہ ہے۔ یعنی چھٹی صدی ہجری۔ ان کی طرف منسوب کتاب "الصارم المسلول علیٰ شاتم الرسولؐ" میں اس پگڈنڈی کو اختیار کیا گیا ہے۔ شتمِ رسولؐ کی سزا قتل ثابت کرنے کے لئے یہ ایک بڑی مفصّل اور ضخیم کتاب لکھی گئی ہے۔ پھر ان کے بعد مختلف لوگوں نے انہی مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے خوشہ چینی کی ہے۔ متأخرین نے کوئی نئی تحقیق یا نئی بات نہیں لکھی۔ مگر ہر ایک نے یہ دعویٰ ضرور کیا ہے کہ امّت کا اس مسئلے پر اجماع ہے۔

اس اجماع کی حقیقت:

یہ درست ہے کہ بعض فقہاء یا علماء نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے کہ شاتمِ رسولؐ کی سزا قتل ہے۔ چنانچہ ان کی آراء کو جمہور کا مسلک یا علماء کا اجماع قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہاں یہ مدّ نظر رکھنا چاہئے کہ تصنیفات میں یہ نظر آتا ہے کہ فقہاء کا ایک عام طریق یہ بھی ہے کہ وہ

دوسری آراء بھی درج کرتے ہیں جبکہ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کا اس رائے پر یا اس زیرِ بحث مسئلے پر اتفاق بھی ہو۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ اپنی تحقیق یا دلیل پیش نہیں کرتے اور نہ ہی وہ اسے اپنا موقف قرار دیتے ہیں۔ مگر ایک قاری اپنے مسلک یا نظریئے کے مطابق اسے ان کا موقف قرار دے دیتا ہے۔ یہی مذکورہ بالا طریق ہمیں روایات کے اخذ کرنے میں بھی نظر آتا ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں مولانا عبد الحیٰ لکھنویؒ کی کتاب ''الرفع والتکمیل'' کے حوالے سے ذکر ہو چکا ہے کہ امام بخاریؒ نے بعض ایسے راویوں سے بھی روایات لے لی ہیں جن پر پہلوں نے طعن کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے ایک دفعہ جو روایت درج کر لی، بعد میں اسے نقل کرنے والوں نے بغیر کسی دلیل اور تحقیق کے اپنے مجموعوں یا تصنیفات میں درج کر لیا ہے۔ بعینہٖ نظر آتا ہے کہ بعض فقہی مسائل یا فتاوٰی کو کتاب ''الشفاء'' یا کتاب ''الصارم المسلول.......'' وغیرہ تصنیفات میں بھی جمع کر دیا گیا ہے اور اس فتوے یا مسئلے کی کچھ متعلقہ یا غیر متعلقہ وجوہات بیان کر دی ہیں اور اسی کو اجماع قرار دے دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ کسی طرح بھی شرعی لحاظ سے یا شرعی اصطلاح کے مطابق اجماع نہیں کہلا سکتا۔ کیونکہ دراصل یہ تقلیدی طور پر ایک دوسرے کی آراء پر بعض لوگوں کا اتفاق ہے، امت کا اجماع ہرگز نہیں ہے۔ پس یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والے کی سزائے قتل پر امّت کا اجماع ہے، درست نہیں ہے۔ ہاں اسے معدودے چند علماء کا کسی رائے پر تقلیدی اتفاق تو کہا جا سکتا ہے، اجماع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

قتلِ شاتم پر لکھی گئی کتب میں چاروں مسلکوں کے علماء کے اتفاق کا ذکر بار بار کیا گیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ان میں بعض علماء بالکل غیر معروف و غیر مشہود ہیں جن کا کوئی معیّن ذکر معلوم نہیں ہے۔ ان علماء کی حیثیت کیا تھی اور ان کا مقام کیا تھا

وغیرہ وغیرہ امور نادر دہیں۔ اس لئے محض ان کے ذکر کو اجماع قرار دینا شرعی لحاظ سے ہر گز درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو امّت پر ایک ظالمانہ دھونس جمانے کی جسارت ہے۔

علاوہ ازیں ان کتب میں اس مسئلے پر تمام مکاتیبِ فکر یا تمام مسالک کے علماء کے اجماع کا دعوٰی محض ایک دعوٰی ہے جو باوجود شدید کوشش کے ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ اجماع کے اس دعوے میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہوئی بڑی بڑی مفارق دراڑیں اور بڑے بڑے اختلافی شگاف ہیں جو بذاتِ خود منادی کر رہے ہیں کہ اس مسئلے پر اجماع کا یہ دعوٰی جھوٹا ہے۔ یہ دراڑیں اور شگاف جزوی پہلوؤں میں بھی ہیں اور کلّی پہلوؤں میں بھی۔

جزوی لحاظ سے مثلاً یہ لکھا جاتا ہے کہ مسلمان گالی دے تو قتل کیا جائے اور ذمی دے تو اسے قتل نہ کیا جائے، عورت ہو تو اسے قتل نہ کیا جائے، خواہ وہ مسلمان ہو یا ذمی وغیرہ وغیرہ۔

کلّی لحاظ سے یہ کہ امام ابو حنیفہؒ نے واضح طور پر شرک کو گالی سے بڑا جرم قرار دیا ہے۔ یعنی بتایا ہے کہ اگر شرک موجبِ قتل نہیں ہے تو گالی کی سزا قتل کیسے ہو سکتی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی ایک حدیث پیش کر کے اپنا موقف پیش کر دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نشان کردہ تین جرموں کے علاوہ کسی اور جرم کی سزا قتل نہیں ہے۔ نیز یہ بھی کہ گستاخی کرنے والے کو قتل کی سزا دینے کا اختیار بھی رسول اللہ ﷺ کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہے۔ یہ ساری بحثیں انہی کتابوں میں مذکور ہیں جو از خود اندرونی شہادتوں ہی سے ایسے نام نہاد اجماع کا تار و پود بکھیر رہی ہیں۔

گزشتہ صفحات میں ان تمام روایات کے بارے میں ٹھوس دلائل اور قطعی ثبوت مہیّا کئے گئے تھے اور ثابت کیا گیا تھا کہ یا تو وہ خود قابلِ استناد نہیں ہیں، یا ان سے جو استدلالات کئے گئے ہیں وہ بوجوہ و دلائل قابلِ ردّ ہیں۔ ایسی کمزور، ضعیف، جعلی اور وضعی روایات یا غلط

استدلالات پر اگر بعض علماء کی آراء اتفاق کرتی ہیں تو وہ کسی بھی تعریف کے لحاظ سے امّت کا اجماع نہیں ہے۔

یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ بعض مخصوص مزاج کے علماء اور حکمرانوں کے فتووں اور ان کے عمل پر اگر شریعت کے احکام استوار ہوتے ہیں تو امّتِ مسلمہ کے لئے اس سے بڑی بدنصیبی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت ﷺ نے اگر یہ سزا مقرر نہیں فرمائی تھی تو باقی لوگوں کی مقرر کردہ سزائیں ان کے اپنے موقف ہیں، اسلامی احکام نہیں ہیں۔ وہ لوگ نہ تو شارع ہیں اور نہ ہی وہ امّت کے لئے اسوہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے اصل نمونہ اور اسوہ آنحضرت ﷺ کو قرار دیا ہے۔ اس پاک اور پُر رحمت اسوے کے خلاف کسی کا فتویٰ یا عمل کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ثابت کیا گیا ہے کہ یہ عقیدہ کہ رسول اللہ ﷺ کو گالی دینے والے کو قتل کر دیا جائے، قرآن کریم کے خلاف، آپؐ کی تعلیمات اور پاک اسوے سے متصادم ہے۔ یہ عقیدہ ایک گمراہ کن، اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانے والا اور آپؐ کی پاک ذات پر خون کے دھبے لگانے والا عقیدہ ہے۔ آپؐ کی پیشگوئی کے مطابق امّت کبھی بھی گمراہی پر اکٹھی ہوئی نہ ہو گی۔ چنانچہ ازمنۂ گزشتہ میں بھی ائمہ اس عقیدے کو ردّ کرتے آئے ہیں اور اس دور میں بھی اسے ناقابلِ تردید دلائل کے ذریعے ردّ کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ اس تناظر میں حسبِ ذیل چند امور قارئین کی خدمت میں پیش ہیں۔

۱: اس باب میں ایک بنیادی اور قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ مجموعی جائزے کے مطابق امّت کے حقیقی سوادِ اعظم خلفائے راشدینؓ، مجدّدینؒ، اولیاء اللہؒ، اور ائمّہ سلفؒ ہیں۔ ان کی اکثریت بلکہ وہ تمام اس مسئلے میں بالکل خاموش ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی

کسی کو محض اس کے سبّ و شتم کی وجہ سے قتل نہیں کیا بلکہ معمولی سی بھی سزا نہیں دی۔ یہ تو محض خاص مزاج کے علماء ہیں جو ایسی آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں کہ شاتمِ رسولؐ کو قتل کیا جائے۔ اکثر اوقات ایسے علماء کے ساتھ وقت کی حکومتیں بھی کارفرما نظر آتی ہیں جو اپنے مخصوص مسائل کا حل سمجھتے ہوئے ایسے ظالمانہ نظریات کی پشت پناہی کرتی ہیں اور ان کی تشہیر و نفاذ میں مدد کرتی ہیں۔ یہ مخصوص طبقہ ہرگز امّت کا سوادِ اعظم نہیں ہے۔ لہٰذا اس مسئلے پر امّت کا قطعی طور پر اجماع نہیں ہے۔ آپ اس موضوع پر تمام کتابوں کا جائزہ لے لیں تو آپ کو خاص مکتبۂ فکر کے اور خاص مزاج کے محض چند لوگ ہی نظر آئیں گے جو یہ نعرہ بلند کر رہے ہوں گے۔ اس لئے محمد بن سَحنون ہوں یا قاضی عیاض، الصارم المسلول...... کے مصنّف ہوں یا بعد کے چند نقّال مصنّفین، جب اجماع کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ محض ایک دھونس کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ جو نظائر اور ثبوت وہ اس کے حق میں دیتے ہیں، بالکل کھوکھلے، بودے اور بے بنیاد ہیں۔ جیسا کہ ان کی علمی اور حقیقی حیثیت روایات والے باب سے بالکل واضح اور عیاں ہے۔

ایسی کتابوں میں بار بار یہ لکھا گیا ہے کہ حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی سب اس سے متفق ہیں۔ لہٰذا ساری امّت کا اس پر اجماع ہے۔ ایسا بیان محض ایک دھوکہ اور ڈھٹائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ائمّہ اربعہ میں سے امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کو بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ خود اس سے متفق نہیں تھے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ سے بھی کسی مستند صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں ہے۔

علمائے سلف نے اگر اس مسئلے پر قلم اٹھایا ہے تو ان کی نیّت پر ہمیں کسی قسم کا اعتراض نہیں۔ ہر ایک اپنا موقف اختیار کر سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے موقف کے حق میں جو مواد پیش کیا

ہے، اس پر ہم نے علمی جرح کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان کا پیش کردہ مواد مستند نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس پر قائم کئے گئے ان کے دلائل بھی درست نہیں ہیں۔

اس کے مقابل پر آنحضرت ﷺ سے لے کر اب تک یعنی پندرہ صدیوں میں پھیلے ہوئے مسلّمہ علمائے ربّانی میں سے چند ایک کے نام پیش ہیں۔ یہ بزرگ وہ ہیں جن پر تمام عالمِ اسلام فخر کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ہمیں ان دلائل، عقائد یا موقف پر کھڑا نظر نہیں آتا جن پر قتلِ شاتم کے قائل علماء یا فقہاء قائم تھے۔ یہ سب علمائے ربّانی اس نام نہاد اجماع میں کہیں بھی شامل نہیں ہیں۔

یہ باخدا علمائے اسلام وہ ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے آج تک ہر ایک صدی میں موجود رہے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے بیمثال صاحبِ کشف و الہام، اولیاء اللہ، مجتہد، متکلّم، محدّث، متبحّر عالم اور مفسّر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے غیر مسلموں پر حجّت اور امّت کے لئے ایمان و ہدایت کے سامان فرماتا رہا ہے۔ جیسا کہ حضرت سیّد عبد القادر جیلانیؒ، ابوالحسن خرقانیؒ، ابو الحسن الشعریؒ، ابو شرحؒ، ابویزید بسطامیؒ، جنید بغدادیؒ، محی الدین ابن العربیؒ، ابو عبید اللہ نیشاپوریؒ، قاضی ابو بکر باقلانیؒ، سیّد علی ہجویری داتا گنج بخشؒ، امام غزالیؒ، امام جلال الدین السیوطیؒ، امام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، صالح بن عمرؒ، ذوالنون مصریؒ، معین الدین چشتی اجمیری، قطب الدین بختیار کاکیؒ، امام محمد طاہر گجراتیؒ، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ، فرید الدین پاک پٹنیؒ، نظام الدین دہلویؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور سیّد احمد شہید بریلویؒ وغیرہم ہیں۔ ان علمائے ربّانی کی تعداد ہزارہا تک پہنچتی ہے۔ ان کے علم و فضل کے واقعات اور تعلیمات پر مبنی کتابیں بکثرت موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی شاتمِ رسولؐ کے قتل کا قائل دکھائی نہیں دیتا۔ اس وسیع منظر میں ایک متشدّدانہ عقیدے پر اجماع کا دعویٰ جھوٹا اور شرمسار دکھائی دیتا ہے۔

اس کے ساتھ اس سچائی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ رسول اللہ ﷺ نے علمائے سوء اور امّت کی گمراہی کی بڑی واضح اور کھلے کھلے الفاظ میں نشاندہی کی ہے۔ گمراہ کرنے والے علمائے سوء کا ذکر مجدّدین و اولیاء اللہ کی تحریروں میں عام ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان علمائے سوء کے پیچھے چلنے والے لوگ مسلمان بھی کہلاتے ہیں اور امّت بھی۔ لیکن ان کا کسی مسئلے میں اتفاق رسول اللہ ﷺ کا یا خلفائے راشدین کا مسلک قرار دینا گناہ بھی ہے اور گمراہی بھی۔ اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ علمائے سوء کا ظالمانہ عقیدہ اور مسلک علمائے ربّانی کا عقیدہ و مسلک نہیں ہے۔ یہ خوں آشام عقیدہ یوں تو اسلام کی پہلی صدی سے ہی کسی نہ کسی رنگ میں جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس نے واضح طور پر علمی اور عملی رنگ میں دوسری صدی میں جڑیں پکڑنی شروع کی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ اس عقیدے کے پیچھے خود غرض حکومتیں یا مخصوص طرز ہی کے علماء ہیں جو کارفرما ہیں۔ پندرہ صدیوں میں پھیلے ہوئے علمائے ربّانی ایسے عقیدے کے علمبر دار نہیں تھے۔

۲: روایات پر بحث والے باب میں ایسی تمام روایات کا تفصیلی علمی اور تحقیقی تجزیہ و حل پیش کیا گیا ہے جو قائلین قتلِ شاتم اپنے موقف کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ اُس باب میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ قتلِ شاتم کے بارے میں فتووں کی بنیاد وہ روایتیں ہیں جن میں غالب اور نمایاں طور پر عبد الرّزاق، واقدی اور عکرمہ ہیں۔ عمومی طور پر یہ افراد ان کے بنیادی مأخذ ہیں۔ انہی کی وجہ سے بھی ایسے متشدّد فتوے پھیلے ہیں۔ جنہیں بعض کتابوں والے بار بار اور بتکرار ہزار لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس مسلسل کوشش سے ایک عام قاری پر یہ تأثر قائم ہونے لگتا ہے کہ اس مسئلے میں گویا بہت سے علماء نے متفق طور پر بہت کچھ لکھا ہے، لہٰذا یہ درست ہے۔ مگر جیسا کہ ہم نے ثابت کیا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ بعض مخصوص طرز کے علماء

کے ایسے نام نہاد اجماع پر امّتِ محمدیہ ہر گز متفق نہیں ہے۔ ہر سچا مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے شریعتِ محمدیہ ایسی شریعت نہیں ہے کہ جس کی بنیادوں کو جھوٹی اور وضعی روایات سے سینچا جائے۔ یہ شریعت اللہ تعالیٰ کی نازل فرمودہ تعلیماتِ بیّنہ پر قائم اور کتبِ قیّمہ پر استوار ہے۔ اس میں ایک ذرّہ برابر بھی ظالمانہ احکام ہیں نہ متشدّدانہ اقدام۔

۳: جہاںتک اس دعوے کا تعلق ہے کہ ساری امّت کا اس مسئلے پر اجماع ہے۔ اس کا ایک مختصر ساواقعاتی جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

حضرت ابو بکرؓ

گزشتہ صفحات میں یہ واقعہ بتفصیل زیرِ بحث لایا جاچکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد پہلے خلیفۃ الرّسول حضرت ابو بکرؓ نے ایک گستاخ کو قتل کی اجازت چاہنے والے شخص ابو برزہ اسلمیؓ کو فرمایا تھا: ' ' لَیْسَ ھٰذَا لِاَحَدٍ بَعْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ ' ' کہ کسی غلطی، جرم یا گناہ پر قتل کی سزا مقرر کرنے کا اختیار صرف رسول اللہ ﷺ کو تھا۔ آپؐ شارع تھے۔ اس حق کی بنا پر یہ آپؐ ہی کر سکتے تھے۔ آپؐ کے بعد یہ حق کسی کو نہیں دیا گیا حتّٰی کہ خلیفۂ راشد کو بھی نہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کے اس قول سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ آپؓ نے امت پر واضح فرمایا ہے کہ جن جرائم کے قتل کا ارشاد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، ان کے سوا کسی اور جرم یا قصور کی سزا قتل نہیں ہے۔ چنانچہ جن افراد کے قتل کا ذکر آپؐ نے بیان فرمایا ہے، وہ تین لوگ ہیں۔ ان میں گستاخِ رسولؐ یا شاتمِ رسولؐ کا کسی روایت میں، کسی جگہ، کوئی ذکر نہیں ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں:

' ' لَا یَحِلُّ دَمُ امْرِیءٍ مُّسْلِمٍ یَّشْھَدُ أَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ أَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَّا بِاِحْدٰی ثَلَاثٍ: رَجُلٌ زَنٰی بَعْدَ اِحْسَانٍ فَاِنَّہٗ یُرْجَمُ وَ رَجُلٌ خَرَجَ مُحَارِباً لِلّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَاِنَّہٗ یُقْتَلُ اَوْ یُصْلَبُ

اَوْ يُنْفٰى مِنَ الْاَرْضِ اَوْ يَقْتُلُ نَفْسًا فَيُقْتَلُ بِهَا" (ابو داؤد کتاب الحدود الحکم فیمن ارتدّ) کہ تین وجوہات میں سے کسی ایک کے صدور کے علاوہ کسی ایسے مسلمان کا خون جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی معبود شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ ایک وہ جو شادی شدہ زناکار ہو، اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دوسرے وہ جو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محاربت کا اعلان کرتا ہوا نکلے، اسے قتل کیا جائے گا، یا صلیب دیا جائے گا یا ملک بدر کیا جائے گا۔ اور تیسرے وہ جو کسی کو قتل کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ (یعنی قصاص میں قتل کیا جائے گا۔)

پس ثابت ہے کہ شارع اسلام رسول اللہ ﷺ نے ان تین کے علاوہ کسی اور جرم میں قتل کی سزا مقرر نہیں فرمائی تو آپؐ سے آگے بڑھ کر یا آپؐ کی شریعت کے برخلاف کسی اور جرم کی سزا میں کسی کو قتل کرنا جائز نہیں۔

حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ:

حضرت ابو بکرؓ کا موقف تو اوپر درج ہو چکا ہے۔ باقی تینوں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے بارے میں کسی مستند اور صحیح روایت یا اثر سے یہ ثابت نہیں ہے کہ انہوں نے کسی گستاخ کو صرف گستاخی کی بناء پر قتل کیا ہو۔ روایاتِ صحیحہ میں ایک بھی ایسی روایت نہیں ہے۔ (جو روایات اس سلسلے میں پیش کی گئی تھیں، ان کی حقیقت کیا تھی؟ یہ گزشتہ باب میں وضاحت کر دی گئی ہے)۔ پس تمام خلفائے راشدینؓ اس نام نہاد اجماع میں شامل نہیں ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ :

عون المعبود فی شرح ابی داؤد میں ''کتاب الحدود باب الحکم فیمن سبّ رسولَ اللہ ﷺ'' کی شرح میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کا قول درج کیا گیا ہے کہ ذمی قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ اس (سبّ وشتم) سے زیادہ بڑا (جرم) ان کا شرک ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا گیا ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے متعلق کتاب ''الصارم.....''میں لکھا ہے کہ حضرت نعمان بن ثابت(امام ابو حنیفہؒ) کا مسلک ہے کہ شاتم رسولؐ قتل نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ شرک پر قائم ہیں جو اس (شتم) سے بہت بڑا جرم ہے اور اس کی کوئی سزا نہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا یہ فتویٰ ہے جو اپنے اندر بنیادی طور پر معقولی اور منطقی وجوہات رکھتا ہے۔ آپؒ کی دلیل یہ ہے کہ تم یہ جو کہتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ کا شاتم لازماً قتل ہونا چاہئے، تو یہ ایک جذباتی بات ہے جو قرآن کے اصولوں سے ٹکرا رہی ہے۔ کیونکہ شرک کو قرآن کریم نے سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ مشرک تو قتل نہ ہوں اور اس سے ادنیٰ جرائم والے قتل ہوں، اسے انسانی عقل تسلیم نہیں کرتی۔ اس لئے امام ابو حنیفہؒ نے اس نظریئے کو بیک جنبشِ قلم ردّ کر دیا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ آئمہ اربعہ میں امام اعظم ہیں اور آپؒ کو دنیائے اسلام میں سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے،۔ مجموعی طور پر ترکی حنفی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی بھاری اکثریت حنفی ہے۔ اسی طرح دیگر ممالک اسلامیہ میں امّت کی ایک بڑی اکثریت حنفی ہے۔ ان سب کے امام کا یہ فتوٰی ہے کہ شاتمِ رسول کی سزا قتل نہیں ہے۔ پس امّت کی اتنی بڑی تعداد کو ایک طرف کرکے قتلِ شاتم کے مسئلے کو امّت کا اجماع کہنا کسی طرح سچا دعوٰی نہیں ہے۔

قاضی عیاض نے بھی یہ لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ اور اہلِ کوفہ میں سے ان کے متبعین رسول اللہ ﷺ کے شاتم کے قتل کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

”فَاَمَّا الذِّمِّیُّ اِذَا صَرَّحَ بِسَبِّہٖ اَوْ عَرَّضَ، اَوِ اسْتَخَفَّ بِقَدْرِہٖ، اَوْ وَصَفَہٗ بِغَیْرِ الْوَجْہِ الَّذِیْ کَفَرَ بِہٖ فَلَا خِلَافَ عِنْدَنَا فِیْ قَتْلِہٖ اِنْ لَّمْ یُسْلِمْ، لِاَنَّا لَمْ نُعْطِہِ الذِّمَّۃَ وَ الْعَھْدَ عَلٰی ھٰذَا، وَھُوَ قَوْلُ الْعُلَمَآءِ، اِلَّا اَبَا حَنِیْفَۃَ وَ الثَّوْرِی وَ اِتِّبَاعَھُمَا مِنْ اَھْلِ الْکُوفَۃِ ، فَاِنَّھُمْ قَالُوا، لَا یُقْتَلُ ،مَا ھُوَ عَلَیْہِ مِنَ الشِّرْکِ اَعْظَمُ، وَلٰکِنْ یُؤَدَّبُ وَ یُعَزَّرُ۔“(الشفاء صفحہ 822،821) کہ جہاں تک ذمی کا معاملہ ہے، جب وہ واضح طور پر آنحضرت ﷺ کو گالی دے یا تعریض سے کام لے یا آپؐ کی شان میں تخفیف کرے یا آپؐ کے وصف میں وہ بات کہے جس سے آپؐ انکار کرتے ہیں۔ تو اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتا تو اس کے قتل کے بارے میں ہمارے ہاں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کیونکہ ہم نے اس بات کے بارے میں اس کی نہ ذمہ داری لی ہے، نہ اس سے کوئی عہد باندھا ہے۔ یہ علماء کا قول ہے سوائے ابو حنیفہؒ اور ثوریؒ کے اور کوفے میں ان کے متبعین کے۔ وہ کہتے ہیں کہ قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان کا شرک اس سے زیادہ بڑا (جرم) ہے۔ مگر اسے تأدیب اور تعزیر کی جائے گی۔

یعنی مسلم اور ذمّی کی بحث تو ایک جزوی بات ہے ۔ امام اعظمؒ نے نفسِ مضمون میں شرک اصل پیمانہ رکھا ہے۔ یعنی شرک کا ارتکاب خواہ مسلمان کرے یا کوئی کافر، وہ سبّ و شتم سے بہر حال بڑا گناہ ہے۔ لہٰذا اگر اس کی سزا قتل نہیں رکھی گئی تو پھر شتمِ رسول ﷺ کی سزا بہر حال قتل نہیں ہو سکتی۔

جہاں تک ذمّی کی بحث کا تعلق ہے تو امام اعظمؒ نے اس سے یہ بھی انتہائی واضح اصول وضع فرمایا ہے کہ ذمی کے گالی دینے سے اس کا عہد نہیں ٹوٹتا۔ جب عہد نہیں ٹوٹتا تو پھر اس وجہ سے بھی اس کے قتل کا جواز بھی کالعدم ہو جاتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ:

عون المعبود فی شرح ابی داؤد کتاب الحدود باب الحکم فیمن سبّ رسولَ اللہ ﷺ میں روایت کی شرح میں حضرت امام مالکؒ کا قول بھی درج کیا گیا ہے کہ سبّ و شتم کرنے والا یہودی و عیسائی قتل کیا جائے گا سوائے اس کے کہ وہ مسلمان ہو جائے۔ (یعنی اسے مہلت دی جائے گی کہ وہ مسلمان ہو جائے)

چنانچہ حضرت امام مالکؒ کی طرف منسوب ایک روایت یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ قاضی عیاض بیان کرتے ہیں کہ ہارون رشید نے حضرت امام مالکؒ سے یہ مسئلہ پوچھا کہ جو شخص رسالت مآب ﷺ کو بُرا کہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ بعض علماء اس کے لئے کوڑے تجویز کرتے ہیں۔ امام مالکؒ نہایت غصے میں آ گئے اور فرمایا کہ امت کے نبی ﷺ کے خلیفۂ وقت! امت کے نبی ﷺ کو گالی دی جائے اور امت اسے ختم نہ کرے تو کیا ایسی امت زندہ رہ سکتی ہے؟ جو شخص کسی نبی کو گالی دے اسے قتل کیا جائے۔

حضرت امام مالکؒ کا زمانہ 93ھ سے 179ھ تک ہے اور مسلمان بادشاہ خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ 170ھ سے 193ھ تک کا ہے۔ یعنی حضرت امام مالکؒ نے ہارون الرشید کی خلافت کے نو دس سال دیکھے ہیں۔

قاضی عیاض سپین کے مفتی تھے۔ ان کے فتووں کی سند اور ان کی حقیقت، اس مثال سے ظاہر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ فتویٰ امام مالکؒ کا ہے۔ لیکن امام مالکؒ کی کسی اور کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا گیا۔ کس نے یہ روایت کی ہے؟ اس کا بھی کچھ پتا نہیں۔ موطا امام مالکؒ میں تو کسی ایسے فتوے کا ذکر نہیں ہے۔ یعنی محض ایک بے حوالہ اور بے سند بات لکھی ہے۔ الغرض ایک وضعی واقعہ ہے جو امام مالکؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ آپؒ شریعت کے کامل پابند اور اس کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے تھے۔ قرآن کریم کی تعلیمات کا انتہائی عرفان رکھتے تھے۔ روایات کی جانچ پڑتال اور چھان پھٹک پر بھی گہری دسترس تھی۔ لہٰذا آپؒ کسی مسئلے میں رسول اللہ ﷺ اور خلیفۃ الرسولؓ کے قول اور عمل سے متصادم فتویٰ نہیں دے سکتے تھے۔ پس واضح طور پر ایسی بات ان کی طرف ازراہِ افتراء منسوب کی گئی ہے۔

جہانتک اس بات کا تعلق ہے جو امام مالکؒ کی طرف منسوب کی گئی ہے کہ "امت کے نبی ﷺ کو گالی دی جائے اور امت اسے ختم نہ کرے تو کیا ایسی امت زندہ رہ سکتی ہے؟" یہ کلام ہی بتاتا ہے کہ ایسا ہرگز امام مالکؒ کی زبانِ مبارک سے ادا نہیں ہوا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی مبارک زندگی میں متعدد لوگوں نے رسول اللہ ﷺ پر سبّ کی۔ آپؐ کے رُوبرو آپؐ کی گستاخی کی۔ نہ آپؐ نے انہیں قتل کیا نہ صحابہؓ نے۔ لیکن امّت پھر بھی زندہ رہی، پنپتی بھی رہی اور بڑھتی بھی رہی۔ تاریخِ امم شاہد ہے کہ کسی کی گالی سے نہ کسی امّت کی زندگی ختم ہوتی ہے نہ کسی شاتم کو قتل کرنے سے کسی امت میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایسی نامعقول بات ہے کہ امام مالکؒ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔

علاوہ ازیں اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آخری زمانے میں احیائے اسلام کی پیشگوئیاں کی ہیں۔ اس زمانے میں آپؐ کی تکذیب اور آپؐ کی شان میں

استہزاء بھی عروج پر ہے۔ اسکے باوجود امّت زندہ ہے اور اسلام سرعت کے ساتھ دیگر ادیان پر غالب ہو رہا ہے۔ تو مذکورہ بالا تبصرہ: ''امت کے نبی صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو گالی دی جائے اور امت اسے ختم نہ کرے تو کیا ایسی امت زندہ رہ سکتی ہے؟ جو شخص کسی نبی کو گالی دے اسے قتل کیا جائے۔'' امام مالکؒ کا نہیں ہے، آپؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ قصہ ہی جھوٹا ہے۔

یہاں یہ بھی مدّ نظر رہے کہ ہارون الرّشید کے اس سوال میں یہ ذکر موجود ہے کہ ''بعض علماء اس کے لئے کوڑے تجویز کرتے ہیں۔'' یہ بیان ایک واضح گواہی ہے کہ سب علماء کا شاتم رسولؐ کے قتل پر اجماع نہ تھا۔ بعض اس کی سزا کوڑے تجویز کرتے تھے۔

حضرت امام شافعیؒ:

حضرت امام شافعیؒ کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس معاملے میں وہ سب سے زیادہ متشدّد تھے۔ مگر ان کا صرف ایک فتویٰ تھا۔ لیکن وہ بھی اس طرح بیان ہوا ہے کہ آپؒ یہ فتویٰ دیا کرتے تھے کہ شاتم رسولؐ کا قتل لازم ہے اور اس پر تمام امت مسلّمہ متفق ہے۔

ان کی اس بات کا کوئی گواہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ ان کا کوئی تحریر شدہ معیّن فتویٰ ہے۔ البتّہ کسی کا محض ایک بے سند بیان ہے جسے امام شافعیؒ کا مسلک قرار دیا گیا ہے۔ بفرضِ محال اگر مان بھی لیا جائے کہ امام شافعیؒ قتلِ شاتم کے قائل تھے اور آپؒ کا مسلک یہی تھا تو بھی یہ صرف انہی کا مسلک تھا اور شافعیوں کے لئے تو قابلِ عمل ہو سکتا ہے، ساری امّت کا مسلک یا اجماع قرار نہیں دیا جا سکتا۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ:

ابو برزہ الاسلمیؓ والی روایت، جس پر روایات والے باب میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔اس پر سنن ابی داوٗد میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہ تبصرہ بھی لکھا ہے :

''اَیْ لَمْ یَکُنْ لِاَبِی بَکْرٍ اَنْ یَقْتُلَ رَجُلًا اِلاَّ بِاِحْدَی الثَّلَاثِ الَّتِیْ قَالَھَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم ، کُفْرٌ بَعْدَ اِیْمَانٍ اَوْ زِناً بَعْدَ اِحْصَانٍ اَوْ قَتْلُ نَفْسٍ بِغَیْرِنَفْسٍ وَکَانَ لِلنَّبِیِّ اَنْ یَقْتُلَ۔'' کہ حضرت ابو بکرؓ اس شخص کو قتل کی سزا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان تین کے علاوہ کسی مسلمان کا خون جائز قرار نہیں دیا۔ یہ تین جرائم ہیں۔ایک وہ شادی شدہ جو زناکار ہو اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دوسرے وہ جو (دین سے) اللہ اور اس کے رسولؐ سے محاربت کا اعلان کرتا ہوا نکل جائے، اسے قتل کیا جائے گا، یا صلیب پر لٹکایا جائے گا یا ملک بدر کیا جائے گا۔ اور تیسرے وہ جو کسی کو قتل کرے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ ہاں ان تینوں کے علاوہ کسی اور جرم پر اگر دے سکتے تھے تو رسول اللہ ﷺ اسے سزائے قتل دے سکتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ کا یہ تبصرہ دوٹوک، فیصلہ کن اور انتہائی بصیرت افروز ہے جو واضح کرتا ہے کہ شاتمِ رسولؐ اس فہرست میں شامل نہیں ہے جو خود رسول اللہ ﷺ نے مرتّب فرمائی ہے۔اس سے زیادہ اس روایت پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ گزشتہ باب میں اس پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے۔

پس ان تین پہلوؤں کی موجودگی میں یہ کہنا کہ توہینِ رسالت کی سزا قتل پر امّت کا اجماع ہے ایک ایسا دعوٰی ہے جس کی بنیاد دھونس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس نام نہاد اجماع یا مبیّنہ دھونس میں اکابر ائمہ ہرگز شامل نہیں ہیں۔

عدمِ اجماع کی ایک اور شہادت:

اوپر کی سطروں میں خلفائے راشدینؓ، ائمہؒ کبار کے ساتھ اہلِ کوفہ کی شہادتیں پیش کی گئی ہیں کہ وہ کسی نہ کسی رنگ میں قتلِ شاتم کے قائل نہ تھے۔ پھر یہ نام نہاد اجماع اس طرح بھی ٹوٹا ہے کہ قاضی عیاض خود ہی اہلِ مدینہ کا موقف یوں لکھتے ہیں:

"وَاخْتَلَفُوا اِذَا سَبَّهُ ثُمَّ اَسْلَمَ، فَقِيْلَ۔ يُسْقِطُ اِسْلَامُهُ قَتْلَهُ، لِاَنَّ الاِسْلَامَ يَجُبُّ مَا قَبْلَهُ، بِخِلَافِ الْمُسْلِمِ اِذَا سَبَّهُ ثُمَّ تَابَ۔" (الشفاء صفحہ 822) ترجمہ: ان کا اس میں اختلاف ہے کہ گالی کے بعد جب وہ اسلام قبول کرلے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا اسلام اس سے سزائے قتل کو ساقط کر دیتا ہے۔ کیونکہ قبول اسلام پہلے کے اعمال کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس کہ ایک مسلمان گالی دے اور پھر توبہ کرے۔ یعنی غیر مسلم رسول اللہ ﷺ کو گالی دے اور پھر اسلام قبول کرے تو اسے قتل نہیں کیا جائے گا اور اگر مسلمان گالی دے تو اسے قتل کیا جائے گا۔

زیرِ بحث کتابوں یعنی الشّفا اور الصارم المسلول وغیرہ میں یہ بھی بڑی تکرار کے ساتھ اور بار بار لکھا گیا ہے کہ شاتم کی توبہ بھی قبول نہ کی جائے گی۔ اسے ہر حال میں قتل کیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی ان کتابوں میں سے ایک نے اہلِ مدینہ کے اختلاف کا ذکر کرکے بتا دیا ہے کہ اس پر سب کا اجماع نہیں ہے۔ ان کتابوں میں ذمّی اور غیر ذمی کے قتل یا عدمِ قتل کی بحثیں بھی اسی حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ امّت کا اس مسئلے پر قطعی طور پر اجماع نہیں ہے۔

ان محکم شواہد کی وجہ سے یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ قتلِ شاتمِ رسولؐ پر کسی طور پر بھی اجماع کا دعوٰی درست نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت اس کے الٹ ثابت ہے۔ کیونکہ خلفائے راشدین، ائمّہ اربعہ، مجدّدین، اولیاء اللہ و صلحائے امّت جن کے نام اس باب میں درج کئے گئے

ہیں، یہی سوادِ اعظم ہیں، یہ سب قتلِ شاتم کے خلاف کھڑے ہیں۔یعنی ان سب کا اجماع قتلِ شاتم کے خلاف ہے۔

*****

یٰا رَبِّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ دَائِمًا

فِی ھٰذِہِ الدُّنْیَا وَ بَعْثٍ ثَانٍ

باب پنجم

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ پاک کا ایک حقیقت افروز تجزیاتی مطالعہ

*****

رسول اللہ ﷺ کے بچپن کے حالات گو بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ دستیاب نہیں ہیں مگر پھر بھی سیرت نویسی کے جملہ تقاضوں کی بھرپور تشفّی کے لئے آپؐ کے بچپن سے نبوّت تک کے حالات مستند اور تسلّی بخش حدّ تک محفوظ ہیں۔ نیز یہ بھی ایک الگ حقیقت ہے کہ آپؐ کی ابتدائی زندگی کے واقعات اتنی تفصیل کے ساتھ دستیاب ہیں کہ گزشتہ انبیاءؑ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ ایک سیرت نویس جب تحقیق کے سچے تقاضے پورے کرتا ہے تو آپؐ کے بچپن اور دورِ جوانی کے حالات میں بھی صبر و تحمّل، عفوو درگزر اور حسنِ اخلاق ہی کو آپؐ کے جملہ افعال واعمال اور اقوال پر غالب پاتا ہے۔ وہ انتہائی کوشش کے باوجود بھی آپؐ کی سوانح میں آپؐ کی کوئی منفی عادت نہیں ڈھونڈھ سکتا۔ آپؐ کا ہر قول اور فعل چاہے وہ نبوّت سے پہلے کا تھا یا بعد کا، مثبت ہی نہیں، غیر معمولی مثبت تھا بلکہ ایک ایک قول اور ایک ایک فعل خوبی و دلکشی میں سوا تھا۔

کسی شخص کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا اندازہ لگانے کے لئے یہ طریق کافی ہے کہ اس کے بچپن اور جوانی کے حالات کا جائزہ لیا جائے۔ اگر تو ابتداء ہی سے وہ شخص زود رنج، غصیلا، تُو تکار کا عادی، جارحیت سے پُر اور لڑنے بھِڑنے پر آمادہ ہو تو اس کی بچپن اور شباب کی عمر میں اس کے اگر کافی نہیں تو چند ایک واقعات ضرور مل جاتے ہیں، جو نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ اپنی طینت اور فطرت ہی میں ایسی عادتیں رکھنے والا تھا۔ مگر جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی خُلقِ عظیم پر استوار

غیر معمولی شخصیّت کا تعلق ہے تو آپؐ کے بچپن اور جوانی کے حالات میں کسی ایک جگہ بھی ایسا ذکر نہیں ملے گا کہ آپؐ نے کسی ہم عمر کے ساتھ کوئی لڑائی جھگڑا یا مار پیٹ تو کجا، اسے ذرّہ بھر بھی دکھ دیا ہو۔ یہاں تک کہ گھر میں بھی کبھی کوئی ضد نہیں کی اور نہ ہی کسی تنگی پر حتّٰی کہ بھوک پیاس پر بھی کبھی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار یا احتجاج کیا۔ چنانچہ آپؐ کی بچپن کی دایہ اور رضاعی ماں حضرت اُمّ اَیمن بیان کرتی ہیں: ''میں نے نبی کریم ﷺ کو کبھی بھی (بچپن میں یا بڑی عمر میں) بھوک یا پیاس کی شکایت کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ (مدارج النبوّۃ (فارسی) از شاہ عبد الحق محدّث دہلوی جلد 2 صفحہ 33 مطبوعہ مطبع فیض منشی نولکشور و(اردو) جلد2صفحہ 38مطبوعہ شبّیر برادر ز اردو بازار لاہور۔2004ء ایڈیشن)

رسول اللہ ﷺ بچپن میں اپنی رضاعی ماں حلیمہ سعدیہ کے ہاں بنو سعد میں رہے۔ بچوں کے ساتھ کھیلے، بکریاں چرائیں اور گھر کے کام کاج کئے مگر ایک بار بھی کسی دھینگا مشتی اور کسی لڑائی جھگڑے میں ملوّث نہیں ہوئے۔

اپنی جوانی کے دَور میں آپؐ کبھی کسی بیہودہ مجلس میں شریک نہیں ہوئے۔ حتّٰی کہ کہانیوں اور شعر و غزل کی مجلسوں میں بھی شرکت نہیں فرمائی۔

آپؐ کے عنفوانِ شباب کے زمانے میں حربِ فِجار ہوئی جو بنو کنانہ بشمول قبیلہ قریش اور قبیلہ قیس عیلان بشمول بنو ہوازن ایک خونریز لڑائی تھی۔ اس میں آپؐ اپنے چچاؤں کے ہمراہ تھے۔ آپؐ اپنی عمر کے تقاضوں کے تحت لڑائی میں بھرپور حصہ لے سکتے تھے۔ مگر امرِ واقعہ یہ ہے کہ لڑائی میں آپؐ کی شمولیت بالکل محدود تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قبائلی حلیف ہونے کے عہد کی وجہ سے آپؐ کو اس لڑائی میں شامل ہونا پڑا مگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے تحت آپؐ کو اس میں جو کردار ملا وہ یہ تھا کہ آپؐ اپنے چچاؤں کو صرف تیر پکڑاتے تھے وبس۔ یعنی عملاً آپؐ لڑائی میں

شامل نہیں ہوئے حالانکہ اس وقت آپؐ کی عمر کم و بیش اٹھارہ بیس سال تھی۔ اس عمر میں تو نوجوان لڑنے بھڑنے میں اپنی طاقت اور مہارت کے جوہر دکھاتے ہیں اوراپنی جان کی پرواہ تک نہیں کرتے۔ پس آپؐ کا یہ طرزِ عمل بتاتا ہے کہ آپؐ کو لڑائی طبعاً ناپسند تھی اورآپؐ فطرتاً امن پسند تھے اور صلح جُو۔

یہ منظر بھی قابلِ دید ہے کہ نبوّت کے بعد جو جنگیں رسول اللہ ﷺ پر مسلّط کی گئیں، ان میں گو آپؐ ہمیشہ میدانِ جنگ کے عین وسط میں رہے مگر آپؐ کی تلوار سے کوئی قتل نہیں ہوا۔ سوائے ایک شخص ابیّ بن خلف کے جو غزوہٗ احد میں للکار تا ہوا اور ’’لَا نَجَوْتُ اِنْ نَجَا‘‘(کہ اگر آپؐ بچ گئے تو پھر گویامیں نہ بچا)پکارتاہوا آپؐ کے سامنے آیا۔ صحابہؓ نے اسے روکنا چاہامگر آپؐ نے فرمایا کہ اسے آگے آنے دو۔ جب وہ آپؐ کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھاتو آپؐ نے اس پر نیزے سے وار کیاجس سے وہ چکرا کر گرااور پھر چیختا چلّاتا ہوابھاگ گیا۔ گو زخم بظاہر زیادہ نہ تھا۔ کفار اسے تسلّی بھی دیتے تھے کہ زخم کوئی ایسا نہیں ہے جو مہلک ہو مگر وہ اس ضرب سے کچھ ایسا دہشت زدہ تھا کہ مکے پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں سرف کے مقام میں ہلاک ہو گیا۔(ابن ہشّام مقتل ابیّ بن خلف۔ غزوۃ احد الجزء الثّالث صفحہ 19)

حلف الفضول:

اپنے طبعی رجحان کے تحت ہمیشہ آپؐ نے رفاہی کاموں میں اور معاشرے کی بہبود میں بھرپور حصہ لیا۔ تاریخ نے اس حقیقت کو تفصیل کیساتھ محفوظ کیاہے۔ چنانچہ لکھاہے کہ پہلے کسی وقت عرب کے بعض نیک دل اشخاص کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ایسا معاہدہ کریں کہ وہ ہمیشہ حقدار کواس کا حق حاصل کرنے میں مدد دیں گے اور ظالم کو اس کے ظلم سے روکیں گے۔ اس معاہدے

کا نام حلف الفضول رکھا گیا۔ بعد میں اس پر زمانے کی گرد چڑھ گئی اور یہ کالعدم ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی جوانی کے زمانے میں آپؐ کے چچا زبیر بن عبد المطلب نے اس کی تجدید کی تو آپؐ اس کے مستعد اور فعّال ممبر بنے اور عملاً لوگوں کے حقوق دلوانے اور ان کے بوجھ ہلکے کرنے میں سب سے بڑھ کر سرگرمِ عمل تھے۔

نبوّت کے زمانے میں آپؐ فرماتے تھے: " میرے لئے اس (تنظیم) میں شامل ہونے کی خوشی اونٹوں جیسی نعمت سے بھی بڑھ کر ہے۔ مجھے اس معاہدے کا حوالہ دے کر اگر اب بھی مدد کے لئے بلایا جائے تو میں ضرور مدد کروں گا۔" (ابن ہشام۔ حلف الفضول، حدیث رسول اللہ عن حلف الفضول۔ مطبعہ توفیقیہ بمصر)

حجرِ اسود کا قضیہ:

رسول اللہ ﷺ نہ صرف لڑائی جھگڑے سے خود بچتے تھے بلکہ آپؐ نے لوگوں کو بھی اس سے بچانے میں ایک اہم اور موٴثر کردار ادا کیا۔ چنانچہ آپؐ کے سریر آرائے نبوّت ہونے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے کہ قریش مکّہ نے خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو کا ارادہ کیا۔ تعمیر کے وقت دیوار جب حجرِ اسود کی بلندی کے برابر پہنچی تو قبائل قریش میں یہ جھگڑا ہو گیا کہ کون سا قبیلہ اسے اس کی جگہ پر رکھے۔ بحث و تکرار میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ سبھی لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ بعض نے تو زمانۂ جاہلیت کے رواج کے مطابق خون میں انگلیاں ڈبو کر قسمیں بھی کھالیں کہ مر جائیں گے مگر اس اعزاز کو اپنے قبیلے سے باہر نہ جانے دیں گے۔ آخر یہ تجویز پیش ہوئی کہ صبح جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے گا وہی بطور حَکَم اس قضیئے کا فیصلہ کرے گا۔ یہ ایک ایسی مشکل صورتحال تھی کہ قبائل کی ضد، خود غرضی اور عصبیّت کے پیشِ نظر یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ سوائے آپؐ کے کوئی اور اسے حل کرنے کی صلاحیّت نہ رکھتا تھا۔ چنانچہ صبح آپؐ ہی تھے جو سب

سے پہلے حرم میں مقررہ مقام پر تشریف لائے۔ جب دوسرے لوگ آئے تو انہوں نے امین امین کہہ کر یہ اقرار کیا کہ وہ سب آپؐ کے فیصلے پر راضی ہوں گے۔

آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے ایسا دلنشین فیصلہ فرمایا کہ ہر کوئی عش عش کر اٹھا اور آفرین آفرین کی صدائیں بلند کرنے لگا۔ یہ فیصلہ ایسا تھا کہ جس نے بڑی آسانی کے ساتھ ہر ایک قبیلے کی عزت، احترام اور خون کی حفاظت کی اور ان میں امن و سلامتی کی فضا بھی قائم کر دی۔ آپؐ نے حجرِ اسود کو اپنی چادر پر رکھا اور تمام رؤسا کو چادر کے کنارے پکڑا دیئے اور انہیں اسے اوپر اٹھانے کو کہا۔ جب چادر اس کے رکھنے کی جگہ کے برابر پہنچی تو آپؐ نے اسے اٹھایا اور دیوار میں اس کی مخصوص جگہ پر رکھ دیا۔ (الشفا، فصل فی عدلہا و امانتہ و عفتہ و صدق لہجتہ، طبری، ابن ہشام، ابن سعد، زرقانی و تاریخ الخمیس)

یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی جوانی کے دَور میں بھی امن و سلامتی اور صلح و آشتی کے خُوگر تھے۔ آپؐ قبائل اور معاشرے کو خون خرابے سے بچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ آپؐ ہر لمحہ انسانیت اور انسانی خون کی حفاظت کی ترکیب فرماتے تھے۔

نفع رساں اوصافِ حمیدہ:

آنحضرت ﷺ معاشرے میں سب سے زیادہ نفع رساں وجود تھے۔ آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت خدیجہؓ فرماتی ہیں: ”اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَحْمِلُ الْكَلَّ وَ تَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ وَ تَقْرِیْ الضَّيْفَ وَ تُعِيْنُ عَلٰى نَوَائِبِ الْحَقِّ۔“ (بخاری کتاب کیف کان بدء الوحی.....) کہ آپؐ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کو اٹھاتے ہیں، جو نیکیاں مٹ چکی ہیں، آپؐ ان

کو دوبارہ قائم کرتے ہیں، مہمان نوازی اور تکریمِ ضیف کرتے ہیں اور ضروریاتِ حقّہ میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔

یہ سب خوبیاں وہ ہیں جو دیگر وسیع اوصاف کی جامع ہیں۔ جیسا کہ حضرت خدیجہؓ کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہ خوبیاں معاشرے سے معدوم ہو چکی تھیں، جنہیں آپؐ نے ہستی عطا فرمائی، جن کا آپؐ نے احیائے نَو فرمایا۔ یہ سب آپؐ کی جوانی کے دور کے اعمالِ صالحہ اور اوصافِ حسنہ ہیں۔ یہاں ہر قاری اندازہ کر سکتا ہے کہ جو شخص بچپن اور جوانی کے دور میں ایسے اوصافِ عالیہ سے متصف ہو جو رحمت و کرم کے منبع سے پھوٹ پھوٹ رہے ہوں، وہ اپنی بڑھتی ہوئی عمر میں کیونکر سختی، کشت و خون اور جبر و تشدّد کا دلدادہ ہو سکتا ہے۔ آپؐ اپنے دَورِ شباب میں خدمتِ خلق کے لئے معاشرے میں ایسی نیکیوں کے قیام کی خاطر اپنے طعام و آرام و سکون تو کیا، تن، من اور دھن کو قربان کر رہے تھے۔ پس آپؐ پر قتل و خون کے الزام لگانے والوں کو آپؐ کی طبعی، نفسیاتی اور قلبی کیفیات پر غور کرنا چاہیئے اور توبہ کرنی چاہیئے۔

آسانی عطا فرمانے والے:

روایت ہے کہ ”آپؐ کو جب بھی دو باتوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار دیا گیا تو آپؐ ان میں سے جو آسان ہوتی اسے اختیار فرماتے۔ لیکن وہ آسان بات اگر گناہ ہوتی تو پھر آپؐ اس سے سب سے زیادہ نفرت کے ساتھ دور رہنے والے ہوتے تھے۔ “(مسلم کتاب الفضائل باب مباعدتہ اللاثام.....)

اپنے نمائندوں کو کسی جگہ بھجواتے تو آپؐ کی نصیحت ہوتی تھی کہ "یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا" (بخاری کتاب العلم ماکان رسول اللہ ﷺ یتخولھم) کہ آسائش پیدا کرو اور مشکل پیدا نہ کرو، خوشی پہنچاؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

آپؐ کی سب کو نصیحت بھی یہی تھی اور پاک فطرت پر استوار آپؐ کا اپنا عمل بھی یہ تھا کہ آپؐ ہمیشہ آسانیاں عطا کرنے اور خوشیاں بانٹنے کی کوشش فرماتے تھے۔

بیحد دیالو:

"آپؐ سب سے زیادہ سخی تھے۔ بھلائی اور سخاوت میں آپؐ موسلا دھار بارش اور اس میں چلنے والی تیز ہوا سے بھی زیادہ تیز رفتار تھے۔" (بخاری کتاب بدء الوحی و کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا)

آپؐ سے جب بھی کچھ مانگا گیا آپؐ نے کبھی "لَا" یعنی نہ نہیں کہا۔ (بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا و مسلم کتاب الفضائل باب فی سخائہ ﷺ.....)

آپؐ کے ان جبلّی اوصاف کو دیکھ کر ایک معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص غریبوں اور مسکینوں کے بہبود اور رفاہِ عامہ کے لئے ایسی مستقل عادتیں رکھتا ہو وہ انسانوں کے قتل و خون کو کیونکر پسند کر سکتا ہے؟

سادگی پسند، حلیم الطبع اور منکسر المزاج:

صحیح روایات بتاتی ہیں کہ "آپؐ کی زندگی انتہائی سادہ تھی اور آپؐ ادنیٰ سے ادنیٰ کام کرنے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔ آپؐ اپنے اونٹ کو خود چارہ ڈالتے تھے۔ گھر کے کام کاج

کرتے تھے۔ اپنی جوتیوں کی مرمّت کر لیتے تھے۔ کپڑوں کو خود پیوند لگا لیتے تھے۔ بکری دوہ لیتے تھے۔ خادم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے تھے۔ اگر وہ آٹا پیستے کبھی تھک جاتا تو آپؐ اس کی مدد کرتے تھے۔ بازار سے گھر کا سامان اٹھا کر لے آتے تھے۔ ہر امیر غریب سے مصافحہ کرتے تھے۔ سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔ اگر کوئی معمولی کھجوروں کی دعوت بھی دیتا تو آپؐ اسے حقیر نہ سمجھتے اور قبول فرماتے تھے۔ آپؐ نہایت ہمدرد، نرم مزاج اور حلیم الطبع تھے۔ آپؐ کا رہن سہن بڑا صاف ستھرا تھا۔ ہر ایک سے بشاشت اور مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ایک دلآویز تبسّم کی جھلک ہر وقت آپؐ کے چہرے پر رہتی تھی۔ آپؐ خدا تعالیٰ کے خوف اور اس کی بے نیازی سے فکر مند رہتے تھے۔ آپؐ کے اندر تُرش روئی اور خشک طبعی کا نام و نشان نہ تھا۔ منکسر المزاج تھے لیکن اس میں کسی کمزوری یا پست ہمّتی کا شائبہ تک نہ تھا۔ آپؐ بے مثال سخی تھے مگر اسراف نہیں کرتے تھے اور بے جا خرچ سے ہمیشہ بچتے تھے۔ آپؐ نرم دل اور رحیم و کریم تھے۔ آپؐ کے کھانے میں بھی میانہ روی تھی یعنی اتنا نہ کھاتے کہ ڈکار لیتے رہیں۔ کبھی حرص و طمع کی وجہ سے ہاتھ نہ بڑھاتے تھے بلکہ آپؐ صبر و شکر اور قناعت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ (الشفا الباب الثانی فصل فی تواضعہا)

آپؐ میں تکبّر کا شائبہ تک نہ تھا۔ ”آپؐ نہ کسی بات پر ناک چڑھاتے تھے اور نہ اس میں کوئی عار سمجھتے تھے کہ بیواؤں اور مسکینوں کے ساتھ چلیں اور ان کے کام آئیں اور ان کی مدد کریں۔“ (مسند الدّارمی باب فی تواضع رسول اللہ ﷺ)

آپؐ کے یہ مذکورہ بالا تمام اوصاف قطعی ثبوت مہیّا کرتے ہیں کہ آپؐ سخت دل اور جابر انسان نہیں تھے کہ کسی کی بدزبانی پر انگیخت ہو کر اسے زیرِ تعزیر لے آتے۔ آپؐ کی فطرت ہی

رحم و کرم، ہمدردی اور حلم کے خمیر سے اٹھائی گئی تھی۔ آپؐ کی تمام زندگی اسی حلم، ہمدردی اور لطف و کرم پر قائم تھی۔

مجسّم حیا:

رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ بتاتے ہیں: "آپؐ پردہ نشین حیادار کنواری سے بھی زیادہ حیا رکھتے تھے۔ جب کوئی چیز آپؐ کو ناپسند ہوتی تو آپؐ کے چہرے کے آثار سے ہم آپؐ کی قلبی کیفیّت کو پہچان لیتے تھے۔" (بخاری کتاب المناقب باب فی صفة النبی ﷺ)

اس مزاج اور فطرت والے وجود کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ جب تک کسی شاتم کو قتل نہ کرالیتا تھا اسے چین نہ آتا تھا۔ وہ قتل کرنے والے کو شاباش دیتا تھا وغیرہ وغیرہ، یہ کسی دشمن کا کہنا تو ہو سکتا ہے، آپؐ کے سچے محب کا کہنا نہیں ہو سکتا۔

غلاموں، یتیموں، بے کسوں اور خادموں پر شفقت:

نبوّت سے قبل آپؐ کی زوجہ مطہّرہ حضرت خدیجہؓ نے اپنا ایک غلام زید بن حارثہ آپؐ کے سپرد کر دیا تھا۔ آپؐ نے اس کے ساتھ ایسی محبت و شفقت فرمائی کہ اسے اپنا متبنّیٰ بنا لیا۔ اس سے آپؐ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اس کے والد اور چچا جب اس کی تلاش میں پوچھتے پچھاتے مکّے آ گئے۔ جب انہوں نے اسے ساتھ لے جانے کا اظہار کیا تو باوجود آپؐ کی اجازت کے اس نے اپنے سگے والد اور چچا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ آپؐ میرے لئے چچا اور والد سے بڑھ کر ہیں۔ اس پر زیدؓ کا باپ غصے میں بولا کہ کیا تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے۔ زید نے کہا: "ہاں! کیونکہ میں نے ان میں ایسی خوبیاں دیکھی ہیں کہ اب میں کسی کو ان پر ترجیح نہیں دے

سکتا۔"(اسد الغابہ و ابن ہشام اسلام زید بن حارثۃ الجزء الاوّل صفحہ 181 ناشر المکتبۃ التوفیقیۃ الازھر)اور ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

آپؐ کے ایسے ہی اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی کسی کو مارا نہیں تھا نہ کسی عورت کو نہ خادم کو۔(مسلم کتاب الفضائل باب مباعدتہ للاثام.....)

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں: "میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دس سال گزارے۔اس پورے عرصے میں آپؐ میرے متعلق کوئی ناپسند بات زبان پر نہ لائے۔نہ آپؐ نے کبھی یہ فرمایا کہ فلاں کام کیوں کیا اور نہ یہ فرمایا کہ فلاں کام کیوں نہ کیا۔"(بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا)

حضرت خدیجہؓ کے بیٹے ہند رسول اللہ ﷺ کے زیرِ تربیت رہے تھے۔ان کا بیان ہے کہ آپؐ دنیا اور اس کے معاملات کی خاطر کبھی ناراض نہ ہوتے تھے،نہ ہی آپؐ اپنی ذات کی خاطر کبھی غصّے ہوئے نہ ہی کبھی بدلہ لیا۔"(شمائل ترمذی باب ماجاء فی کلام رسول اللہ ﷺ)

آپؐ نے کبھی بھی فحش کلامی نہیں کی۔(بخاری کتاب الادب باب حسن الخلق والسخا)

آپؐ یتیموں کی کفالت کے لئے انتہائی درد رکھتے تھے۔ بیواؤں کے لئے بیحد فکر مند رہتے تھے۔ بے کسوں پر آپؐ کا دامنِ رحمت بارش بھرے بادل کی طرح سایہ فگن تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک صحابی اپنے غلام کو پیٹ رہے تھے۔ عقب سے یہ آواز آئی کہ خدا تم پر اس سے زیادہ اختیار اور قدرت رکھتا ہے۔اس صحابی نے مُڑ کر دیکھا تو خود رسول اللہ ﷺ تھے۔ عرض کی: "یارسول اللہ! میں نے اسے اللہ کی خاطر آزاد کر دیا ہے۔"فرمایا: " اگر تم ایسا نہ کرتے تو آتشِ دوزخ تمہیں چھو لیتی۔"(ابو داؤد کتاب الادب باب فی حق المملوک)

ایسا نرم خُو اور ہر کس و ناکس پر دامنِ ترحّم دراز کرنے والا وسیع الظرف رحیم و کریم انسان کس طرح کسی کو صرف اس لئے قتل کرا سکتا ہے کہ وہ اسے گالی دیتا ہے۔ آپؐ تو مجسّم عفو و درگزر تھے اور معاف کر دینا آپؐ کا عام اور مستقل عمل تھا۔ یہ آپؐ کا فطرتی عمل بھی تھا اور آپؐ کی مستقل تعلیم بھی یہی تھی۔

آپؐ کا عفو و رحم عام تھا جس کی تجلّی ہر ایک پر یکساں تھی۔ گالی کے بارے میں تو آپؐ بڑی وضاحت سے فرما چکے تھے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے محمد بنایا ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) تو کسی کے مذمم کہنے سے آپؐ کو کس طرح فرق پڑ سکتا ہے؟ روایاتِ صحیحہ شاہد ہیں کہ ہر ایسے واقعے پر آپؐ ہمیشہ کمال تحمّل اور بردباری دکھاتے تھے۔ یعنی ردّ عمل میں آپؐ کا تحمّل وبُردباری اور عفو گالی گلوچ کے اثر سے کہیں اور کئی گنا بڑھ کر ہوتا تھا۔ جس کے نتیجے میں اس بدزبانی اور ہرزہ سرائی کا اثر وہیں اور اسی وقت دب کر رہ جاتا تھا جیسا کہ ''اَلسَّامُ عَلَیْكَ'' والا واقعہ اور اسی نوع کے دیگر واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔

پس اس قدر وسیع قلب و جگر والے انسان پر یہ تہمت لگانا کہ وہ گالی پر ایسا بھڑکتا تھا کہ قتل کروا کر ہی سکون میں آتا تھا، انتہائی شرمناک ظلم ہے۔ پھر اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ یہ ظلم آپؐ کی طرف منسوب ہونے والے۔'' اپنے ہی دوست '' روا رکھتے ہیں۔

بے کسوں کا والی:

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دس درہم تھے۔ آپؐ نے ایک کپڑے بیچنے والے سے چار درہم کی قمیص خریدی اور پہن لی۔ راستے میں آپؐ کو ایک انصاری ملا۔ اس نے آپؐ سے عرض کی کہ اس کے پاس قمیص نہیں ہے۔ آپؐ اسے قمیص

عطا فرمائیں، اللہ تعالیٰ آپ ؐ کو جنت کا لباس عطا کرے گا۔ اس پر آپؐ نے وہ (نئی) قمیص اسے عطا کر دی۔ بعد ازاں آپ پھر دوکان پر آئے اور چار درہم میں ایک اور قمیص خرید لی۔ اب آپؐ کے پاس دو درہم باقی تھے۔ اتنے میں آپؐ نے دیکھا کہ راستے میں ایک غلام بچی رو رہی ہے۔ آپؐ نے اس سے دریافت فرمایا کہ وہ کیوں روتی ہے؟ اس نے عرض کی: "یا رسول اللہؐ! مجھے میرے مالک نے دو درہم دیئے تھے کہ میں ان کے لئے آٹا خرید لاؤں مگر وہ دونوں درہم گم ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اسے باقی ماندہ دو درہم عطا کر دیئے۔ وہ یہ لے کر بھی رو رہی تھی۔ آپؐ نے اسے پوچھا کہ وہ اب کیوں روتی ہے جبکہ اسے دو درہم مل چکے ہیں؟ اس نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے پیٹیں گے۔ اس پر آپؐ اس کے ساتھ اس کے گھر گئے۔ آپؐ نے انہیں سلام کہا۔ پھر دوبارہ سلام کہا۔ پھر سہ بارہ سلام کہا۔ اس پر انہوں نے سلام کا جواب دیا۔ آپؐ نے پوچھا کہ کیا انہوں نے آپؐ کا پہلا سلام سن لیا تھا؟ انہوں نے کہا: "جی۔ مگر ہم چاہتے تھے کہ آپؐ ہمیں زیادہ سے زیادہ سلام پہنچائیں۔" انہوں نے پوچھا: " یا رسول اللہ! آپؐ پر ہمارے ماں باپ قربان جائیں، آپؐ نے یہاں آنے کی تکلیف کیوں فرمائی ہے۔" آپؐ نے فرمایا کہ یہ بچی ڈرتی تھی کہ آپ اسے پیٹیں گے۔ اس پر اس کے مالک نے کہا کہ آپؐ اس بچی کے ساتھ تشریف لائے ہیں تو آج سے یہ خدائے عزّ و جلّ کی رضا کی خاطر آزاد ہے۔ رسول اللہ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے انہیں خیر کی اور جنت کی بشارت دی۔ پھر آپؐ نے فرمایا: " اللہ تعالیٰ نے دس (درہموں) میں ایسی برکت رکھی کہ اپنے نبی کو بھی قمیص پہنائی، ایک انصاری کو بھی قمیص پہنائی اور اس کے ذریعے ایک گردن بھی آزاد کر دی۔ فالحمد للہ کہ یہ سب اس نے ہمیں اپنی قدرت سے عطا فرمایا۔" (المعجم الکبیر از طبرانی۔ جلد 12 صفحہ 441,442 دار السمیع ریاض۔ و تاریخ مدینۃ الدمشق از ابن عساکر جلد 4 صفحہ 89 دار الفکر بیروت)

یہ ہے وہ گداز دل اور ہر حال میں انسان کے لئے سکھ چاہنے والا دل جس پر آج کا انسان یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ لوگوں کو قتل کرواتا تھا اور قتل پر خوش ہوتا تھا۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون

زیادتی کرنے والوں پر بھی سایہ ترحّم:

روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک بدّو نے آپؐ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہوئے بدتمیزی کے ساتھ آپؐ کی چادر کو ایسے زور کے ساتھ کھینچا کہ اس کی رگڑ سے آپؐ کی گردنِ مبارک پر نشان آ گیا۔ وہ ساتھ ہی گستاخ لہجے میں کہنے لگا کہ اسے اللہ تعالیٰ کے اس مال سے عطا کیا جائے جو آپؐ کے پاس پڑا ہے۔ آپؐ نے باوجود اس پر قدرت اور طاقت رکھنے کے نہ صرف یہ کہ اس گستاخی پر حلم و بردباری دکھائی بلکہ اس کی مالی مدد کے لئے بھی ارشاد فرمایا۔" (بخاری کتاب النفقات و کتاب اللباس باب البرد)

آپؐ کی زندگی کا لمحہ لمحہ گواہ ہے کہ کوئی آپؐ سے زیادتی یا بدکلامی کرتا تو آپؐ اس سے عفو و درگزر کرتے اور اسے کسی قسم کا ضرر نہ پہنچنے دیتے تھے۔ چنانچہ مذکورہ بالا واقعہ کی نوع کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک یہودی زید بن سعنہ نے آپؐ کو کچھ قرض دیا اور جلد ہی بڑی گستاخی سے آپؐ کے کندھے سے چادر کھینچتے ہوئے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ صحابہؓ میں سے بعض اس پر سختی کرنا چاہتے تھے مگر آپؐ نے انہیں روک دیا۔ آپؐ کا یہی عفو و کرم اس کی ہدایت کا موجب بنا۔ (مستدرک للحاکم کتاب معرفۃ الصحابۃ ذکر اسلام زید بن سعنہ)

یہ رحیم و کریم اور سراپا عفو و رأفت ذات ہے جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ آپ گستاخی کرنے والے کو قتل کروا دیتے تھے۔ آپؐ کے رحم و کرم اور لطف و عنایات کے ایسے واقعات روز و شب رونما ہوتے تھے۔ یہ آپؐ کی زندگی کا جزوِ لازم تھے۔ مگر ان سے بھی زیادہ لازمی جزو آپؐ کی پاک سیرت کا یہ تھا کہ عفو و دعا کے ہر واقعے کے ہمراہ آپؐ کی بخشش و سخا بھی بے انتہاء تھی۔

شدید ترین ظلموں پر صبر وبرداشت:

مکّہ کے رؤوساء نے ایک فیصلے کے مطابق سال 7 نبوی میں رسول اللہ ﷺ کو اور آپؐ کے متبعین کو ایک درّہ نما گھاٹی شعبِ ابی طالب میں اڑھائی تین سال کے لئے محصور کر دیا۔ باہر سے کسی قسم کی مدد پر بھی سخت پہرے لگا دیئے اور آپؐ کو کلّیۃً تمدّنی زندگی سے منقطع کر دیا۔ اس سارے عرصہ میں مردوں، عورتوں اور بچوں نے جس شدّتِ بھوک و پیاس میں اپنے شب و روز بسر کئے، ان کی دل دہلا دینے والی داستانیں ہیں۔ مگر آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ نے جس صبر و اصطبار سے یہ سب کچھ برداشت کیا اور رؤوسائے قریش کے فیصلے کے آگے کوئی جارحیّت نہیں کی۔ صبر و استقامت کی یہ داستان تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ اسوہ آپؐ کے صلح جُو اور امن و امان کے قیام کے لئے ایک عظیم رہنما اسوہ ہے۔

آپؐ نے ان ظلم کرنے والوں پر بعد ازاں تسلّط پانے کے بعد بھی کوئی سزا وغیرہ مقرر نہیں فرمائی۔ پس ایسی عظیم الشان اور غیر معمولی صبر اور برداشت کرنے والی ہستی کی طرف کشت وخون کی تعلیم منسوب کرنا ظلم عظیم ہے بلکہ بذاتِ خود آپؐ کی توہین کا ارتکاب ہے۔

سب سے بڑے گستاخ پر بھی عفو و شفقت:

آنحضرت ﷺ کی مدینے میں آمد پر قبائل اَوس اور خزرج کی اکثریت آپؐ پر متفقہ ایمان لے آئی۔ عبد اللہ بن اُبیّ بن سلول جو قبیلۂ خزرج کا ایک نامور لیڈر تھا۔ اس میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کھل کر آپؐ کی مخالفت کرتا۔ لیکن وہ اپنے حسد اور بغض کی وجہ سے ہمیشہ خفیہ طور پر آپؐ کو نقصان پہنچانے کی سازشیں کرتا رہا۔ وہ غزوۂ بدر کے بعد اپنی منافقت کی وجہ سے بظاہر مسلمان بھی ہو گیا۔

آنحضرت ﷺ کی مدینے ہجرت پر قریشِ مکّہ نے عبد اللہ بن ابیّ اور دیگر رؤسائے مدینہ کے نام تہدیدی خط لکھا تو یہ آپؐ سے لڑنے کے لئے تیّار ہو گیا لیکن آپؐ کے سمجھانے پر بظاہر اس کا غصّہ تو وقتی طور پر دب گیا مگر اندر بغض اور کینہ قائم رہا۔

وہ غزوۂ اُحد کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکلا تو سہی مگر اپنے تین سو ساتھیوں سمیت راستہ سے ہی واپس لوٹ آیا اور پھر اس نے بعد میں مسلمانوں کے جانی اور مالی نقصان پر آپؐ کو طعنے بھی دیئے۔

اس نے یہودِ مدینہ کے قبائل سے متعدد مواقع پر خفیہ گٹھ جوڑ کر کے اسلام کے خلاف سازشیں تیّار کیں۔ غزوۂ احزاب پر اس کی سازش کھل کر سامنے آئی۔

اس نے حضرت زینب بنت جحشؓ کی شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ کو بدنام کرنے کی باقاعدہ سازش تیّار کی اور کئی افتراء تراشے۔

اس نے غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر انصار اور مہاجرین کو لڑانے کی کوشش کی۔

اسی غزوے سے واپسی پر حضرت عائشہؓ پر گھناؤنا الزام تراشا گیا اور مدینے میں اس کی تشہیر کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی میں اس شخص کو " اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرُہٗ " یعنی اس فتنے کا سرغنہ قرار دیا۔

اس نے غزوۂ تبوک کے موقعے پر صحابہؓ کی مالی قربانیوں پر طعن کئے۔ صحابہؓ میں خوف و ہراس پھیلانے کی کارروائیاں کیں۔ غزوہ میں شمولیّت سے انکار کیا اور واپسی پر آنحضرت ﷺ کے قتل کی سازش بھی تیّار کی۔

ان کے علاوہ اس کی سرکردگی میں روز مرّہ بار بار آنحضرت ﷺ، ازواجِ مطہّرات اور دیگر صحابہؓ کی توہین کی کوشش کی جاتی رہی۔

یہ شخص، منافقوں کا سرغنہ بالآخر ماہِ شوّال میں بیمار ہوا اور بیس دن بیمار رہنے کے بعد ذوالقعدہ کے مہینے میں تاریخِ عالم میں منافقت کی سب سے بڑی داستان چھوڑ کر راہیٔ مُلکِ عدم ہو گیا۔ اس کی علالت کے دوران رحمۃٌ لّلعالمین ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے جاتے رہے۔ جس دن اس کی موت ہوئی، آپؐ اس کے پاس گئے اور اس سے اس کی سازشوں کی بابت بات کی تو اس نے عرض کی: "یارسول اللہ! یہ میری موت کا وقت ہے، عتاب کا نہیں۔ مجھے اپنی یہ قمیص عطا فرمائیں جو آپؐ نے پہن رکھی ہے اور اسی میں میری تکفین فرمائیں۔ میری نمازِ جنازہ بھی آپؐ پڑھائیں اور میرے لئے دعائے مغفرت بھی کریں۔"

اس کی موت واقع ہوئی تو اس کا بیٹا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ آپؐ اپنا کرتہ عنایت فرمائیں تاکہ اسے آپؐ کے کرتے کا کفن پہنایا جائے۔ آپؐ نے اسے اپنا کرتہ عطا کیا۔ چنانچہ عبد اللہ بن ابیّ کو کفن میں آنحضرت ﷺ کی قمیص پہنائی گئی۔

عبد اللہ بن اُبیّ کی میّت تیار ہوئی تو آنحضرت ﷺ کو اطلاع کی گئی۔ آپؐ نمازِ جنازہ کے لئے تشریف لے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے آپؐ کی خدمت میں اس کی ساری کرتوتوں کا ذکر کر کے عرض کی: "آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے جو منافق ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔" آپؐ مسکرائے اور فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے: "اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ط اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ" (التوبہ:80) کہ تُو ان کے لئے مغفرت طلب کر یا تُو ان کے لئے مغفرت نہ طلب کر۔ اگر تُو ان کے لئے سترّ مرتبہ بھی

مغفرت مانگے تب بھی اللہ ہر گز انہیں معاف نہیں کرے گا۔ یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اللہ بد کردار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

فرمایا: مجھے جب یہ اختیار دیا گیا ہے تو میں نے یہ پہلو اختیار کیا ہے کہ میں اس کے لئے مغفرت طلب کروں اور اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستّر سے زائد مرتبہ مغفرت طلب کرنے پر اس کی بخشش ہو جائے گی تو میں ضرور اس سے زیادہ بار اس کے لئے بخشش کی دعا کروں گا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ رحمت و بخشش کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے آگے نہ ٹھہر سکے۔

آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جنازہ کے ساتھ چل کر قبرستان تشریف لے گئے اور تدفین تک وہیں کھڑے رہے۔ اسے جب قبر میں اتارا گیا تو آپؐ نے اسے باہر نکالنے کا ارشاد فرمایا۔ اسے باہر نکالا گیا تو آپؐ نے اس کا سر اپنی گود میں رکھا اور اور اپنا لعابِ دہن اس کے منہ پر انڈیلا اور اسے قبر میں اتارنے کا ارشاد فرمایا۔ چنانچہ اسے قبر میں اتارا گیا اور تدفین کی گئی۔ اس کی تدفین کے بعد ابھی آپؐ اس کی قبر سے لَوٹے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حسبِ ذیل آیتِ کریمہ نازل فرمائی۔

''وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَ مَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ٥ وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ٥ (التوبہ:84،85) ترجمہ: اور تُو ان میں سے کسی مرنے والے پر کبھی (جنازہ) کی نماز نہ پڑھ اور کبھی اس کی قبر پر (دعا کے لئے) کھڑا نہ ہو۔ یقیناً انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا انکار کر دیا ہے اور وہ اس حالت میں مرے کہ وہ بد کردار تھے۔ اور ان کے اموال اور ان کی اولادیں تیرے لئے کوئی کشش پیدا نہ کریں۔ اللہ محض یہ چاہتا ہے کہ ان ہی کے ذریعے سے اُنہیں اس دنیا میں ہی عذاب دے۔ اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں کہ وہ

کافر ہوں۔(بخاری کتاب التفسیر سورۃ التوبہ باب قولہٖ "استغفر لھم اَولا تستغفر لھم وترمذی ابواب التفسیر باب من سورۃ التوبہ وابن کثیر 9ھ موت عبد اللہ بن اُبیّ)

یہ عجیب بات ہے کہ منافقین کی نمازِ جنازہ کی ممانعت کی آیات اس وقت نازل ہوئیں جب آنحضرت ﷺ رئیس المنافقین کی نمازِ جنازہ پڑھا چکے تھے۔ حالانکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس نماز جنازہ کی ادائیگی سے پہلے بھی آپؐ پر یہ آیات نازل فرما سکتا تھا۔ لیکن عبد اللہ بن ابیّ بن سلول کی نمازِ جنازہ کے عین بعد ان کا نزول لازماً کسی غیر معمولی حکمت سے خالی نہیں تھا۔ اس طریق سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اپنے مجسّم رحمت نبیؐ کا حوصلہ اور عفو دکھایا تھا کہ آپؐ کا سینہ شدید ترین مخالف اور شریر ترین منافق کے لئے بھی رحمت اور بخشش کے جذبات سے لبریز تھا۔ خلقِ خدا کی بخشش کے لئے آپؐ کی بے تابی ایسی تھی کہ فرمایا اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستّر سے زائد مرتبہ مغفرت طلب کرنے پر اس کی بخشش ہو جائے گی تو میں ضرور اس سے زیادہ بار اس کے لئے بخشش کی دعا کروں گا۔ اگر یہ آیات عبد اللہ بن ابیّ کے جنازہ سے پہلے نازل ہو تیں تو شاید آنحضرت ﷺ کا یہ رحمت و بخشش کا عظیم خُلق اور سیرت کا درخشندہ پہلو دنیا سے مخفی رہتا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَ عَلیٰ اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ بَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

صبر و برداشت کی آخری حدوں تک ضبط و حوصلے کو نہ توڑنے والے پر قتل و ظلم کے الزامات قطعی طور پر جھوٹے ہیں۔

امن و سلامتی کا پیغامبر:

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں خوب جہاد کیا۔ آپؐ کو اگر کسی نے کبھی تکلیف پہنچائی تو آپؐ نے اس سے کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہاں جب اللہ تعالیٰ کے کسی

قابلِ احترام مقام کی ہتک یا بے حرمتی کی جاتی تو پھر آپؐ اللہ تعالیٰ کی خاطر انتقام لیتے تھے۔(مسلم کتاب الفضائل باب مباعدتہ ؐللاثام.....)

یہاں جہاد سے مراد تلوار کا جہاد نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی امن و سلامتی کی ضامن تعلیم کے نفاذ کے لئے نوعِ انسان کی بہبود اور شرفِ انسانیت کے قیام کی خاطر اپنے جان، مال، عزت، نفس، وقت اور آرام کو قربان کرنے کا جہاد تھا۔ جو آپؐ کی زندگی کے ہر لمحے میں غیر منقطع تسلسل کے ساتھ جاری تھا۔

اللہ تعالیٰ کی خاطر انتقام لینا شریعت کے قیام کے بنیادی تقاضوں کے تحت تھا۔ شرفِ انسان کے قیام کے لئے یہ ایک بنیادی تقاضا تھا۔ مگر اس میں بھی نرمی اور عفو و درگزر کا اظہار آپؐ کی سرشت اور فطرت کے مقتضائے حال تھا۔ لہٰذا اڈانٹ ڈپٹ، درشتی، زجر و توبیخ اور غیظ و غضب سے آپؐ کا دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ پس آپؐ کی طرف قتل و خون منسوب کرنا واضح جھوٹ ہے۔

یہاں جس انتقام کی بات حضرت عائشہؓ نے کی ہے، اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ معصوم اور امن پسند عام لوگوں کو ظلم سے بچانے کے لئے ظالموں کے لئے سزائیں ضروری علاج ہیں۔ یہ دنیا کے ہر قانون کا لازمی جزو ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی عبادت کی جگہیں جو اُن کے نزدیک مقدّس مقامات ہیں، اللہ تعالیٰ کے حقوق کے قیام کے لئے ان کی حفاظت آپؐ کے اوّلین فرائض میں تھا۔ جس کی ادائیگی کے لئے آپؐ نے بعض کے لئے سزائیں بھی تجویز فرمائیں مگر آپؐ کی تجویز کردہ ان سزاؤں ان میں بھی عفو و رحمت کا دامن ہمیشہ وسیع رہا۔ چنانچہ معافی چاہنے والوں کو آپؐ نے ہمیشہ معاف فرمایا۔

مقدّس مقامات کی حفاظت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ تعلیم نازل فرمائی کہ ان کی ہر صورت میں حفاظت کی جائے۔ چنانچہ فرمایا: ’’ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم

بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنصُرَنَّ اللّٰهُ مَن يَنصُرُهُ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ (سورۃ الحج: 41) ترجمہ: اور اگر اللہ کی طرف سے لوگوں کا دفاع ان میں سے بعض کو بعض دوسروں سے بھِڑا کر نہ کیا جاتا تو راہب خانے منہدم کر دیئے جاتے اور گرجے بھی اور یہود کے معابد بھی اور مساجد بھی جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اور یقینا اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے۔ یقینا اللہ بہت طاقتور (اور) کامل غلبہ والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مذاہب کے عبادت خانوں کی حفاظت کے انتظام کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس تعلیم کے تحت رسول اللہ ﷺ نے ہر مذہب و ملّت کے شعائر کی حفاظت کے لئے معاہدے کئے اور ان کے تقدّس کو پامالی سے بچانے کے لئے واضح ارشاد فرمائے اور ان کی حفاظت کی قطعی ضمانت مہیّا فرمائی۔ چنانچہ 10ھ میں نجران کے علاقے سے عیسائی اکابرین کا ایک وفد آنحضرت ﷺ کی خدمت میں مدینے حاضر ہوا۔ اس وفد کے ساتھ آپؐ کی تفصیلی بحث ہوئی اور بالآخر آپؐ کی طرف سے انہیں مباہلے کی دعوت بھی دی گئی۔ جس کے بعد آپؐ نے انہیں دعوتِ اسلام بھی دی۔ انہوں نے آپؐ کی اس دعوت کو ایمانی اور دینی لحاظ سے تو قبول نہ کیا مگر اسلام کے پُر امن نظام کو تسلیم کرتے ہوئے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ وہ آپؐ سے صلح کی درخواست کرتے ہیں اور جو حکم آپؐ انہیں دیں گے وہ انہیں قابلِ قبول ہوگا۔ اس پر آپؐ نے ان سے حسبِ ذیل امور پر معاہدۂ امن کیا کہ

”وہ دو ہزار ہتھیار دیں گے۔ ان میں سے ایک ہزار ہتھیار ماہِ رجب میں اور ایک ہزار ماہِ صفر میں دینے ہوں گے، نیز اگر یمن میں کسی مقام پر جنگ ہو تو نجران کے ذمّہ بطور رعایت تیس زرہیں اور تیس نیزے اور تیس اونٹ اور تیس گھوڑے ہوں گے۔ نجران اور ان کے آس

پاس والوں کی جان مال، مذہب، ملک، زمین، حاضر، غائب اور ان کی عبادت گاہوں کے لئے اللہ تعالیٰ اور محمدؐ نبی اکی ذمّہ داری ہے۔نہ تو کوئی اسقف اس کے منصب سے، نہ کوئی راہب اس کی رہبانیت سے، اور نہ کوئی کاہن اس کی کہانت سے ہٹایا جائے گا۔" (ابن سعد ذکر وفادات وفد نجران)

آنحضرت ﷺ نے انہیں ایک اور معاہدے پر مبنی حسبِ ذیل تحریر بھی دی:

"(مِنْ مُحَمَّدِ النَّبِيِّ) لِاَسْقُفِ أَبِي الْحَارِثِ بْنِ كَعْبٍ وَ أَسَاقِفَةِ نَجْرَانَ وَكَهَنَتِهِمْ وَمَنْ تَبِعَهُمْ وَ رُهْبَانِهِمْ أَنَّ لَهُمْ عَلَى مَا تَحْتَ أَيْدِيهِمْ مِنْ قَلِيلٍ وَّكَثِيْرٍ مِنْ بِيَعِهِمْ وَ صَلَوٰتِهِمْ وَ رَهْبَانِيَّتِهِمْ، جِوَارُ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لَا يُغَيَّرُ أَسْقُفُ عَنْ أَسْقُفِيَّتِهٖ، وَلَا رَاهِبٌ مِنْ رَهْبَانِيَّتِهٖ، وَلَا كَاهِنٌ عَنْ كَهَانَتِهٖ،وَلَا يُغَيَّرُ حَقٌّ مِنْ حُقُوْقِهِمْ،لَا سُلْطَانِهِمْ،وَلَا شَيئٍ مِمَّا كَانُوْا عَلَيْهِ (مِنْ ذٰلِكَ، جِوَارُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ أَبَداً)مَا نَصَحُوْا وَأَصْلَحُوْا فِيْمَاعَلَيْهِمْ غَيْرَ مُثْقِلِيْنَ بِظُلْمٍ وَّلَا ظَالِمِيْنَ۔"ترجمہ: محمدؐ نبی ﷺ کی طرف سے اسقف ابو حارث کے لئے اور نجران کے دیگر پادریوں، کاہنوں، اور ان کے پیروکاروں اور راہبوں اور ان کے تھوڑے بہت متبعین کے لئے اور ان کے گرجوں، عبادت گاہوں وغیرہ کے لئے امان ہے۔ان کے پادریوں میں سے کسی کو اس کے منصب سے، ان کے راہبوں میں سے کسی راہب کو اس کی رہبانیّت سے اور ان کے کاہنوں میں سے کسی کاہن کو اس کی کہانت سے قطعاًبر طرف نہیں کیا جائے گا۔انہیں ان کے حقوق اور ان کے اختیارات سے جن پر وہ قائم ہیں، ہٹایا نہیں جائے گا۔جب تک وہ خیر خواہ اور صلح جُو رہیں گے یا ظالموں کے ساتھ ظلم ڈھانے والے نہ ہوں گے، انہیں ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی پناہ حاصل رہے گی۔

(اس معاہدے کے مندرجات، طبقات ابن سعد 'ذکر بعثۃ رسول اللہ ﷺ الرسل بکتبہٖ الیٰ الملوک یدعوھم الیٰ الاسلام' سے لئے گئے ہیں۔ لیکن اس میں چند کلمات جو بریکٹ میں ہیں ' ابن کثیر کتاب الوفود وفد نجران' سے بھی شامل کئے گئے ہیں تا کہ آنحضرت ﷺ کے فرمودات ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں اور قاری اس جامع فرمان کو ایک ہی جگہ ملاحظہ کر سکے۔)

یہ تحریر جہاں مذہبی آزادی کے لئے آنحضرت ﷺ کی جدّ و جہد کی اعلیٰ مثال ہے وہاں آپؐ کی وسعتِ قلبی کی بھی آئینہ دار ہے۔ اس کے ذریعے آپؐ نے اسلامی حدودِ مملکت میں نہ صرف آزادیٔ ضمیر و مذہب کو قائم فرمایا بلکہ اسے احکامِ شریعت میں بھی داخل فرمایا۔ ان احکام کے ذریعے آپؐ نے ہر مذہب والے کو مذہبی آزادی کی کھلی فضا مہیّا کی جو اسلامی سلطنت کا مطیع و محکوم تھا۔ آپؐ نے ان کے جملہ حقوق کا تحفّظ نیز فرائض کا تعیّن کر کے انہیں پُر امن زندگی جینے کا اعزاز و اعتماد عطا فرمایا۔

پس ایسے وسیع الظرف انسان کے لئے ایسے وضعی واقعات پیش کرنا کہ وہ گالی دینے والے کو مروا کر دم لیتا تھا، افسوس کا مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی پاک ذات پر بہت بڑا بہتان ہے۔

رسول اللہ ﷺ جو انتقام لیتے تھے، اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جو سورۃ الشوریٰ میں مذکور ہے کہ ''وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَھُمُ الْبَغْیُ ھُمْ یَنْتَصِرُوْنَ'' (41) کہ جب ان کو کوئی ظلم پہنچتا ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ لفظ ''یَنتَصِرُون'' کا مادہ 'ن ص ر' یعنی 'نصر' ہے۔ اس کے معنے مدد کے ہیں۔ یعنی ''یَنتَصِرُون'' میں مدد کا لازم مفہوم شامل ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی مدّ نظر رکھنا چاہئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے بدلے کے لئے لفظ ''یَنْتَصِرُوْن'' استعمال فرمایا ہے، ''یَنْتَقِمُوْنَ'' نہیں

فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی ایسا انتقام لیتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی اغراض کے لئے اس کی مدد کے ساتھ منسلک ہوتا تھا۔ آپؐ نے اس کا مظاہرہ قرآنی حکم "فَاسْتَبِقُوْا الْخَيْرَاتِ" (کہ نیک کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو) کے تحت یہ کیا کہ نیک، مثبت اور تعمیری کام کو آگے بڑھایا۔ انسان کو انفرادی طور پر اور معاشرے کو مجموعی طور پر بُرے، منفی اور تخریبی کاموں سے بچانے کی سعی فرمائی۔ بُرائی کا اچھائی سے، بدی کا نیکی سے اور جبر و ظلم کا عفو سے انتقام لیا۔

انتقام کا یہ خوبصورت اسلوب تھا جو آپؐ نے اختیار فرمایا۔ انتقام کی یہ ادائیں تھیں جو آپؐ نے پیش فرمائیں اور اپنے پیروکاروں کو سکھائیں۔ یہ انتقامِ محمدی ہے جس کا ذکر حضرت عائشہؓ نے فرمایا ہے۔ اس میں کسی خون خرابے اور ظلم و جبر کا شائبہ تک نہ تھا بلکہ وہ عفو و درگزر اور لطف و احسان سے لبریز تھا۔

شفقت علیٰ خلق اللہ:

آپؐ رحمۃٌ للعالمین تھے۔ آپؐ کا دامنِ عفو و کرم اور سایۂ رحمت صرف انسانوں پر ہی وسیع نہیں تھا۔ وہ تمام مخلوقات پر حاوی تھا۔ چنانچہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں تھے کہ ایک اونٹ آپؐ کو دیکھ کر بلبلانے لگا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ آپؐ اس کے پاس تشریف لے گئے۔ اس کے سر اور گردن پر ہاتھ پھیرا تو وہ پُر سکون ہو گیا۔ آپؐ نے پوچھا: "یہ کس کا اونٹ ہے؟" ایک انصاری نوجوان نے عرض کی : "یہ اس کا اونٹ ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "اس جانور کے بارے میں تم اللہ کا تقویٰ کیوں اختیار نہیں کرتے جس کا اللہ نے تمہیں مالک بنایا ہے؟ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور کام بھی زیادہ لیتے ہو۔" (ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایؤمر بہ من القیام علی الدّوابّ والبہائم)

ایک سفر میں آپؐ کے ایک ساتھی نے چڑیا کے بچے پکڑ لئے۔ وہ چڑیا حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس آکر بیقراری سے پھڑ پھڑانے لگی۔ آپؐ نے (بے تاب ہو کر) فرمایا: ’’ اس چڑیا کو اس کے بچوں کے ذریعے کس نے دکھ پہنچایا ہے؟ جاؤ اور اسے اس کے بچے واپس لوٹاؤ۔‘‘ (ابو داؤد کتاب الجہاد باب کراہیۃ حرق العدوّ بالنار)

ایک صحابیؓ بیان کرتے ہیں: ’’ایک دفعہ ایک سفر میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے چیونٹیوں کا بِل دیکھا جس پر ہم نے آگ جلائی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ’’کس نے ایسا کیا ہے؟‘‘ ہم میں سے بعض نے بتایا کہ انہوں نے ایسا کیا ہے تو آپؐ نے فرمایا: ’’ سوائے آگ کے ربّ کے کسی کے لئے اللہ کا عذاب دینا جائز نہیں۔‘‘ (ابو داؤد کتاب الجہاد باب کراہیۃ حرق العدوّ بالنار)

آپؐ کی یہ بھی تعلیم تھی کہ جانور کو تیز دھار چھری سے ذبح کرو تاکہ اسے زیادہ تکلیف نہ ہو۔ (مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان بالذبح و ابو داؤد کتاب الضحایا باب فی النھی ان تصبر البھائم و الرفق بالذبیحۃ)

یہاںتک کہ جانوروں کے جذبات کا خیال رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے بھی فرمایا کہ جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح نہ کرو۔ (ابن ماجہ ابواب الذبائح باب اذا ذبحتم فاحسنوا الذبح)

یہ دردمند پاک اور گداز دل ہے محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا جو کسی جانور کی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتا ہے اور اس کے جذبات اور درد کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ جو انسان کو ذرا ذرا سی تکلیف سے بچانے پر بھی تعلیم دیتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو دعائیں دیتا ہے۔ حتّٰی کہ راستے سے معمولی سی شاخ جو کسی کی تکلیف کا موجب تھی، اپنے پیارے ربّ کے حضور اسے ہٹانے والے کے لئے مغفرت کی التجائیں کرتا ہے۔ (بخاری کتاب المظالم والغضب باب من اخذ الغصن ومایؤذی.....) ایسے

گداز دل انسان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ کسی انسان کو قتل کرا کے تسلّی پاتا تھا، سراسر جھوٹ ہے اوراس پر پرلے درجے کا بہتان ہے بلکہ اس سے بھی پرلے درجے کی گستاخی ہے۔

یہ چند نمونے کے واقعات ہیں۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کی ساری زندگی ایسے واقعاتِ رحم وکرم سے چھلک رہی ہے۔ ان واقعات سے کتبِ احادیث لبریز ہیں۔ یہ تمام واقعات چلّا چلّا کر منادی کرتے ہیں کہ آپؐ پر کشت وخون کے تمام الزام جھوٹے ہیں۔ مذکورہ بالا واقعات آپؐ کے وسیع دل کی نرم اور گداز نفسیاتی کیفیات کی سچی داستانیں بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں اور اس کی تمام مخلوق کے لئے آپؐ کے قلب پر، آپؐ کے دماغ پر اور آپؐ کی روح پر رحمت وکرم اور بخشش وترحّم کے علاوہ اور کچھ نقش نہ تھا۔ وہ آپؐ پر ایمان لانے والے تھے یا آپؐ کے دشمن، آپؐ پر درود بھیجنے والے مومن تھے یا آپؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے ناعاقبت اندیش، سبھی آپؐ کے عفو وکرم کے سائبان کے ٹھنڈے سایوں میں محفوظ و مأمون تھے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنی جان کا خطرہ نہیں تھا۔ آپؐ اگرچہ آقا ہیں مگر کمزوروں کی بندہ پروری فرماتے تھے۔ آپؐ بادشاہ تھے مگر بیکسوں کے خدمت گزار تھے۔ وہ مہربانیاں جو مخلوقِ خدا نے آپؐ سے دیکھیں وہ کسی نے اپنی ماں سے بھی نہ پائی تھیں۔ آپؐ رحمت کے ساتھ کمزوروں کا ہاتھ پکڑنے والے اور ناامیدوں کے لئے پُرشفقت غمخوار تھے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍوَّ بَارِکْ وَسَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

*****

انسانیت، انسان اور انسانی خون کا سب سے بڑا محافظ

*****

گزشتہ صفحات میں کتاب ”الصارم المسلول“ کے تجزیئے والے باب میں زیر عنوان ”سب سے طاقتور انسان، محمد رسول اللہ ﷺ“ کے تحت بعض واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ وہ واقعات آپؐ کے اُس حسین مزاج اور پاک سیرت کے دلکش پہلو سے پردہ کشائی کرتے ہیں اور گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے ہر موقع پر انسان کے خون کی حفاظت فرمائی ہے۔ خواہ وہ خون آپؐ کے شدید سے شدید جانی دشمن کا ہی کیوں نہ تھا، آپؐ نے بلا تفریق قوم و قبیلے اور مذہب و ملّت اسے تحفّظ فرمایا۔

انبیاء علیہم السلام کی گواہی:

ذیل میں چند مزید حقائق پیش کئے جارہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے اسی عظیم ترین اور احسان سے لبریز حسین ترین پہلو کی وضاحت کرتے ہیں کہ آپؐ ہر موقع اور ہر قدم پر انسانیت کے شرف اور انسان کے خون کی حفاظت فرمانے والے تھے۔ قبل اس کے کہ آپؐ کے حسن و احسان سے معمور ان واقعات کے چمن زار کی سیر کو نکلیں، پہلے ایک نظر صحفِ انبیاءؑ پر بھی ڈالتے ہیں کہ انہوں نے جب آپؐ کی حسین ذات کو نظرِ کشفی سے دیکھا تو آپؐ کے ان اوصافِ حمیدہ کی کیا نشاندہی فرمائی ہے۔ چنانچہ حضرت یسعیاہ علیہ السلام نے آپؐ کے بارے میں یہ پیشگوئی فرمائی کہ

"وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا۔ وہ نہ چلاّئے گا نہ شور کرے گا نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی۔ وہ مَسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا اور ٹمٹماتی بتی کو نہ بجھائے گا۔ وہ راستی کے ساتھ عدالت کرے گا۔(یسعیاہ: باب 42: آیت 2تا4)

تورات میں رسول اللہ ﷺ کی بابت علامات کے بارے میں حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے پوچھا گیا تو آپؓ نے بتایا: "وہ نبی تند خو اور سخت دل نہ ہو گا۔ وہ بازاروں میں شور نہ کرے گا۔ وہ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دے گا بلکہ عفو و درگزر سے کام لے گا۔"(بخاری کتاب البیوع باب کراہیۃ الشغب فی الاسواق)

حضرت یسعیاہؑ کی اس پیشگوئی میں مسلے ہوئے سرکنڈے سے مراد وہ بے بس اور بے کس لوگ ہیں جو حالات کی ستم ظریفیوں کے پسے ہوئے ہوں، وہ نبیؑ ان کی دستگیری فرمائے گا اور ٹمٹماتی ہوئی بتی سے مراد وہ لوگ ہیں جو تباہی کے کنارے کھڑے ہیں، وہ انہیں اس تباہی سے اس طرح بچالے گا کہ ان کی شمع حیات بجھ نہ پائے گی۔

حضرت یسعیاہؑ کی بیان فرمودہ یہ صفات رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے لمحے لمحے میں اپنی کمال تابانی سے اس طرح جلوہ گر ہیں کہ ان کا فیض ہر ایک کو پہنچتا رہا ہے۔

دعوتِ حق کے لئے جارحیّت سے گریز کی خواہش:

رسول اللہ ﷺ کے سپرد اللہ تعالیٰ کے پیغام کو دوسروں تک پہنچانا تھا۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے آپؐ ذرہ بھر مخاصمت سے بھی گریز فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک بار افسوس کا اظہار کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: "اَلَا رَجُلٌ یَحۡمِلُنِی اِلَی قَوۡمِهٖ فَاِنَّ قُرَیۡشًا مَنَعُوۡنِی اَنۡ اُبَلِّغَ کَلَامَ رَبِّیۡ"(ابوداؤد کتاب السنّۃ باب فی القرآن و ترمذی باب فضائل القرآن باب کیف کانت قراءۃ النبی ﷺ) یعنی

کاش! کوئی ایسی جرأت والا شخص ملے جو مجھے اپنی قوم میں لے جاکر رکھ سکے کیونکہ قریش نے مجھے اپنے ربّ کا کلام پہنچانے سے روک رکھا ہے۔ یہ پُر تشدّد اور جابرانہ سلوک تھا جو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے متبعین کے ساتھ مکّے والے روا رکھتے تھے۔ آپؐ کے اس فقرے کے تجزیئے سے آپؐ کی سیرت کا یہ پہلو انتہائی روشن ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ آپؐ اپنے جان، مال، اہل و عیال اور عزّت و ناموس کی بات نہیں کرتے۔ آپؐ یہاں اپنی کسی توہین کا شکوہ نہیں فرماتے۔ بلکہ آپؐ کو غم ہے تو یہ کہ مکّے میں رہ کر آپؐ اپنے ربّ کریم کے پیغام کی تبلیغ نہیں کر سک رہے۔ آپؐ کو اپنا سب کچھ چھوڑ کر کہیں جانے کی خواہش ہے تو صرف اس لئے کہ وہاں اپنے ربّ کے کلام کو لوگوں تک پہنچا سکیں۔ آپؐ کی اس بیقراری کے حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لئے مدینے کا راستہ کھولا اور پھر آپؐ کے لئے ہر سمت شاہراہیں کشادہ ہونے لگیں۔

ذہنی اور جسمانی اذیت دینے والوں کو درگزر:

طائف کے واقعے کا ذکر قبل ازیں گزر چکا ہے۔ وہاں رسول اللہ ﷺ کی جو توہین اور تنقیص کی گئی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ وہاں آپؐ کو بدنی اذّیت بھی دی گئی اور گالی گلوچ اور پیغامِ حق کو گستاخی کے ساتھ ردّ کر کے اصل ذہنی اذیّت بھی دی گئی۔ الغرض کونسی گستاخی تھی جو آپؐ سے روا نہیں رکھی گئی۔ اگر آپؐ اپنی توہین کا انتقام لینے والے ہوتے تو واپسی پر جب ملک الجبل نے آپؐ سے یہ عرض کی تھی کہ اگر آپؐ اجازت دیں تو وہ ان لوگوں کو پہاڑوں کے درمیان کچل دے تو آپؐ اسے منع نہ فرماتے اوران گستاخوں کو یہ سزا دلوا کر رہتے۔ مگر یہ آپؐ کے رؤوف و رحیم دل کا فیصلہ تھا کہ گالی گلوچ، ظلم و تشدّد اور سنگباری کرنے والوں کو بھی زندہ رکھوایا اورآخر کار دعاؤں کے ذریعے اسلام میں داخل کر کے انہیں اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے کارآمد وجود بنا دیا۔

یہ ہے کھلا کھلا فرق قتل کروانے میں اور زندگی کی حفاظت کرنے میں۔ خون بہانے میں اور خون بچانے میں۔ اگر قائلین قتل شاتم اور توہینِ رسالت کے قتل کے دعویداروں کے نظریئے کے مطابق شاتم یا شاتمین کو قتل کر دیا جائے تو ان میں سے وہ لوگ حاصل نہیں کئے جا سکتے جو آگے جا کر اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت کرنے والے ثابت ہوتے ہیں۔

جانی دشمن پر عفو و مہربانی:

سراقہ بن مالک ہجرت کے سفر میں رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے تعاقب میں تھا تاکہ وہ آپؐ کو گرفتار کر کے اور کفّارِ مکہ کے سپرد کر کے انعام حاصل کرے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ آپ دونوں کو اس کی گرفت سے باہر رکھا اور آپؐ کی حفاظت فرمائی بلکہ الٹا اسے آپؐ کے قبضے میں دے دیا۔ یہ شخص آپؐ کا جانی دشمن تھا مگر آپؐ نے اسے نہ صرف معاف کیا بلکہ اسے کسریٰ کے کنگنوں کی بشارت بھی عطا فرمائی۔ چنانچہ وہ بعد میں مسلمان ہو کر اسلام کا خادم بنا۔ (اسد الغابہ: سراقہ)

میثاقِ مدینہ، بین الاقوام امن و سلامتی کا ابدی عہد و معاہدہ:

مدینے پہنچ کر سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے مدینے کے انصار اور مکے سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجروں میں مؤاخاۃ قائم کی اور بھائی چارے کا معاشرہ تشکیل دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے وہاں کے دوسرے عناصر یعنی یہودی قبائل، بنو قریظہ، بنو قینقاع، بنو نظیر اور غیر یہودی قبائل اوس اور خزرج کے ساتھ ایک جمہوری معاہدے کا اہتمام کیا۔ یہ معاہدہ تاریخِ عالم میں میثاقِ مدینہ کے نام سے ہمیشہ عدل و امن اور عظمت و تقدّس کے مقام پر قائم رہے گا۔ یہ اہم معاہدہ قریباً سنتالیس شقوں پر مشتمل تھا جس کی چند دفعات یہ تھیں۔

۱۔ هٰذَا كِتَابٌ مِنْ مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قُرَيْشٍ وَاَهْلِ يَثْرَبَ وَ مَنْ تَبِعَهُمْ۔

۲۔ اِنَّهُمْ اُمَّةٌ وَّاحِدَةٌ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ۔

۳۔ وَاِنَّهُ مَنْ تَبِعَنَا مِنَ يَهُوْدٍ فَاِنَّ لَهُ النَّصْرُ وَالاُ سْوَةُ ،غَيْرَ مَظْلُوْمِيْنَ وَلَا مُتَنَاصِرِيْنَ عَلَيْهِمْ۔

۴۔ وَاِنَّ يَهُوْدَ بَنِى عَوْفٍ اُمَّةٌ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ لِلْيَهُوْدِ دِيْنَهُمْ وَلِلْمُسْلِمِيْنَ دِيْنَهُمْ۔

۵۔ وَاِنَّ لِيَهُوْدَ بَنِى النَّجَّارِ مِثْلَ مَا لِيَهُوْدَ بَنِى عَوْفٍ۔

۶۔ وَاِنَّ عَلَى الْيَهُوْدِ نَفَقَتُهُمْ وَعَلَى الْمُسْلِمِيْنَ نَفَقَتُهُمْ وَاَنَّ بَيْنَهُمُ النَّصْرُ عَلَى مَنْ حَارَبَ اَهْلَ هٰذِهِ الصَّحِيْفَةِ۔(سیرۃ ابن ہشام، زیر عنوان ' الرسول یوادع الیہود '۔ جلد 2، صفحہ 64)

میثاق کی ان شقوں کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ ایک تحریری معاہدہ ہے جو محمد النبی ﷺ اور مسلمانانِ قریش اور یثرب کے رہنے والوں اور ان کے حلیفوں کے درمیان قرار پایا ہے۔

اس معاہدے میں شامل تمام طبقات ایک اُمت اور ایک قوم شمار ہوں گے۔ اس معاہدے میں جو یہود شامل ہیں ضرورت کے وقت اُن سب کی مدد کی جائے گی۔ ان کے خلاف کسی قسم کا ظلم برداشت نہیں ہو گا اور نہ ان کے خلاف کسی اور کی مدد کی جائے گی۔

یہودی قبائل مدینے کے جس قبیلے کے حلیف ہیں وہ اُس قبیلے کے ساتھ ایک قوم شمار ہوں گے۔ مثلاً بنو عوف کے یہودی حلیف، بنو عوف کے ساتھ اور بنو نجار کے یہودی حلیف، بنو

نجّار کے ساتھ یکساں حقوق کے مالک ہوں گے۔ غرض مختلف مسلمان قبائل کے حلیف یہودی سارے مسلمانوں کے ساتھ بطور اُمّتِ واحدہ شامل سمجھے جائیں گے۔ لیکن یہ شمولیت اور مساوات صرف دنیوی اور انسان کے بنیادی حقوق تک محدود ہو گی۔ ورنہ دین و مذہب میں ہر شخص آزاد ہو گا۔ یہودیوں کا اپنا دین اور مسلمانوں کا اپنا دین ہو گا۔ اس میں ایک دوسرے کو دخل دینے کی اجازت نہ ہو گی۔

قومی ضرورت کے وقت ہر گروہ اپنے اپنے اخراجات کا ذمے دار ہو گا۔ مسلمان اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے اور یہودی اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے۔ اگر کوئی اور گروہ معاہدے میں شامل قوم سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گا تو سب مل کر اس کا مقابلہ کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کے ذمے دار ہوں گے۔"

امن و آشتی کا یہ منفرد معاہدہ ہے جس کی نظیر نہ پہلے کبھی دنیا میں موجود تھی اور نہ آئندہ اس سے بہتر کوئی معاہدہ ظہور میں آسکتا ہے۔ میثاقِ مدینہ رہتی دنیا تک یہ شہادت پیش کرتا رہے گا کہ باوجود اس کے کہ مدینے کے یہود اور منافقین رسول اللہ ﷺ کو اذیت دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے، آپؐ نے انہیں ان خاص حالات میں "امّتِ واحدہ" میں شامل رکھا۔ آپؐ نے اسلام کو ایسے وسیع النظر، وسیع القلب اور وسیع الظرف مذہب کے طور پر پیش فرمایا جو دنیا کی ہر قوم اور مذہب کو اپنے اندر سمو کر اسے "امّتِ واحدہ" بننے کی دعوت کے ساتھ اس کے قیام کے لئے عملی لائحۂ عمل بھی پیش کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی امن کے معاہدے مدینے کے اِرد گرد بسنے والے بعض قبائل سے بھی کئے۔ اس کے لئے آپؐ نے جہاں جانا ضروری سمجھا وہاں آپؐ بذاتِ خود تشریف لے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ مدینے کے ماحول کو پُر امن رکھا جائے۔ یہاں ایک ایسا معاشرہ پیش کیا

جائے جو اللہ تعالیٰ کے دین کی اصل غرض وغایت ہے۔ جو اَسْلِمْ تَسْلَمْ (امن کے معاہدے میں داخل ہو جاؤ تو تمہیں مستقل طور پر امن کی ضمانت مل جائے گی) کا عملی نمونہ ہو۔ جس کے تحت سب قومیں معاہدوں کی پُرامن فضا میں آکر ایک ایسے نظام کی اطاعت میں آجائیں جو ہر ایک کو شرطیہ امن اور اعلیٰ تحفّظ کی ضمانت دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ایسے معاہدے خطۂ عرب اور پھر ساری دنیا کے لئے پائیدار امن و سلامتی کی نوید تھے جن سے ہر قوم و قبیلے کے افراد کے جانی و مالی اور انسانی حقوق کا تحفّظ وابستہ تھا۔

معاہدہ شکنی پر درگزر:

یہودِ مدینہ نے بار بار میثاق مدینہ کی خلاف ورزی کی اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کارروائیاں کیں مگر رسول اللہ ﷺ نے بھی انہیں بار بار معاف فرمایا۔ 4ھ میں یہود بنی نضیر نے آپؐ کو اپنے ہاں بلا کر آپؐ پر مکان کی چھت سے ایک بڑا پتھر آپؐ پر گرانے کی سازش کی مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو وحی کے ذریعے اس کی اطلاع دے کر آپؐ کی حفاظت فرمائی۔ (ابن ہشام وابن سعد) آپؐ نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ کیونکہ آپؐ انسانی خون کا تحفظ فرمانے والے اور انسانیت کو خون سے محفوظ رکھنے والے تھے۔

قیامِ امن کے لئے ہر ممکنہ کوشش:

رسول اللہ ﷺ ہر ممکن امن و آشتی کے قیام کے لئے کوشش فرماتے تھے۔ چنانچہ حدیبیہ میں معاہدے کے وقت آپؐ کا فرمانا تھا: ”وَالَّذِی نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یَسْاَلُوْنِیْ خُطَّۃً یُعَظِّمُوْنَ

حُرُمَاتِ اللّٰہِ اِلَّا اَعْطَیْتُھُمْ اِیَّاھَا۔ ''(بخاری کتاب الشروط باب الشروط فی الجھاد.....) کہ بخدا وہ جو مطالبہ بھی حرم کی عزت کے لئے مجھ سے کریں گے میں اسے قبول کروں گا۔

آپؐ کے اس فرمان میں دو باتیں بہت واضح طور پر نظر آتی ہیں جو حتمی طور پر امن و سلامتی کی ضامن ہیں اور زمین کو کشت و خون سے بچانے والی ہیں۔

اوّل: یہ کہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جنگوں کے ذمہ دار صرف اور صرف قریش تھے۔ اب حدیبیہ میں معاہدے کے ساتھ وہ آئندہ جنگوں سے دستبردار ہو رہے تھے۔ اسلام کے لئے یہ فتحِ مبین تھی جس کے لئے شعائر اللہ کی حرمت کے لئے ہر شرط قبول کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی ہر شرط قبول فرمائی اور عرب سے خونریزی کے اختتام کے لئے ایک بنیادی معاہدہ طے فرمایا۔

دوم: یہ کہ حدیبیہ کے اس معاہدے کی شرائط بظاہر اسلام یا مسلمانوں کے خلاف تھیں مگر آپؐ نے محض اس لئے ان شرائط کو قبول فرمایا کہ خطۂ عرب میں امن و امان اور صلح و آشتی کی فضا قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس طرح آپؐ نے ایک نہ ختم ہونے والی خونریزی کا صدر دروازہ بند کرنے کی انتہائی اور کامیاب کوشش فرمائی۔

أَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا:

آنحضرت ﷺ کا ایک پُر از رحمت طریق یہ بھی تھا کہ آپؐ بسا اوقات قبائل کو یا انفرادی طور پر بعض لوگوں کو (أَسْلِمُوْا تَسْلَمُوْا یا أَسْلِمْ تَسْلَمْ) کا پیغام بھجواتے تھے۔ آپؐ نے جب بادشاہوں کو خطوط لکھے تو انہیں بھی أَسْلِمْ تَسْلَمْ کا پیغام دیا۔ اسی طرح بعض اوقات ہمیں اس طرح کے پیغام جنگی مواقع میں بھی نظر آتے ہیں۔

عام طور پر اس پیغام کا ایسا مفہوم لیا جاتا ہے جس میں جنگ کے منظر میں ایک دھمکی کی آمیزش نظر آتی ہے۔یعنی تم مسلمان ہو جاؤ تو محفوظ رہو گے ورنہ نہیں۔ یہ مفہوم اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے 'أَسْلِمْ ' کے معنے اسلام قبول کرنے کے بھی ہیں اور مطیع، تابع اور فرمانبر دار ہونے کے بھی۔ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرماتا ہے: ''اَسْلِمْ'' تو آپؑ جواب دیتے ہیں'' اَسْلَمْتُ'' ۔(البقرہ:132)اس آیت میں بغیر کسی ابہام کے واضح ہے کہ یہاں''اَسْلِم'' یا'' اَسْلَمْتُ'' کے معنے اسلام قبول کرنے کے نہیں ہیں بلکہ کامل فرمانبرداری کے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اطاعت، کامل فرمانبرداری اور مکمل تابعداری کے معنوں میں آیا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کے فرمان''أَسْلِمْ تَسْلَمْ '' کے معنے بھی کامل فرمانبرداری کے لئے جائیں گے۔

یہاں یہ مدّ نظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلام کی طرف بلانا آنحضرت ﷺ کا منصب تھا۔اس کے لئے آپؐ نے ہر کس و ناکس کو دعوت دی۔ آپؐ کی خواہش ہوتی تھی کہ ہر شخص اسلام قبول کر کے دنیوی لحاظ سے بھی کامل امن میں آجائے اور اپنی عاقبت اور آخرت کے اعتبار سے بھی مأمون ہو جائے۔اس دعوت میں آپؐ نے نہ تو کبھی جارحیّت سے کام لیا،نہ جبر سے اور نہ ہی کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی کو اسلام میں داخل کیا۔ مثلاً آپؐ نے کبھی کسی قیدی کو قید میں مجبور پا کر اسلام میں داخل نہیں کیااور نہ ہی کسی قیدی کی قیمت پر اس کے لواحقین کو اسلام میں داخل کیا۔ پس عام حالات میں اسلام کی دعوت دینا بالکل اور بات ہے اور کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اسے اسلام میں داخل کرنا بالکل اور بات۔ خاص جنگ کے مواقع پر أَسْلِمْ تَسْلَمْ کا پیغام دینا، جنگ سے گریز، امن، سلامتی اور صلح کا پیغام ہے نہ کہ دینِ اسلام میں داخل ہونے کی دعوت۔ ایسے مواقع پر امن کے معاہدے ہوتے ہیں، مذہب میں داخل ہونے کے

معاہدے نہیں ہو سکتے۔ آنحضرت ﷺ کے اس پیغام میں اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کا عکس بڑا واضح نظر آتا ہے کہ "وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ" (الانفال: 26) کہ اگر وہ صلح کی طرف جھک جائیں تو تُو بھی اس کے لئے جھک جا اور اللہ پر توکّل کر۔

مذہب کا تعلق دل کی رغبت اور تسلیم سے ہے۔ جنگ اور خوف کی حالت میں اگر کوئی اپنا مذہب تبدیل کرتا ہے تو اس وقت غالب امکان یہ ہوتا ہے کہ وہ دل سے نہیں بلکہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے یا بالفاظِ دیگر اپنے قتل کے خوف کی وجہ سے ،از راہِ منافقت ایسا کرتا ہے۔ مسلمانوں کو جبر کے ساتھ ان کے دین سے پھرانے کی کوشش اصل میں کفّار کا شیوہ تھا اور آنحضرت ﷺ ان کو اس طریق سے روکتے تھے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ آپؐ خود اپنے ہی مسلک کے خلاف اقدام کرتے؟ پس ظاہر ہے کہ کسی کو تلوار کے خوف سے اسلام میں داخل کرنا آپؐ کا نہ پیغام تھا، نہ منشا، نہ طریق۔

جنگی حالتوں میں أَسْلِمْ تَسْلَمْ میں آپؐ کا پیغام یہ تھا کہ صلح و آشتی کے ساتھ ہمارے مطیع ہو کر ہمارے ساتھ مل جاؤ اور امن کے لئے ہماری پیش کش قبول کر لو تو امن و سلامتی میں رہو گے۔ ہاں اگر مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو یہ تمہارا فیصلہ اور اختیار ہے جس کے تحت ہم تمہیں امن کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ ہاں اگر ہماری سرپرستی میں آتے ہو تو پھر ہر حال میں اور ہر صورت میں ہم تمہارے لئے امن و سلامتی کے ضامن ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے اس پیغام کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں تھے اور انہی معنوں کی رُو سے آپؐ کے اس پیغام میں مذہب تبدیل کرنے کی ہرگز کوئی دھمکی موجود نہیں تھی۔

یہ ایک ٹھوس اور واقعاتی حقیقت ہے کہ مذہب میں داخل کرنے کے لئے اسلام کسی جبر کی اجازت نہیں دیتا۔ آنحضرت ﷺ کا ساری زندگی کا طریق اور آپؐ کا مستقل عمل یہی تھا

کہ آپؐ نے جب بھی کسی دشمن کو مذکورہ بالا پیغام دیا تو اس کے بعد خواہ وہ شکست کھا کر آپؐ کے تابع ہوا یا معاہدہ کر کے، آپؐ نے اس کو کبھی بھی مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا۔ اسے اس کے مذہب و مسلک پر ہی رہنے دیا۔ گو مستشرقین نے بار بار ایسے اعتراض کئے ہیں کہ اسلام میں داخل کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کیا گیا تھا مگر غزوۂ بدر سے لے کر سریّہ حضرت اسامہ بن زیدؓ تک کوئی ایک حقیقی مثال بھی ایسی نہیں ہے جس سے وہ یہ ثابت کر سکتے ہوں کہ آنحضرت ﷺ تو کجا مسلمانوں کے کسی امیر لشکر نے بھی فتح حاصل کرنے کے بعد یا معاہدہ کرنے کے بعد کسی کو اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہونے پر مجبور کیا تھا۔

خونریزی سے پاک فتح:

فتح مکّہ کی مہم میں رسول اللہ ﷺ نے انسانی خون کی حفاظت کے لئے کئی تدابیر اختیار فرمائیں۔ احادیث کا مستند ریکارڈ بتاتا ہے کہ

☆ ایک تو آپؐ نے مکّے کی طرف اپنے خروج کو خفیہ رکھا۔ تاکہ کوئی مزاحمت نہ ہو کہ اس کی وجہ سے خونریزی ہو جائے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپؐ ان لوگوں کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے جنہوں نے آپؐ کی ہر نوع کی توہین و تنقیص ہی نہیں کی تھی بلکہ وہ آپؐ کے جان کے پیاسے بھی تھے۔ آپؐ ان کی بھی حفاظت کرنا چاہتے تھے اور ان میں سے اسلام کے لئے خدمات سرانجام دینے والے لوگ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آپؐ عفو و درگزر کا وہ معیار اور رحمت و کرم کی وہ مثال قائم کرنا چاہتے تھے جو قوموں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ چنانچہ آپؐ نے ان لوگوں کو انتہائی حکمتِ عملی کے ساتھ مدافعت سے باز رکھ کر محفوظ فرمایا۔

☆ دوسرے یہ کہ آپؐ نے جذباتی نعروں کی کلیتہً پیش بندی فرمادی تاکہ فاتحین کے دلوں میں گزشتہ مظالم کے بدلے لینے کے لئے کسی قسم کی انگیخت پیدا نہ ہو۔ چنانچہ ایک موقع ایسا پیدا ہوا کہ جب فاتحین کا جلوس مکّے کی گلیوں سے گزر رہا تھا تو انصار کے عَلَم بردار حضرت سعد بن عبادہؓ نے جوش میں آکر نعرہ بلند کیا : اَلْیَوْمَ یَوْمُ الْمَلْحَمَۃِ۔ اَلْیَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْحُرْمَۃُ۔ اَلْیَوْمَ اَذَلَّ اللّٰہُ قُرَیْشاً۔ کہ آج قتلِ عام کا دن ہے اور آج کعبے کی حرمت بھی حلال ہو جائے گی۔ آج اللہ تعالیٰ قریش کے لئے ذلّت کے سامان فرمائے گا۔ جب یہ خبر آپؐ تک پہنچی تو آپؐ ناراض ہوئے۔ کیونکہ اس قسم کے نعرے اشتعال پیدا کر سکتے تھے اور خون ریزی کا باعث بن سکتے تھے۔ اس لئے آپؐ نے انہیں ناپسند فرمایا۔ آپؐ نے ابوسفیانؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”سعدؓ نے غلط کہا ہے۔ آج تو رحم کا دن ہے۔ وَھٰذَا یَوْمٌ یُعَظِّمُ اللّٰہُ فِیْہِ الْکَعْبَۃَ وَیَوْمٌ تُکْسٰی فِیْہِ الْکَعْبَۃُ۔ کہ آج اللہ تعالیٰ کعبے کو عظمت عطا فرمائے گا اور آج کعبے کو غلاف پہنایا جائے گا اور قریش کے لئے عزّت کے سامان ہوں گے۔“ پھر آپؐ نے حضرت سعد بن عبادہؓ سے انصار کا جھنڈا لے کر ان کے بیٹے حضرت قیس بن سعدؓ کے سپرد کر دیا۔ تاکہ سعدؓ کو ایک طرح سے سرزنش بھی ہو جائے اور ان کا دل بھی میلا نہ ہو کیونکہ بیٹے کے سپرد جھنڈا ہونے کے یہی معنے ہیں کہ گویا سرداری کا یہ جھنڈا انہی کے گھر میں رہا۔ بہر حال حضرت سعدؓ سے جھنڈا منتقل کرنے سے باقی سب کو واضح طور پر یہ پیغام مل گیا کہ رسول اللہ ﷺ کو اس موقع پر کسی قسم کی انگیخت پسند نہیں ہو گی۔ (بخاری کتاب المغازی غزوۂ فتح مکّہ این رکز النبیؐ الرّایۃ..... وابنِ ہشّام غزوۃ فتح مکۃ، تعرض بعض المشرکین لنفر من الصحابۃ و زرقانی شرح المواہب اللدنیہ، غزوۃ فتح مکۃ)

یہاں بھی رسول اللہ ﷺ کے رؤوف و رحیم دل اور پُر رحمت جذبات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف مکّے والوں کے خون کی حفاظت فرمائی اور دوسری طرف ان کے مفتوح ہو کر شکست خوردہ جذبات بھی مجروح ہونے سے بچا لئے۔

☆ تیسرے آپؐ کی یہ تاکیدی ہدایت تھی کہ صرف مزاحمت کرنے والوں کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ اس مہم میں سوائے معمولی سی ایک جھڑپ کے اور کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ آپؐ کی اس حکمتِ عملی کی وجہ سے مکّے کی فتح بغیر خونریزی کے انتہائی پُر امن طریق پر ہوئی۔ اس کے نتیجے میں اہلِ مکہ سب کے سب محفوظ و مصئون ہو گئے۔

☆ چوتھے یہ کہ آپؐ نے مکے والوں کے خون اور ان کے جذبات کی اس طرح بھی حفاظت فرمائی کہ آپؐ نے اعلان کروایا کہ جو شخص مسجد حرام میں پناہ لے گا اُسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر جا کر پناہ لے گا اُسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جو اپنے گھر میں دروازے بند کر کے بیٹھ رہے گا اُسے بھی کچھ نہیں کہا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس اعلان سے آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں جوش نہ بڑھے اور وہ امن کی خاطر پُر سکون رہیں۔

یہ آپؐ کے ان اقدامات میں سے چند اقدام کا ذکر ہے جو آپؐ نے قوم کو ایک بڑی خونریزی سے بچانے کے لئے فرمائے۔

تشنگانِ لہو پر لطف و کرم:

مکّے کی فتح کے روز رسول اللہ ﷺ نے وہاں کے لوگوں کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم نے سالہا سال مخالفت کی۔ مسلمانوں کو زدو کوب کیا، انہیں قتل کیا، ان پر انسانیت سوز ظلم ڈھائے۔ اب بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ ان سے مخاطب ایک رحیم و کریم ذات ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا: ”جو ایک شریف اور کریم بھائی اپنے خطاکار بھائیوں سے روا رکھ سکتا ہے اور جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کے ساتھ روا رکھا تھا۔ اس کے سوا ہم آپؐ سے اور کسی سلوک کی توقع نہیں رکھتے۔“ آپؐ نے اس پر فرمایا: میرا

یہی ارادہ تھا۔ اِذْهَبُوْا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُم۔ جاؤ تم آزاد ہو (کسی قسم کی سزا تو کیا) آج کا دن کسی کی ملامت کا دن ہے نہ کسی سرزنش کا۔ آپؐ نے انہیں دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف کر دے۔

آپؐ کا یہ ایک عام طریق تھا کہ کسی سے عفو و درگزر کا سلوک فرماتے تو اس پر رِدائے دعا بھی تان دیتے تھے۔ اور اگر وہ ضرورتمند ہوتا تو اسے کچھ عطا بھی فرماتے تھے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلم شہریوں کے بارے میں ایک موقع پر فرمایا: ’’اِنَّمَا بَذَلُوْا الْجِزْيَةَ لِيَكُوْنَ دِ مَائُهُمْ كَدِمَائِنَا وَاَمْوَالُهُمْ كَاَمْوَالِنَا۔‘‘(الدرّ المختار وحاشیہ ابن عابدین (ردّالمختار) جزء4صفحہ 129 ۔زرقانی شرح المواہب اللدنیہ، جلد3صفحہ 278۔ نصب الرّایہ فی تخریج احادیث الہدایہ، جلد3، صفحہ 381) کہ وہ غیر مسلم جو اسلامی حکومت کے شہری ہیں اور باقاعدہ ٹیکس ادا کرتے ہیں ان کے خون ہمارے خونوں کی طرح (محترم و محفوظ) ہیں اور ان کے اموال ہمارے اموال کی طرح (قانونی تحفظات میں) ہیں۔

اس فرمانِ رسولؐ میں دیکھیں کہ کس طرح آپؐ ان لوگوں کے لئے اپنائیت کے جذبات رکھتے ہیں جو مسلمان نہیں تھے مگر اسلام کے معاہدۂ امن کے تحت اس کی جغرافیائی حدود میں مقیم تھے۔ ان کے خون اپنے خون کی طرح اور ان کے اموال اپنے اموال کی طرح قرار دیتے ہیں۔ ان کے جان، اموال، خون اور دیگر امور کی حفاظت کی مکمل ذمہ داری آپؐ نے لی ہوئی تھی۔ یہ ہے وہ امنِ عالم کی ضامن عظیم تعلیم جو آپؐ نے اپنی امّت کو دی ہے تا کہ وہ بھی خونریزی سے باز رہیں اور دیگر مذاہب واقوام کے افراد کے لئے پائیدار امن مہیّا کرنے والے ہوں۔

سزائے موت پر بھی سایۂ عفوورحمت:

آپؐ نے فتح مکہ کے موقع پر بعض جنگی، قومی، محاربت یا قصاص کے مجرموں کے لئے سزائے موت کا اعلان بھی فرمایا۔ ان کے جرائم ظالمانہ، محاربانہ، سنگین اور بھیانک تھے۔ ایسے افراد کم و بیش گیارہ تھے۔ لیکن جب اس سزا پر تعمیل کا وقت آیا تو ان میں سے بھی سات کو نہ صرف معاف فرمادیا بلکہ ان کی ندامت اور توبہ کی وجہ سے بعض کی دلداری بھی فرمائی۔

ان مجرموں میں سے جو عملاً قتل ہوئے ان میں سے صرف عبد اللہ بن خطل ایسا تھا جو اس موقع پر بھی محارب ہو کر قتال کے لئے نکلا تھا لہٰذا قتل ہوا۔ باقی تین مقتول ایسے تھے جو رحمت مجسّم ﷺ تک پہنچنے سے قبل کسی نہ کسی کے ہاتھ لگ گئے تو قتل ہو گئے۔ ورنہ دیگر سزاوار جو آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر معافی کے طلبگار ہوئے تھے، آپؐ نے انہیں معاف فرمادیا تھا۔

اس رحمت کے سلوک کے پیشِ نظر آپؐ کے کریمانہ عمل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چنداں مشکل نہیں کہ اگر قتل ہونے والے بھی آپؐ کی خدمت میں پیش ہو کر معافی کے طلبگار ہوتے تو آپؐ ان پر بھی اپنی چادرِ رحمت دراز کرتے ہوئے ضرور معاف فرمادیتے۔ پس اس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھی کہ آپؐ ہر حالت اور ہر قیمت پر عفوودرگزر کرنے والے اور انسانی خون کے محافظ تھے۔

ایسے افراد جنہیں آنحضرت ﷺ نے سزاوارِ قتل قرار دینے کے باوجود معافی دی، مسلمانوں کے خلاف جرائم میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ بعض وہ بھی تھے جو جنگوں میں مسلمانوں

کے بھاری جانی ومالی نقصان کے ذمہ دار بھی تھے۔ آپؐ نے سبّ و شتم تو کیا، ان کی ساری زیادتیاں اور سب ظلم اپنے سایہ عفوو رحمت سے ڈھانپ دیئے۔

ایک قابلِ ذکر واقعہ۔ عکرمہ کی معافی

چونکہ یہاں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سبّ و شتم کی سزا کی بات ہو رہی ہے، اس لئے یہاں عکرمہ بن ابی جہل کا ذکر ایک خاص اہمیّت کا حامل ہے۔ یہ نوجوان، آپؐ کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل کا بیٹا تھا۔ یہ بھی اپنی معاندت اور دشمنی میں کسی سے کم نہ تھا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں نے بہت دُکھ اُٹھائے تھے۔ اس کے لئے بھی آپؐ نے سزائے موت کا فرمان جاری فرمایا تھا۔ وہ اسی کے خوف سے یمن کی طرف بھاگ گیا تھا۔ اس کی بیوی اُمِّ حکیم بنت الحارث مسلمان ہو چکی تھیں۔ وہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئیں: " آپ عکرمہ کو معاف کر دیں۔ تا کہ وہ مکہ واپس آسکے۔" ان کی اس درخواست پر آپؐ نے عکرمہ کو معاف فرما دیا۔ چنانچہ وہ اپنے خاوند کی تلاش میں نکلیں۔ ساحل سمندر پر پہنچیں تو جہاز لنگر اُٹھا چکا تھا مگر ابھی ساحل سے دور نہ ہوا تھا۔ اُنہوں نے اپنا دوپٹہ ایک لمبی لکڑی پر باندھا اور اُسے ہوا میں لہرایا۔ یہ اس بات کی علامت سمجھا گیا کہ کوئی مصیبت زدہ عورت فریاد کر رہی ہے۔ چنانچہ جہاز رُک گیا۔ اُمّ حکیمؓ ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر جہاز تک پہنچیں اور عکرمہ سے کہا: " اے میرے چچا کے بیٹے! جِئْتُكَ مِنْ أَوْصَلِ النَّاسِ وَابَرِّ النَّاسِ وَ خَيْرَالنَّاسِ۔" کہ میں ایک ایسی ہستی کے پاس سے آئی ہوں جو صلہ رحمی میں سب سے بڑھ کر ہے۔ احسان میں اُس کی کوئی نظیر نہیں۔ انسانوں میں سے بہترین انسان ہے۔ اپنے آپ کو ضائع نہ کرو۔ میری بات مانو اور میرے ساتھ مکّے واپس چلو۔ حضورؐ نے آپ کو امان دے دی ہے۔ چنانچہ عکرمہ اپنی بیوی کے ساتھ واپس مکّے کی طرف چل پڑے۔

یہاں صرف خون کی حفاظت ہی نہیں، رسول اللہ ﷺ کے شرفِ انسانیت کے قیام کے انداز بھی ملاحظہ فرمائیں کہ ابھی عکرمہ راستے ہی میں تھے کہ آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا: ''عکرمہ واپس آرہا ہے۔ اُس کے والد کو اس کے سامنے بُرا بھلا نہیں کہنا۔ فَاِنَّ سَبَّ الْمَیِّتِ یُؤْذِیْ الْحَیَّ وَلَا یَلْحِقُ الْمَیِّتَ۔'' کہ مرنے والے کی برائی کرنے سے اُس کے زندہ رشتے داروں کو تکلیف پہنچتی ہے اور یہ بُرا ذکر میّت تک نہیں پہنچتا اور نہ وہ سن سکتا ہے۔ لہٰذا ایسے عبث فعل سے مومن کو بچنا چاہیئے۔

بہر حال عکرمہ اُمّ حکیمؓ کے ہمراہ مکے پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں اُنہوں نے حاضر ہو کر عرض کی کہ عکرمہ حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔ آپؐ یہ بات سن کر خوشی سے کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''ہاں ہاں دیر کیا ہے؟ عکرمہ کو جلد لے آؤ۔'' جب عکرمہ سامنے آئے تو آپؐ نے کہا: '' مَرْحَباً بِالرَّاکِبِ الْمُھَاجِرِ '' خوش آمدید اے مہاجر سوار! اتنا شاندار اعزاز دیکھ کر وہ حیرت میں ڈوب گئے اور عرض کی: ''میری بیوی اُمّ حکیم کہتی ہے کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔'' آپؐ نے فرمایا : ''وہ بالکل ٹھیک کہتی ہے۔'' یہاں عکرمہ کو وہ ساری زیادتیاں اور ظلم یاد آگئے جو وہ ماضی میں کر چکے تھے۔ ان کا سر شرم کے مارے جھک گیا اور بے اختیار بول اُٹھے۔ '' اَشْھَدُ اَنْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّکَ عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ وَقَالَ اَنْتَ اَبَرُّالنَّاسِ وَاَوْفَی النَّاسِ''۔ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور آپؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور مجھے یہ بھی یقین ہو گیا ہے کہ آپؐ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ احسان کرنے والے اور وعدہ وفا کرنے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے عکرمہ سے فرمایا: ''تم نے جو مانگنا ہے مانگ لو۔ میری دسترس میں جو کچھ ہوا دوں گا۔'' عکرمہ نے عرض کی : ''میری بخشش کے لئے دعا کی جائے کہ

جو دشمنیاں اور عداوتیں میں کر چکا ہوں اور جو گالیاں دے چکا ہوں وہ سب اللہ معاف کر دے۔" آپؐ نے ہاتھ اُٹھائے اور جناب الٰہی میں یوں دعا کی: " اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِعِکْرَمَۃَ کُلَّ عَدَاوَۃٍ عَادَنِیْھَا اَوْ مَنْطَقٍ تَکَلَّم بِہٖ وَ مَرْکَبٍ وَضَعَ فِیْہِ یُرِیْدُ اَنْ یَّصُدَّ عَنْ سَبِیْلِكَ۔" اے میرے اللہ! تو عکرمہ کی میرے متعلق وہ تمام عداوتیں، دشمنیاں، زیادتیاں اور بُرے بول جو اس نے بولے ہیں، معاف کر دے۔" اس کے بعد عکرمہ نے عرض کی: "حضور! میرے لئے کیا حکم ہے؟" آپؐ نے فرمایا: "کلمہ شہادت کثرت کے ساتھ پڑھا کرو اور اللہ کی راہ میں جہاد کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔"

عکرمہؓ نے حضور ﷺ کے سامنے عہد کیا کہ مَیں جتنا اللہ کی راہ سے روکنے کے لئے خرچ کیا کرتا تھا، اب اس سے دوگنا اللہ کی راہ کی طرف بلانے کے لئے خرچ کروں گا۔ نیز جتنی جنگیں مَیں نے اللہ کے راستے سے روکنے کے لئے لڑی ہیں، اس سے دوگنی اللہ کی رضا کے حصول کے لئے لڑوں گا۔ پھر عکرمہؓ نے جس والہانہ انداز میں اپنے اس عہد کو نبھایا اور اللہ کی راہ میں جو جو قربانیاں پیش کیں اس پر تاریخ گواہ ہے۔ فَرَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ (تاریخ الخمیس، غزوۃ فتح مکّۃ، جلد 2، صفحہ 92۔ ناشر مؤسسۃ شعبان للنشر والتوزیع بیروت)

رسول اللہ ﷺ کے عفو و درگزر کا یہ واقعہ دراصل آپؐ کی بعثت کے مقصد کی ایک بے مثال اور اس کے حسین پہلو کو واضح کرتا ہے کہ آپؐ ہر قیمت پر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا کر لوگوں کو راہِ ہدایت پر گامزن کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے آپؐ نے اپنی ذات کو کلّیۃً کالعدم کر کے ہر بدترین سے بدترین ظالم اور بڑے سے بڑے بدزبان ہرزہ گو کو بھی معاف فرمایا۔

سب جانتے ہیں کہ عکرمہ جو بہت بڑا دشمنِ اسلام تھا اور اس باپ کا بیٹا تھا جو بنیادی طور پر رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کی تذلیل اور اذیت کا ذمہ دار تھا۔ اس کے بارے میں آپؐ یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ باپ کے حوالے سے اس کے جذبات کا خیال رکھو۔

اس واقعے میں رسول اللہ ﷺ کی انتہائی کریمانہ دعا کو بھی تو ذرا ملاحظہ کریں۔ یہ فقرہ پڑھنے والا اور دل پر لکھ لینے والا فقرہ ہے۔ آپؐ فرماتے ہیں: ''اے میرے اللہ! تو عکرمہ کی میرے متعلق وہ تمام عداوتیں، دشمنیاں، زیادتیاں اور بُرے بول جو اس نے بولے ہیں، معاف کر دے۔'' یہ دعا کھول کھول کر گواہی دیتی ہے کہ اس نے جو بول بولے تھے، وہ آپؐ کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھے۔ مگر آپؐ نے اس کی بدکلامی، توہین اور تنقیص پر اسے قتل نہیں کروایا۔ بلکہ اپنے فطرتی جذبۂ عفو و کرم کی بنیاد پر بغیر کسی تردّد یا تکلّف کے اسے کلّیۃً معاف کر دیا۔ آپؐ کا عفو و درگزر، معافی اور بخشش کی بلندی ہر ظلم و توہین سے ارفع تھی۔ چنانچہ جس نے آپؐ کی توہین و تذلیل کی جتنی بھی کوشش کی وہ آپؐ کے پیمانۂ صبر و کرم سے نیچے ہی رہی۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍوَ بَارِکْ وَ سَلِّمْ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

یہ مستند تاریخی ریکارڈ شاہد ہے کہ عکرمہ کو یہ معافی دیگر جرائم کے علاوہ سبّ و شتم پر بھی دی گئی۔ آپؐ کو واضح طور پر علم تھا کہ عکرمہ آپؐ کے خلاف بدزبانی کیا کرتا تھا۔ آپؐ نے اسے بھی دعا ہی دی تاکہ اس کے دل پر ندامت وغیرہ کا کسی قسم کا کوئی بوجھ باقی نہ رہ جائے اور وہ شرح صدر کے ساتھ اور امن و سلامتی کی ضمانت کے ساتھ اسلام میں قدم رکھے۔ ایسے بے نظیر رؤوف و رحیم، وسیع الظرف اور لامتناہی حوصلے والے رسولِ رحمت و کرم ﷺ کے متعلق یہ کلمات زبان یا قلم سے نکالنا کہ آپؐ سبّ و شتم کرنے والے کو قتل کرواتے تھے، بذاتِ خود آپؐ کی توہین ہے۔ آپؐ کی طرف یہ ایک ایسی منفی اور ظالمانہ بات منسوب کی جاتی ہے جو آپؐ نے کبھی نہیں کی۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گالی گلوچ کے بارے میں ایسا ذکر کسی اور کے لئے نہیں فرمایا جیسا عکرمہ کے لئے فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبّ و شتم میں وہ دیگر شاتمین سے دو ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا اور ان میں سے وہ ایسا تھا جس کے لئے عفوِ خاص کے ساتھ مغفرت و بخشش کی دعا کی ضرورت تھی۔ پس آپؐ کے اس عمل سے ان لوگوں کے دلائل کا حتمی طور پر ردّ ہوتا ہے جو ہر ایک پر سبّ و شتم کا الزام عائد کر کے اس کے قتل کو اپنے غلط عقائد کے ثبوت کے لئے پیش کرتے ہیں۔

عدوّ مبین پر سائبانِ رحمت و کرم:

ابو سفیان بن حرب بھی شدید معاندین بلکہ ائمّۃ الکفر میں سے تھا۔ مخالفت اور دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ جنگ بدر کے بعد وہ دوسو سواروں کے ساتھ چھپ کر آیا اوراس نے مدینے کے یہودیوں کے ساتھ ساز باز کی۔ دو مسلمانوں کو شہید کیا اور بہت سے مویشی ہانک کر لے گیا۔ پھر اُحد اوراحزاب کی جنگیں اسی کی سرکردگی میں لڑی گئیں۔ جنگوں میں تشبیب کہہ کر اور رجزیہ اشعار پڑھ پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی توہین کا مرتکب ہوا۔ اُعلُ ہبل کے نعرے لگوا کر وہ اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی گستاخی کا مرتکب ہو چکا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے مکے کے لئے خروج سے دو چار روز قبل ہی وہ مدینے آیا تھا اور آپؐ سے مل کر بھی گیا تھا۔ پھر فتح مکہ کی مہم کے دوران وہ حضرت عباسؓ کو ساتھ لے کر مرّ الظّہران کے مقام پر بھی آپؐ سے ملا۔ آپؐ کے لئے یہ ایک نادر موقع تھا کہ آپؐ اللہ تعالیٰ، اپنے اور اسلام کے اس شدید ترین دشمن کو فوراً قتل کروا دیتے۔ مگر آپؐ نے اسے قتل نہیں کروایا۔ آپؐ نے اسے کلّیۃً معاف کر دیا۔

دورانِ گفتگو آنحضرت ﷺ نے اُس سے پوچھا: " اب بھی خدا کے سوا کسی اور معبود کو مانتے ہو؟" اس نے جواب دیا: " اگر خدا کے سوا ہمارے یہ بت بھی کوئی 'لاہوتی' مقام رکھتے تو ہمارا یہ حال نہ ہوتا جو ہوا ہے۔" پھر آپؐ نے پوچھا: "میرے رسول ہونے میں اب بھی کوئی شک باقی ہے؟" اس نے جواب دیا: "ابھی دل میں اطمینان نہیں۔" آپؐ نے اس پر کوئی سختی نہیں فرمائی۔ حالانکہ وہ آپؐ کے قبضہ و قدرت میں تھا لیکن حوصلہ، رحمت اور عطا کی ادا دیکھیں کہ فرمایا: " اچھا سوچو اور اطمینان کی راہیں تلاش کرو۔" پھر آپؐ نے اس کے اس تذبذب کے باوجود اس کے گھر کو پناہ گاہ قرار دیا اور اعلان کیا کہ جو لوگ سردار مکہ ابوسفیان کے گھر پناہ لے گا اُسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

یہ تھے ہمارے رحیم و کریم رسول اللہ ﷺ۔ جن کے عفو و کرم کے واقعات پر تاریخِ عالم حیرت زدہ ہے۔ آپؐ نے اپنی سیرتِ طیبہ اور پاک اخلاق کے ذریعے مکے کے سرداروں اور عام لوگوں کے دل اس طرح موہ لئے کہ سالوں کی دشمنیاں پل بھر میں محبت اور فدائیت میں بدل گئیں۔ پھر یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے حقیقی عبد بن کر اسلام کے سچے خادم اور رسول اللہ ﷺ کے جانثار فدائی بنے۔ انہوں نے اسلام کی اشاعت اور دین کے استحکام کے لئے ایسی ایسی قربانیاں پیش کیں کہ تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ پس یہ کہنا کہ آپؐ توہین کرنے والوں کو قتل کرواتے تھے، سفید جھوٹ ہے۔ آپؐ بد سے بدترین دشمن کو بھی سایۂ بخشش میں لے کر اسے زندگی بخش جام پیش فرماتے تھے۔ کیونکہ آپؐ انسانیت کے اور انسان کے خون کے سب سے بڑے محافظ تھے۔

سزا یافتگان کی معافی:

مختلف الانواع قومی و انسانی جرائم اور قصاص کے سزاوار مجرم جن کے لئے رسول اللہ ﷺ نے سزائے موت کا حکم دیا تھا، حسبِ ذیل تھے۔

عبد العزّیٰ بن خَطَل، اس کی دو داشتائیں، عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح، عکرمہ بن ابی جہل، ہبّار بن اسود، حارث بن نُفَیل، سارہ جو بنو عبد المطلب میں کسی کی لونڈی تھی، مقیس بن صبابہ،

کتبِ تاریخ میں مذکورہ بالا افراد کے علاوہ اُسید بن ایاس، وحشی بن حرب، ہند بنتِ عتبہ زوجہ ابوسفیان، حارث بن ہشّام، زہیر بن امیّہ، صفوان بن امیّہ اور مشہور شاعر کعب بن زہیر کے اسماء بھی درج ہیں۔ ان کتب میں ان مؤخّر الذّکر افراد کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا واضح طور پر حکم تو نہیں ملتا مگر یہ ضرور نظر آتا ہے کہ ان میں سے بعض سردارانِ قریش تھے اور بعض کے جرائم ایسے تھے کہ وہ خود خوف زدہ تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے گا یا ان کے بارے میں بھی حکمِ قتل جاری ہو جائے گا اس لئے وہ بھی امان کے طالب ہوئے۔ یہ آپؐ کے دامنِ رحمت کی وسعت تھی کہ باوجود اس کے کہ ان پر حکمِ قتل جاری ہو چکا تھا ان میں سے جس نے بھی معافی کی درخواست کی، آپؐ نے اسے معاف فرما دیا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ صرف چار افراد ایسے بد قسمت ثابت ہوئے جو سایۂ عفو میں آنے سے محروم رہے اور قرار واقعی سزا کے مستحق ٹھہر گئے۔ یہ سب وہ تھے جو حسبِ ذیل حکمِ الٰہی کے تحت سزا یافتہ قرار پائے تھے۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِيْ الْاَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِيْ الدُّنْيَا

وَلَهُمْ فِيْ الآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌo إِلاَّ الَّذِيْنَ تَابُواْ مِن قَبْلِ أَن تَقْدِرُواْ عَلَيْهِمْ فَاعْلَمُواْ أَنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌo (المائدہ: 34،35) ترجمہ: یقیناً ان لوگوں کی جزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ ہے کہ انہیں سختی سے قتل کیا جائے یا دار پر چڑھایا جائے یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں یا انہیں دیس نکالا دے دیا جائے۔ یہ ان کے لئے دنیا میں ذلّت اور رسوائی کا سامان ہے اور آخرت میں تو ان کے لئے بڑا عذاب (مقدّر) ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پیشتر توبہ کر لیں کہ تم ان پر غالب آجاؤ۔ پس جان لو کہ اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اس حکمِ الٰہی میں ایک اہم حصہ یہ بھی ہے کہ **"سوائے ان لوگوں کے جو اس سے پیشتر توبہ کر لیں کہ تم ان پر غالب آجاؤ۔** پس جان لو کہ اللہ بہت بخشنے والا (اور) بار بار رحم کرنے والا ہے۔" چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا عمل اس حکمِ الٰہی کے عین مطابق تھا اور جو آپؐ تک پہنچ کر معافی کے طلبگار ہوتے تھے، آپؐ انہی کو معاف کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ آپؐ نے اس حکمِ الٰہی پر کمال عفو و کرم کے ساتھ عمل فرمایا۔ یعنی ان سزا یافتہ افراد میں سے جو کسی کے قابو آجانے سے پہلے پہلے آپؐ کے پاس پہنچ گئے، آپؐ نے انہیں بالکل معاف کر دیا۔

قتل سے ہاتھ روکو:

فتح مکہ کے دوسرے روز رسول اللہ ﷺ نے ایک بار پھر بڑے سبق آموز اور جلالی رنگ میں قتل و غارت کے بد نتائج سامنے رکھتے ہوئے اس سے کلّیۃً ہاتھ اٹھا لینے کا ارشاد فرمایا کہ

"اِرْفَعُوْا اَيْدِيَكُمْ عَنِ الْقَتْلِ ،فَقَدْ كَثُرَ الْقَتْلُ اِنْ نَفَعَ۔" (ابنِ ہشّام و السیرۃ الحلبیہ غزوۂ فتح مکّہ) کہ قتل سے اپنے ہاتھ روکو۔ قتل تو بہت ہو چکا لیکن کیا اس نے کبھی کوئی فائدہ بھی دیا؟

یہ حکم صرف مکّے کی فتح کے ایّام تک محدود نہ تھا۔ یہ انسان کے لئے ایک حیات افزا دائمی پیغام ہے جو قیامت تک انسانی خون کو ضیاع سے بچانے والا ہے۔

آپؐ کے اس حکم نے رہتی دنیا تک یہ سچائی قائم فرمادی ہے کہ کشت وخون نے کبھی نفع نہیں دیا۔ اس نے ہمیشہ نقصان ہی پہنچایا ہے۔ بلکہ دنیا میں انسان اور انسانیت کو سب سے زیادہ نقصان قتل وغارت ہی نے پہنچایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بڑے واضح اور پُر انذار الفاظ میں دنیا کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً اس قطعی زیاں رساں عمل سے پرہیز اور گریز کی نصیحت فرمائی ہے۔

آپؐ فرماتے تھے کہ میری اور لوگوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی۔ جب اس کا ماحول روشن ہو گیا تو پتنگے اور کیڑے مکوڑے اس میں گرنے لگے۔ وہ ان کو آگ سے پرے ہٹانے لگا مگر وہ اس پر غالب ہونے لگے۔ پس میں تمہیں تمہارے کمر بند سے پکڑ پکڑ کر بچاتا ہوں اور تم اس میں گر گر پڑتے ہو۔ (بخاری کتاب الرّقاق باب الانتہاء عن المعاصی)

آپؐ انسان کو تباہی اور ہلاکت سے بچانے کی ہر ممکن کوشش فرماتے تھے اور آپؐ نے ہر ایسی تعلیم پیش فرمائی جو اسے تباہی اور قتل وخون سے بچانے والی تھی۔

ارادۂ قتل کے مجرم کو معافی اور دعا:

ایک اور واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ فتح مکّہ کے موقع پر خانہ کعبہ کے طواف کے وقت ایک شخص فضالہ بن عمیر رسول اللہ ﷺ کے قتل کے ارادے سے آپؐ کے قریب آیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ناپاک ارادے سے آپؐ کو مطلع فرمادیا۔ آپؐ نے اسے بلایا اور پوچھا کہ وہ کس

ارادے سے آیا تھا؟ جواباً اس نے جھوٹ بول دیا۔ آپؐ نے مسکرا کر اسے قریب بلایا اور بڑی ملائمت سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور اسے مزید کچھ نہ کہا۔

فضالہ بعد میں کہتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے جب اس کے سینے پر ہاتھ رکھا تو اس کی تمام تر نفرت عنقا ہو گئی۔ وہ اس وقت اسلام قبول کر کے آپؐ کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو گیا۔ (ابن ہشام جزو 4 صفحہ 20 قصۃ اسلام فضالہ۔ غزوۃ فتح مکّہ)

حقیقت یہ ہے کہ یہ شاندار کامیابیاں آپؐ کے عفو و در گزر، لطف و کرم، حسنِ اخلاق، للّٰہیت اور دعا کی مرہونِ منت تھیں۔ نیز اُس حکمتِ عملی کا ثمرِ شیریں تھیں جو "اُدۡعُ إِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ" (النحل:126) کے ارشادِ ربّانی پر مبنی تھی کہ اپنے ربّ کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے۔ آپؐ نے اس الٰہی حکم کی کماحقہٗ تعمیل کی اور کروائی۔ اسی حربے سے رسول اللہ ﷺ نے بے شمار لوگوں کو ہلاکتوں سے نکال کر ان کے لئے اخروی نجات کے سامان فرما دیئے۔

سچ یہ ہے کہ گستاخی کرنے والوں کو قتل کر کے کبھی کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ جبکہ انہیں معاف کرنے سے اور ان پر دامنِ بخشش دراز کرنے سے بہت کچھ حاصل ہوا۔ کیونکہ تلوار جسم کو تو کاٹ دیتی ہے، کفر اور نفاق کو نہیں کاٹ سکتی۔ کفر و نفاق کو لطف و کرم، رحمت و دعا اور حسن و احسان کی دھار کاٹتی ہے۔ مگر جس پر یہ دھار چلتی ہے وہ در حقیقت شربتِ وصل و بقا پی لیتا ہے اور ابدی زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عفو و دَر گزر کی یہ محض چند مثالیں ہیں جو آپؐ نے سالہا سال کے جانی دشمنوں پر سائبان کی طرح تانے رکھا۔ اس نوع کے واقعات آپؐ کے ذریعے دن رات اور

صبح و شام ظاہر ہوتے تھے۔ اپنوں کی غلطیاں معاف کرنے، محبت و شفقت، اُلفت و رأفت کے ساتھ ان کی تربیت کرنے اور تزکیۂ نفس کے لئے کوشاں رہنے کے واقعات بھی آپؐ کی زندگی کے لمحے لمحے کے ساتھ منسلک تھے۔ آپؐ اپنے جانی دشمنوں سے عفوو درگزر کرنے والے بھی تھے اوران کے لئے رؤوف ورحیم بھی۔

قتل پر شدّتِ درد:

فتح مکہ کے بعد قبائلِ عرب کی اسلام کی طرف رغبت کا خاص ماحول تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے عرب کے مختلف قبائل کی طرف تبلیغی وفود بھیجے۔ بنو کنانہ کی شاخ بنو جذیمہ جو مکّہ کے قریب یلملم کی جانب آباد تھے۔ آپؐ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو ان کی طرف اسلام کی اطاعت میں آنے کے پیغام کے ساتھ بھجوایا۔ یہ ایک خالص تبلیغی نیز انہیں اسلامی حکومت کے تحت لاکر امن اور حفاظت مہیّا کرنے کی مہم تھی۔ لیکن ان انقلابی حالات میں بنو جذیمہ کی طرف سے ردّ عمل کے خدشے سے رسول اللہ ﷺ نے تین سو پچاس افراد کی فوج بھی ان کے ہمراہ بھجوائی۔ ان میں مہاجرین و انصار کے ساتھ بنو سُلَیم کے افراد بھی تھے۔(ابنِ سعد سریۃ خالد بن ولید الٰی بنی جذیمۃ وزرقانی سریہ حضرت خالد بن ولیدؓ الٰی بنو جَذِیمہ)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اس سریّے میں شامل تھے ،بیان فرماتے ہیں: ”ان لوگوں نے بنو جذیمہ کو اسلام کی اطاعت میں آنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اس دعوت کو قبول کیا لیکن ”أَسْلَمْنَا“ کہ ہم مطیع ہوتے ہیں یا مسلمان ہوتے ہیں، کہنے کی بجائے ”صَبَانَا، صَبَانَا ‘ ‘ کہا۔ جس کا معنٰی تھا کہ ہم صابی ہیں ہم صابی ہیں۔ ان کے اس طرزِ اظہار سے حضرت خالدؓ نے اندازہ لگایا کہ انہوں نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ لہٰذا ان سے جنگ شروع کر دی جس کے نتیجے میں ان کے بہت سے افراد قتل ہوئے اور بہت سے قیدی بنائے گئے۔“ (بخاری کتاب

المغازی سریّہ حضرت خالد بن ولیدؓ الٰی بنو جَذِیمہ) حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔ مکّہ پہنچ کر جب ہم نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کیا تو آپؐ نے بڑے ہی درد کے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھائے اور دو مرتبہ خدا تعالیٰ کے حضور التجا کی: " اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَبْرَأُ اِلَیْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِد" اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے برأت چاہتا ہوں۔(بخاری کتاب المغازی سریّہ حضرت خالد بن ولیدؓ الٰی بنو جَذِیمہ)

رسول اللہ ﷺ نے فورًا حضرت علیؓ کو بنو جذیمہ کی طرف روانہ فرمایا اور ان کے مقتولین کا خون بہا اور ان کے اموال کے نقصان کا پورا معاوضہ ادا فرمایا۔ جب سب ادائیگی ہو چکی تو حضرت علیؓ پوری تسلّی اور تصدیق کرنے کے بعد وہاں سے مکّے کے لئے روانہ ہوئے۔ مکّے پہنچ کر آپؐ کی خدمت میں تفصیل پیش کی تو آپؐ کو قدرے تسلّی ہوئی۔ لیکن ان لوگوں کے قتل کی وجہ سے جو زخم آپؐ کے دل کو پہنچ چکا تھا اس نے پھر کروٹ لی اور ایک بار پھر آپؐ کا دل افسوس سے بھر گیا۔ آپؐ نے پھر ہاتھ اٹھائے اور خدا تعالیٰ کے حضور وہی التجا کی: " اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَبْرَأُ اِلَیْكَ مِمَّا صَنَعَ خَالِد" اے اللہ! جو کچھ خالد نے کیا میں اس سے برأت چاہتا ہوں۔ یہ التجا آپؐ نے تین بار دوہرائی۔ (طبری 8ھ و زرقانی بعث حضرت خالد بن ولیدؓ بطرف بنو جَذِیمہ و ابنِ سعد سریۃ خالد بن ولید الٰی بنی جذیمۃ)

یہ حالت تھی ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی کہ آپؐ اپنے سینے میں کسی کے قتل سے کس قدر دکھ محسوس کرتے تھے کہ تڑپ اٹھتے تھے۔ آپؐ تو لوگوں کو ہلاکتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے امن و سلامتی کی طرف بلاتے تھے۔ اگر کسی کا قتل ہو جاتا تو بیتاب ہو جاتے تھے۔ پس آپؐ پر ایسا الزام قائم کرنا کہ محض توہین کی وجہ سے یا گستاخی کے باعث آپؐ لوگوں کو قتل کرواتے تھے، آپؐ پر کھلا کھلا الزام ہے۔

یہاں اربابِ فہم و دانش خود فیصلہ کریں کہ قرآن کریم کے یہ ارشادات، آنحضرت ﷺ کا یہ اسوۂ حسنہ اور آپؐ کے صحابہؓ کی یہ سنّت واجب التعمیل اور اسلام کا دستور العمل ہے یا نام نہاد فقہاء یا علماء کی یہ ہدایت کہ شاتمِ رسولؐ کو قتل کرو، اس کا جرم ناقابلِ معافی اور اس کی سبّ و شتم ناقابلِ تلافی ہے۔ مذکورہ بالا واقعات کی شہادت کی بنیاد پر ہر سچّا محبِّ رسولؐ یہی گواہی دے گا کہ خدا کی قسم! میرے آقا و مولیٰ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ ایسے خون سے کلّیۃً بری اور پاک و صاف ہیں۔ آپؐ نے کبھی بھی اور اپنی زندگی کے کسی دَور میں بھی کسی کو اپنی توہین کی وجہ سے قتل نہیں کروایا۔

یہ مذکورہ بالا تمام واقعات یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ آپؐ کی زندگی میں ایک واقعہ بلکہ ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ آپؐ نے کسی سے اپنی ذات کے لئے انتقام لیا ہو۔ تو پھر یہ یقینی بات ہے کہ وہ مجموعۂ روایات جو قائلینِ قتلِ شاتم پیش کرتے ہیں لازماً وضعی اور جھوٹا ہے یا اگر کوئی صحیح روایت تھی تو اس سے استدلال جھوٹا پیش کیا گیا ہے۔ دنیا میں تو تعداد یا وزن بھی عدل و انصاف کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے۔ یعنی جس گروہ کی تعداد زیادہ ہو وہ کم تعداد پر بھاری ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ترازو کا ایک پلڑا ایک طرف جھکتا ہو تو اس پلڑے کو بھاری قرار دیا جاتا ہے۔ خواہ وہ ایک رتّی برابر بھی بھاری ہو۔ مگر یہاں رسول اللہ ﷺ کا عفو و کرم اور لطف و رحم سو فیصد حتمی ہے۔ آپ ؐ کی حیاتِ مبارکہ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو آپؐ کی عالمین پر محیط وسیع رحمت کے مقابل پر ترازو میں دوسرے پلڑے پر رکھا جا سکتا ہو۔

*****

سیرت طیّبہ کا ایک اور تابناک پہلو

*****

رحمۃٌ للعٰلمین رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیّبہ کا یہ پہلو بھی انتہائی تابناک ہے کہ بعض سرکشوں، باغیوں اور سازشیوں کی سرکشی، بغاوتوں اور سازشوں پر بھی آپؐ انہیں سزائے موت نہ دیتے تھے۔ بلکہ انہیں سبق سکھانے کے لئے ان کے اڈوں اور آلات کو ختم کر دیتے تھے مگر ان کی جانوں کو تلف ہونے سے بچاتے تھے۔ چنانچہ مدینے میں جو یہودی مقیم تھے ان میں سے بعض کسی نہ کسی موقعے پر اپنے بغض سے مجبور ہو کر ضرور سازش کرتے رہتے تھے۔ ذیل میں اس نوع کے چند واقعات پیش ہیں۔

۱) جادوگری کی ذلیل جسارت پر معافی:

بعض روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد آنحضرت ﷺ جب مدینے واپس لوٹے تو نعوذ باللہ ایک یہودی نے جس کا نام لبید بن اعصم تھا، آپؐ پر جادو کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ روایت بخاری میں "کتاب الطبّ باب ھل یستخرج السّحر" کے علاوہ دو اور جگہوں پر بھی بیان ہوئی ہے۔ آپؐ پر جادو ہو جانے کی تشہیر کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ آپؐ کے مقام و مرتبے اور عزّت و تقدّس پر انتہائی خوفناک اور گندہ حملہ تھا۔ کیونکہ جادو کرنے والا جادو زدہ پر ذہنی اور اعصابی لحاظ سے حاوی اور مسلّط ہوتا ہے۔ لہٰذا آپؐ پر جادو ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ ایک ناپاک یہودی نے نعوذ باللہ آپؐ جیسے عظیم الشان نبی، نبیوں کے سردار اور سیّد الخلق ﷺ کو ذہنی اور اعصابی لحاظ سے زیر کر لیا تھا اور وہ آپؐ پر مسلّط ہو گیا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ رسول اللہ ﷺ کی توہین کی یہ ایک انتہائی غلیظ اور گھناؤنی کوشش تھی۔

یہودیوں کی اس انتہائی گندی جسارت پر آپؐ کو اس قدر تکلیف تھی کہ آپؐ دعا پر دعا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اس گند کے دور کرنے کی استدعا کرتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرشتوں کے ذریعے اس یہودی کے مبیّنہ ذریعہ و آلاتِ جادو کی اطلاع عطا فرمائی۔ اس کی تفصیل کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ سے فرمایا:

"........اے عائشہ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ بات بتا دی ہے جو مَیں نے اس سے پوچھی تھی؟ مَیں نے عرض کی: "یا رسول اللہ! وہ کیا بات ہے؟ آپؐ نے فرمایا (رؤیا میں) میرے پاس دو آدمی آئے۔ ان میں سے ایک میرے سر کی طرف بیٹھ گیا اور دوسرا پاؤں کی طرف بیٹھ گیا۔ پھر ان میں سے ایک نے دوسرے سے پوچھا اس شخص کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے شخص نے (فتنہ پردازوں کے پروپیگنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جواب دیا کہ یہ وہی ہے جسے سحر کیا گیا ہے۔ اس پر پہلے آدمی نے پوچھا اسے کس نے سحر کیا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم یہودی نے سحر کیا ہے جو بنی زُرَیق کا حلیف ہے۔ اس پر پہلے شخص نے پھر سوال کیا کس چیز کے ذریعہ سحر کیا گیا ہے؟ دوسرے نے کہا۔ ایک کنگھی میں سر کے بالوں کی گرہیں باندھی گئی ہیں اور پھر اسے کھجور کی ایک خشک شاخ میں لپیٹ کر رکھا گیا ہے۔ پوچھنے والے نے سوال کیا یہ کنگھی وغیرہ کہاں رکھی ہے؟ دوسرے نے جواب دیا وہ ذروان کے کنوئیں میں رکھی ہے۔ اس خواب کے بعد آپؐ اپنے بعض صحابہؓ کے ساتھ اس کنوئیں پر تشریف لے گئے اور اس کا معائنہ فرمایا۔ اس پر کھجوروں کے کچھ درخت تھے۔ پھر آپؐ حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "عائشہ! میں اسے دیکھ آیا ہوں۔ اس کنوئیں کا پانی مہندی کے پانی کی طرح سُرخی مائل تھا اور اس کے کھجور کے درخت تھوہر کے درختوں کی طرح مکروہ نظر آتے تھے۔" حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "مَیں نے عرض کی کہ آپؐ نے اس کنگھی وغیرہ کو باہر نکلوا

کر پھینک کیوں نہ دیا؟" آپؑ نے فرمایا : "خدا نے مجھے محفوظ رکھا اور مجھے شفا دے دی تو پھر مَیں اسے باہر پھینک کر لوگوں میں ایک بُری بات کا چرچا کیوں کرتا۔ البتّہ جادو کے مقام یعنی اس کنوئیں کو بند کروا دیا گیا ہے"۔(بخاری کتاب الطبّ باب ھل یستخرج السحر)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان لوگوں کو بھی معاف کر دیا جو آپؐ کے خلاف ایسی ذلیل اور گندی حرکت کر کے خوفناک توہین کے مرتکب ہوئے تھے کہ گویا وہ جادو کے ذریعے آپؐ پر مسلّط ہونے کے اعلان کر رہے تھے۔ مگر انسانی خون کے محافظ اور رحمتِ مجسّم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ظرف و حوصلے کی بے کنار وسعتوں کے ساتھ اس کے بے انتہاء عفو و بخشش کو بھی دیکھیں کہ ایسے ناقابلِ معافی جرم کے ارتکاب پر بھی اس شخص کو صاف معاف کر دیا تھا۔ یہ مجرم ہر طرح سے آپؐ کے قبضہ و قدرت میں تھے اور آپؐ انہیں ایک جنبشِ شمشیر سے تہِ تیغ کر سکتے تھے۔ مگر آپؐ نہ کبھی ایسا کرتے تھے اور اور نہ ہی کسی کو ایسا کرنے دیتے تھے۔ آپؐ عفو اور عطا کے ذریعے ظلم و زیادتی کا بدلہ چکاتے تھے۔

کاش! وہ لوگ جو توہین کی سزا قتل قرار دیتے ہیں، اپنے ہاتھ سے تلوار پھینک کر اور اپنی آنکھوں میں اترے ہوئے خون کو صاف کر کے ذرا اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی رحمت و عفو کے ان واقعات کو بھی دیکھ لیں اور آپؐ کی طرف وہ ظلم منسوب نہ کریں جس کی روک تھام اور انسداد آپؐ کی بعثت کی ایک بڑی غرض تھی اور اس کے لئے آپؐ نے بار بار تاکیدی ارشاد فرمائے۔

۲)سازشوں کا اڈّہ:

اسی طرح کا ایک اور مگر مزید سنگین واقعہ یہ بھی ہے کہ سُوَیْلَم نامی ایک یہودی مدینے کے علاقے جاسوم میں مقیم تھا۔اس کا گھر منافقوں کا گڑھ تھا۔منافق وہاں اکٹھے ہوتے اور غزوۂ تبوک کے بارے میں دہشت والی باتیں تراشتے،افواہیں گھڑتے اور پھر انہیں صحابہؓ میں پھیلاتے تاکہ ان کے حوصلے پست ہوں اور وہ خوف کی وجہ سے اس غزوے میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ نہ جاسکیں۔ آپؐ کو اس کا علم ہوا تو آپؐ نے حضرت عمّار بن یاسرؓ کو بھیجا کہ وہ ان کو بتادیں کہ انہوں نے ایسی سازشیں تیار کی ہیں اور منافقانہ باتیں کی ہیں۔انہیں جب پتہ چلا کہ آپؐ کو ان کی باتوں کا علم ہو گیا ہے تو وہ آپؐ کی خدمت میں آکر معذرتیں پیش کرنے لگے۔ مگر اپنی حرکتیں جاری رکھیں۔

الغرض آنحضرت ﷺ کو جب سازشوں کے اس اڈے کی قطعی تصدیق مِل گئی تو آپؐ کے حکم پر حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ چند صحابہؓ کے ساتھ گئے اور سویلم کے گھر کو جلا آئے۔ چنانچہ اس طرح وقتی طور پر سازشوں کا یہ اڈہ ختم ہو گیا۔(ابن ہشّام غزوۃ تبوک، تخذیل المنافقین للمسلمین ومانزل فیھم والسیرۃ الحلبیہ ذکر مغازیہ ﷺ غزوۃ تبوک) یعنی آپؐ نے ان کے جرائم پر انہیں قتل نہیں کیا اور نہ ہی کوئی بدنی سزا دی۔ صرف سازشوں کے اڈے کو ختم کروادیا۔

۳)مسجد ضرار اور اس کا انہدام:

آنحضرت ﷺ نے جب مکّے سے ہجرت فرمائی تو مدینے میں داخل ہونے سے پہلے قبا میں قیام فرمایا تھا۔ آپؐ نے اس قیام کے دوران وہاں ایک مسجد کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ یہ مسجد بنو عمرو بن عوف کی جگہ میں بنائی گئی تھی۔اس کی وجہ سے بنو عمرو کو فضیلت مل گئی۔ان کے شریکے

والے بنو غنم بن عوف مسلمان تو ہوئے تھے مگر اس مسجد کی وجہ سے بنو عمرو سے حسد کرنے لگے تھے۔ ان کی اس حالت سے منافقوں نے فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ اپنی سازشوں کی تیّاری اور خواہشات کی تکمیل کے لئے فتنہ پرداز حاسد ابو عامر راہب بھی قبا میں آ ٹھہرا تھا۔ اس نے بنو غنم کو انگیخت کیا کہ وہ بھی بنو عمرو کے مقابل پر مسجد تعمیر کریں جس کے ذریعے وہ اپنے مفادات حاصل کر سکیں گے۔ اس نے انہیں یہ بھی کہا کہ تم اس مسجد میں جس قدر ممکن ہو اسلحہ اور جنگی سامان جمع کرو۔ جب رومی فوج مدینے پر حملہ کرے گی تو وہ ان کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو مدینے سے نکال دے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ کام کروا کے وہ خود ہرقل کو مدینے کے خلاف ابھارنے کے لئے شام روانہ ہو گیا اور اس کی ہدایت پر پیچھے منافق اپنا کام کرتے رہے۔ ان کی کوششوں سے اُن کے گروہ کے بہت سے لوگ نیز بعض کمزور ایمان والے اس نئی مسجد میں آنے لگے اور یہاں آنحضرت ﷺ اور اسلام کے بارے میں عیب چینیوں اور غیبتوں کے ساتھ سازشیں تیّار ہونے لگیں۔ چنانچہ تکلیف پہنچانے، کفر پھیلانے، مومنوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور ایسے دشمن کو کمین گاہ مہیا کرنے کے لئے یہ نام نہاد مسجد ایک اڈہ بن گئی۔

اِدھر آنحضرت ﷺ مختلف خبروں کی تصدیق کے لئے، رومی فوج کی مزعومہ یا متوقع پیش قدمی کو روکنے کے لئے نیز اسلام کی فتوحات کے میدان وسیع کرنے کی غرض سے تبوک کے لئے روانگی کی تیاری میں مصروف تھے۔ اُدھر منافقوں نے اس نقصان رساں مسجد کو قانونی حیثیت دینے کے لئے آپؐ کی خدمت میں درخواست کی کہ انہوں نے قبا میں ان لوگوں کے لئے جو بیمار ہوں اور رات، بارش یا سردی کی وجہ سے یا کسی اور معذوری و مجبوری کے باعث مسجد قبا میں نہ جا سکتے ہوں، ایک مسجد بنائی ہے۔ آپؐ اس میں تشریف لا کر نماز ادا فرمائیں اور دعا کریں تو ان کے لئے برکت کا موجب ہو گا۔

آپؐ نے فرمایا: ”میں اس وقت سفر کی تیّاری میں ہوں اور شدید مصروف ہوں۔ اس لئے واپسی پر اس پر غور ہو گا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہاتو ہم اس میں آئیں گے اور تمہارے لئے نماز پڑھیں گے۔“ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس درخواست کی حقیقت کو اور نام نہاد مسجد کی حیثیت کو آنحضرت ﷺ پر حسبِ ذیل آیات کے ذریعہ آشکار فرمایا:

”وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّ تَفْرِيْقًاۢ بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ○ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ○ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ○ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ○ (التوبہ:107تا110) ترجمہ: اور وہ لوگ جنہوں نے تکلیف پہنچانے اور کفر پھیلانے اور مومنوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور ایسے شخص کو کمین گاہ مہیا کرنے کے لئے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے ہی سے لڑائی کر رہا ہے ایک مسجد بنائی۔ ضرور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم بھلائی کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے تھے جبکہ اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ تُو اس میں کبھی کھڑا نہ ہو۔ یقیناً وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہو زیادہ حقدار ہے کہ تُو اس میں (نماز کے لئے) قیام کرے۔ اس میں ایسے مرد ہیں جو خواہش رکھتے ہیں کہ وہ پاک ہو جائیں اور اللہ پاک بننے والوں سے محبت کرتا ہے۔ پس جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقویٰ اور (اس کی) رضا پر رکھی ہو کیا وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھوکھلے گر جانے والے کنارے پر رکھی ہو۔ پس وہ اسے جہنم کی آگ میں ساتھ لے گرے اور اللہ ظالم قوم کو

ہدایت نہیں دیتا۔ ان کی عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں شکوک پیدا کرتی رہے گی۔ سوائے اس کے کہ ان کے دل (اللہ کی خشیت سے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور اللہ دائمی علم رکھنے والا (اور) بہت حکمت والا ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ اپنے سفر کو جاری رکھتے ہوئے جب مدینے سے کچھ فاصلے پر ایک مقام ذی اَوان پہنچے تو آپؐ نے مالک بن الدّخشم، مَعْن بن عدی، عامر بن السکن اور وحشی رضی اللہ عنہم اور ایک اور شخص کو بھیجا اور فرمایا: ''اس مسجد کے بنانے والے بڑے ظالم ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اس کو جلا کر راکھ کر دو۔'' وہ پانچوں اس حکم کی تعمیل میں نکلے اور انہوں نے مغرب اور عشاء کے درمیانی وقت میں اسے جلا کر زمین بوس کر دیا۔ یہ اڈہ جو مسجد کے نام پر دشمنوں کی کمین گاہ بنایا گیا تھا، مستقل طور پر کالعدم ہو گیا۔ یہ نام نہاد مسجد چونکہ مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کے لئے بنائی گئی تھی اس لئے اسلامی کتب میں یہ مسجد ضرار کے نام سے مشہور ہو گئی۔ (ابن ہشّام امر مسجد الضرار.....، تاریخ الخمیس، ھدم مسجد الضرار والسیرۃ الحلبیہ، غزوۂ تبوک)

یہاں بھی رسول اللہ ﷺ کی رحمت و بخشش کی ادا ملاحظہ فرمائیں کہ تخریب کاری اور فساد کے اڈے کو ختم کرا دیا مگر ان لوگوں میں سے کسی کو قتل نہیں کرایا۔ حالانکہ ان کے اقدام انتہائی مفسدانہ اور اسلام کے لئے خطرناک تھے۔ وہ آپؐ کو ہر طرح کا نقصان پہنچانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔ اُن کے اِن جرموں کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آ چکی تھی۔ وہ لوگ آپؐ کو نقصان پہنچانے اور آپؐ کے خلاف سازشیں تیار کرتے ہوئے کوئی عزت و احترام سے آپؐ کا ذکر تو نہیں کرتے تھے۔ یقیناً وہ آپؐ کے نام اور آپؐ کے ذکر کے ساتھ توہین و تنقیص خیز کلمات استعمال کرتے تھے۔ آپؐ کی قائم کردہ مسجد کے مقابل پر بلکہ مخالفت میں مسجد کی تعمیر ہی

آپؐ کہ توہین کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ اس سب کچھ کے باوجود آپؐ نے نہ انہیں کوئی سزا دی اور نہ ہی ان میں سے کسی کے قتل کا ارشاد فرمایا۔

۴) منافقوں کی سرگرمیاں:

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ فتح مکّہ کے بعد منافقینِ مدینہ کے دل شعلۂ حسد سے کباب ہو رہے تھے۔ وہ کسی نہ کسی طریق سے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیروں میں انتہائی تڑپ کے ساتھ سرگرمِ عمل تھے۔ ان لوگوں کو علم تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ سلطنتِ روما کی خوب ٹھنی ہوئی ہے اور جنگِ موٴتہ میں ایک بار ان کا مقابلہ بھی ہو چکا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ اگر قیصر کی فوج تیّار ہو کر آئے اور مدینے پر چڑھائی کر دے تو مسلمان لازماً پاش پاش ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے یہ خوفناک سازش تیار کی کہ ابو عامر راہب شام جا کر قیصر کو اور عرب عیسائی قبائل کو مدینے پر حملے کے لئے انگیخت کرے گا اور باقی منافق مدینے میں قیصرِ روم کے حملے کی افواہیں پھیلا کر مسلمانوں میں خوف و ہراس پیدا کریں اور ان کے حوصلے توڑیں۔

ان کی منصوبہ بندی کا دوسرا رُخ یہ تھا کہ اگر رومی فوج مدینہ پر حملہ نہ بھی کرے تو وہ خوف و ہراس پھیلانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو کم از کم اس قدر انگیخت ضرور کر دیں کہ وہ از خود جا کر رومی سلطنت پر حملہ آور ہو جائیں۔ چونکہ رومی فوج اس مرتبہ تیّار ہو گی لہٰذا وہ مسلمانوں کو شکستِ فاش دے گی اور مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ حتّٰی کہ نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ بھی شہید ہو جائیں گے۔ آخر کار اسلام ختم ہو جائے گا اور نہ صرف یہ کہ ان سازشیوں کے سینوں کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی بلکہ وہ مدینے کے مطلق العنان خود مختار حکمران بن جائیں گے۔

اس منصوبہ بندی کے تحت ابو عامر راہب ہرقل شاہِ روم کے پاس شام روانہ ہو گیا تاکہ اسے اسلام کے خلاف عسکری کارروائی پر انگیخت کرے۔ وہ ابھی شام ہی میں تھا کہ اسے موت نے آلیا اور راہئ ملکِ عدم ہو گیا۔ (تاریخ الخمیس واقعات 10ھ، موت ابو عامر راہب) اِدھر مدینے میں منافق نت نئی افواہوں کے ذریعے شرّ پھیلانے میں مستعد تھے۔ وہ روز اس طرح کی کوئی نہ کوئی افواہ پھیلا دیتے کہ فلاں قافلہ آیا تھا جس نے یہ خبر دی کہ قیصر مدینے پر حملے کی تیّاری کر رہا ہے۔ فلاں قافلے والے یہ بتاتے تھے کہ رومی فوج مدینے پر حملہ کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی افواہیں اس کثرت اور تیزی سے پھیلنی شروع ہوئیں کہ مدینے کی فضا میں خوف کے سائے منڈلانے لگے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اس صورتحال کو ختم کرنے کا فیصلہ فرمایا کہ اگر ایسی خبروں میں کوئی حقیقت ہوئی بھی تو قبل اس کے کہ رومی فوج اسلامی سلطنت میں داخل ہو، آپؐ خود جا کر شام کی سرحدوں پر رومی فوج کی نقل و حرکت معلوم کریں گے۔ اگر اس سے مقابلہ نہ بھی ہوا تو اس سفر کے اسلام کے حق میں لازماً دیگر بابرکت نتائج ظاہر ہوں گے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ اس سفر پر روانہ ہوئے اور کئی سو میل کی طویل مسافت طے کر کے شام کے سرحدی علاقے میں تبوک کے مقام پر قیام پذیر ہو گئے۔ یہاں ایک لمبے انتظار کے باوجود رومی افواج سے کوئی مڈ بھیڑ تو نہ ہوئی مگر معاہدوں اور چھوٹی چھوٹی مہمات کے ذریعے ارد گرد کے کئی علاقے آپؐ کے زیرِ نگین ہو گئے۔ الغرض منافقینِ مدینہ کی اس بہت بڑی سازش پر بھی آپؐ نے ان میں سے کسی پر کوئی تعزیری کارروائی نہیں فرمائی۔

۵) منافقوں کی ایک خوفناک سازش:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ اس بار منافقوں کو قطعی یقین تھا کہ مسلمان اگر تبوک جائیں گے تو وہ اس لڑائی میں لازماً شکست کھائیں گے اور آنحضرت ﷺ (نعوذ باللہ) شہید ہو

جائیں گے۔ اس کے بعد مدینے میں منافقوں کی حکومت ہو گی اور وہ اپنی من مانیاں کریں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان کی خواہشوں کے علَی الرّغم آپؐ فتوحات کے نئے دروازے کھولنے کے بعد اور عظیم کامیابیوں کی خبروں کے ساتھ ایک عظیم فاتح بن کر واپس مدینے پہنچ رہے تھے۔ اس شان کے ساتھ مدینے میں آپؐ کے ورودِ مسعود کا منظر بھی منافقوں کے دلوں کو چھلنی اور سینوں کو چاک کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ان پر یہ خوف بھی طاری تھا کہ آپؐ کے سامنے ان کی چالوں اور سازشوں کا چونکہ بھانڈا پھوٹ چکا ہے، اس لئے اب آپؐ ان پر ضرور کوئی نہ کوئی تعزیری کارروائی فرمائیں گے۔ اس ناقابلِ برداشت کیفیت سے نکلنے کے لئے انہوں نے یہ بھیانک سازش تیّار کی ہوئی تھی کہ آپؐ کو راستے ہی میں شہید کر دیا جائے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے شروع میں ہی اپنے درجن بھر آدمی آپؐ کے ساتھ لشکر میں شامل کر دیئے تھے۔ چنانچہ مدینے سے کچھ فاصلے پر جہاں ایک ایسی گھاٹی سے گزرنا پڑتا تھا جو بہت تنگ تھی اور اس جگہ سے سوار ایک ایک کر کے گزر سکتے تھے۔ آپؐ جب اس کے پاس پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ اس اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر یہ لوگ تیزی سے آگے بڑھ کر اس گھاٹی میں چھپ گئے تا کہ جب آپؐ ان کے نشانے پر ہوں تو وہ اپنا کام کر جائیں۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے خبر دی کہ اس راستے پر دشمن چھپا ہوا ہے۔ آپؐ نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کو خبر لینے کے لئے بھیجا۔ حضرت حذیفہؓ سواری تیز کر کے وہاں پہنچے تو انہوں نے چند نقاب پوش آدمی چھپے ہوئے دیکھے جو اِن کے آنے کی وجہ سے بھاگ گئے اور آپؐ انہیں پہچان نہ سکے۔ آنحضرت ﷺ کے عفو و در گزر کی یہ بھی ایک لاثانی مثال ہے کہ آپؐ نے ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا اور ان کا تعاقب کر کے انہیں گرفتار نہیں کروایا۔

اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر کہ وہ کون کون تھے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت حذیفہؓ کو بھی ان کے ناموں سے آگاہ فرما دیا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت حذیفہؓ کو "صَاحِبُ سِرِّ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فِي الْمُنَافِقِيْنَ" یعنی "منافقوں کے بارہ میں رسول اللہ ﷺ کا رازدان" کہا جاتا تھا۔

(ابن کثیر غزوۂ تبوک و اسد الغابہ ذکر حضرت حذیفہ بن الیمانؓ)

ارادۂ قتل رکھنے والے ان منافقوں کو بھی آپؐ نے معاف فرما دیا اور مدینے جا کر بھی باوجود اس کے کہ آپؐ کو ان کا معیّن طور پر علم تھا، ان پر کسی قسم کی تعزیزی کارروائی نہیں فرمائی۔

٦) ابو عامر راہب:

ابھی غزوۂ تبوک اور مسجد ضرار کے سلسلے میں ابو عامر راہب کا ذکر گزرا ہے۔ یہ قبیلہ خزرج کا ایک فرد تھا جو در حقیقت عیسائی تھا نہ یہودی۔ لیکن یہود و نصاریٰ کے ساتھ گہرے تعلقات رکھتا تھا اور ان کے وظائف وغیرہ کا بھی ماہر تھا۔ اسی وجہ سے یہ ابو عامر راہب کے نام سے مشہور تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ مکّے سے ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو یہ شخص اپنے حسد کی بنا پر آپؐ کو برداشت نہ کر سکا۔ لہٰذا مکّے جا آباد ہوا اور قریشِ مکّہ کو آپؐ کے خلاف ابھارتا رہا اور اسلام کے خلاف ان کے ساتھ جنگوں میں بھی شامل ہوتا رہا۔ فتح مکّہ کے بعد جب اس کا وہاں رہنا بھی مشکل ہوا تو اپنے مقاصد پورے کرنے کے لئے اس نے یہ ترکیب کی کہ اپنا نام اور حلیہ و ہیئت بدل کر مدینے کے قریب قبا میں سکونت اختیار کر لی۔ کئی سال مدینے کے لوگوں سے دور رہنے نیز حلیہ تبدیل کر لینے کی وجہ سے لوگ اسے پہچان نہ سکے کہ در حقیقت وہ کون ہے۔ اس نے قبا میں آ کر مدینے کے منافقوں سے تعلقات پیدا کئے۔ منافقوں کے گروہ میں سے بھی اسے صرف وہی چند لوگ جانتے تھے جن کے ساتھ مل کر وہ اپنے مذموم مقاصد پورے کرنا

چاہتا تھا۔ وہ اسلام کو مٹانے کے لئے ایک سازش کے تحت شام روانہ ہوا تھا اور وہ وہیں مر گیا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی کسی سازش میں کامیاب ہو سکتا۔ مگر یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ان تمام گستاخانہ اور مذموم کارروائیوں پر کبھی اس کے قتل کے لئے اس کے پیچھے آدمی نہیں بھیجے۔

یہاں ایک تلخ حقیقت کے اظہار اور انتہائی افسوس کے طور پر عرض ہے کہ ایسے نام نہاد 'محقق' جو توہینِ رسولؐ کی سزا قتل ثابت کرنے کے لئے ہر جعلی اور من گھڑت روایتیں پیش کرتے ہیں، ان کے مَبْلغِ علم اور حسنِ تحقیق کا کرشمہ یہ ہے کہ ابوعامر جیسے دشمنِ رسولؐ اور دشمنِ اسلام شخص کو بھی "عمدہ کردار کے مالک" اور "بھلا مانس" قرار دے دیتے ہیں۔ چنانچہ توہینِ رسالت کے موضوع پر بڑی گہری تحقیق کے دعویدار سپریم کورٹ کے ایک سینئیر ایڈووکیٹ ابو عامر کے بیٹے حنظلہؓ (جو اسلام کی آغوش میں آچکے تھے) کا حوالہ دے کر تحریر کرتے ہیں:

"بچوں کا اچھا کردار والدین کی اچھی تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے اور خاص کر آزادیٔ رائے وہی پیدا کر سکتے ہیں جو خود عمدہ کردار کے مالک ہوں۔ سو گمان کرنا پڑتا ہے کہ خود ابو عامر بھی بھلا مانس ہی رہا ہو گا۔" (ناموسِ رسول اور قانون توہینِ رسالت، چوتھا ایڈیشن 2010ء صفحہ 214) انّا للہ و انّا الیہ راجعون

جن لوگوں کی عقل و دانش کے پیمانے کشت و خون کے سبب اس طرح الٹ پلٹ چکے ہوں، ان سے رسول اللہ ﷺ کے ناموس کی حفاظت کی کس طرح امید کی جا سکتی ہے۔ یہ "اپنے ہی دوست" ہیں جو کمین گاہوں میں چھپ کر رحمۃٌ للعالمین ﷺ کی توہین میں بجھے ہوئے تیر چلا چلا کر آپؐ کو دنیا بھر میں رسوا کرتے ہیں۔ چنانچہ میزان الحق، شیطانی آیات، رنگیلا رسول اور رسالہ ورتمان وغیرہ نے کیا کام کیا ہو گا جو اِن " اپنے ہی دوستوں" نے کر دکھایا

ہے۔ کروڑہا لوگوں کی گمراہی کے ذمے دار شاتمینِ رسولؐ نہیں، خود یہ "اپنے ہی دوست" لوگ ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف   اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

*****

انسان اور انسانی خون کے تحفّظ کے بعض احکام

*****

انسان، انسانیت اور انسانی خون کے تحفّظ کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زندگی کی ابتداء سے انتہاء تک اسی کوشش میں رہے کہ انسانیت کا شرف بھی قائم ہو اور انسان اور اس کا خون بھی ہر طرح سے محفوظ ہو۔ چنانچہ آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقعے پر یعنی اپنی زندگی کے آخری ایّام میں بھی امّت کو جو تاکیدی حکم ارشاد فرمائے، ان میں خون خرابے سے بچنے کی بھی بھرپور اور پُرزور وصیّت تھی۔ آپؐ نے فرمایا:

"أَيُّهَا النَّاسُ! اِسْمَعُوْا قَوْلِي، فَإِنِّي لَا أَدْرِيْ لَعَلِّي لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هٰذَا بِهٰذَا الْمَوْقَفِ أَبَداً، أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ دِمَاءَكُمْ وَ أَمْوَالَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ إِلٰى أَنْ تَلْقَوْا رَبَّكُمْ، كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا، وَكَحُرْمَةِ شَهْرِكُمْ هٰذَا، وَإِنَّكُمْ سَتَلْقَوْنَ رَبَّكُمْ، فَيَسْأَلُكُمْ عَنْ أَعْمَالِكُمْ وَقَدْ بَلَّغْتُ۔" (ابن ہشّام۔ باب حجۃ الوداع) ترجمہ: اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو۔ کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اگلے سال میں اس جگہ تمہارے درمیان ہوں گا۔ اے لوگو! تمہارے لئے ایک دوسرے کے خونوں اور اموال کی حفاظت کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح تم اس دن اور اس مہینے کی حرمت کرتے ہو۔ حتّٰی کہ تم اپنے ربّ سے جا ملو۔ وہ تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں جو پہلے ہی اس کے پاس پہنچ چکے ہیں، ضرور پوچھے گا۔

حجۃ الوداع کے ایک خطبے میں آپؐ نے یہ بھی فرمایا: " اے لوگو! جس طرح تمہارا یہ حج کا دن، یہ حج کا مہینہ اور یہ شہر یعنی مکہ مقدّس اور محترم ہیں اسی طرح تمہاری جانیں، تمہارے

مال اور تمہاری آبرو بھی مقدس و محترم ہیں (اور ان کو ہر قسم کا قانونی تحفظ حاصل ہے)"۔ (بخاری کتاب المناسک باب خطبۃ ایام منیٰ) آپؐ نے پھر یہ بھی تاکید فرمائی:

"لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِی کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ"(بخاری کتاب المغازی باب حجۃ الوداع) کہ میرے بعد بھٹک نہ جانا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگ جاؤ۔

ایک طرف یہ اسوۂ رسول ﷺ ہے اور یہ پاک تعلیمات ہیں جو انسانی خون کی حفاظت کی تا قیامت ضمانت مہیّا کرتی ہیں اور دوسری طرف آج کے وہ نام نہاد فقہاء اور علماء ہیں جو اس پاک اسوے کے منافی اور ان تعلیمات کے مخالف کشت و خون کی ایسی تلقین کرتے ہیں کہ درندے بھی ان سے پناہ مانگیں۔ جب ایک طرف رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس اس سبق آموز یا عبرت انگیز حقیقت سے نقاب کشائی فرماتے ہیں:

"اِرْفَعُوْا اَیْدِیَکُمْ عَنِ الْقَتْلِ ،فَقَدْ کَثُرَ الْقَتْلُ اِنْ نَفَعَ۔" (ابنِ ہشّام و السیرۃ الحلبیہ غزوۂ فتح مکّہ) کہ قتل سے اپنے ہاتھ روکو۔ قتل تو بہت ہو چکا اور قتل و غارت نے دنیا کو کبھی بھی فائدہ نہیں دیا۔

ذرا نظرِ انصاف کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں کہ قتل و خون سے ہاتھ اٹھانے کی تعلیم دینے والا رحمتِ مجسّم پاک وجود جو اپنی تمام تر زندگی دوسروں کے سکھ اور آرام کے لئے جیا، جس نے قدم قدم انسان کو ہلاکتوں سے بچانے کی سعی کی، جس نے انسان کو دکھوں اور تکلیفوں سے بچانے کے لئے سب کچھ تج دیا، تو ایسی تعلیم یا کارروائی جو قتل و خون کے راستے کشادہ کرتی ہو یا غارت گری پر مبنی ہو، بخدا اس رحمتِ کامل ﷺ کی طرف کسی طرح بھی منسوب نہیں ہو سکتی۔ واللہ !کوئی ایسا قول و عمل آپؐ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا ہے جو انسانیت، انسان، یا انسانی خون کے

ضیاع کے دروازے کھولتا ہو۔ یہ آپؐ کی پاک سیرت اور حسین عمل کے سراسر خلاف ہے اور کلّیۃً خلاف ہے۔ مگر افسوس اور صد ہزار افسوس کہ آج توہینِ رسولؐ کی سزا قتل کے علمبر دار ایسے خود ساختہ ظالمانہ نعرے کی آڑ میں آپؐ کی اس واضح ہدایت اور پاک تعلیم کو اپنے خون آلود اور ناپاک قدموں تلے روندتے چلے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے تفصیلی کوائف اور حقائق پیش کر کے ثابت کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی مقدّس زندگی کا ایک ایک لمحہ اور پاک سیرت کا ایک ایک لفظ گواہ ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی کسی نے آپؐ کو کسی طور پر بھی دکھ پہنچایا، آپؐ نے ہر ایسے موقعے پر مارنے، جھگڑنے، قتل کرنے اور خون بہانے کی بجائے اپنے خُلقِ عظیم کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے معاف بھی کیا، نوازا بھی اور دعا بھی دی۔

لیا ظلم کا عفو سے انتقام عَلَيْكَ الصَّلٰوةُ عَلَيْكَ السَّلَامُ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

*****

یٰا رَبِّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ دَائِمًا

فِی ھٰذِہِ الدُّنْیَا وَ بَعْثٍ ثَانٍ

باب ششم

توہینِ رسالت کی روک تھام کی ممکنہ تدابیر

*****

اللہ تعالیٰ کے مرسلین علیہم السلام سے استہزاء انسانوں کا وہ سلوک ہے جس پر اللہ تعالیٰ خود بھی اپنے پاک کلام میں یَا حَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ (سورۃ یٰسٓ: 31) کے الفاظ سے افسوس کا اظہار فرماتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہر دور میں ہوا ہے کہ سوائے ایمان لانے والے کے، انسان نے ہر نبی کے انکار کے ساتھ استہزاء کیا ہے اور اس کی توہین و تنقیص کی ہے۔ انسانوں کی اس رَوِش کا بالآخر واقعاتی نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بڑے نبی، مقدّس بانیٔ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر استہزاء بھی بڑے پیمانے اور عالمگیر سطح پر ہوا۔ انسانوں کے اس سلوک کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک منظر یہ بھی پیش فرما دیا تھا کہ " وَمَا یُقَالُ لَکَ اِلَّا مَا قَدۡ قِیۡلَ لِلرُّسُلِ مِنۡ قَبۡلِکَ" (سورۃ حٰمٓ السجدہ: 44) کہ تجھے کچھ نہیں کہا جاتا مگر وہی جو تجھ سے پہلے رسولوں سے کہا گیا ہے۔ چنانچہ دیگر مذاہب کے پیروکار جو آپؐ کے مخالف ہیں اسلام پر اور آپؐ پر ہر طرح کے گندے حملے کرتے ہیں۔ وہ ہر لمحے آپؐ کے خلاف انتہائی غلیظ اور اذیتناک بہتان طرازی اور دشنام دہی کرتے ہیں۔ مگر قرآن کریم ہمیں یہ حوصلہ فراہم کرتا ہے کہ مخالفین و منکرینِ انبیاءؑ کی یہ سنّت بدل نہیں سکتی تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انہیں قتل کیا جائے بلکہ وہ یہ بتاتا ہے کہ "لِیَہۡلِکَ مَنۡ ہَلَکَ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ وَّیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ" (الانفال: 43) کہ ہلاک شدہ وہی ہوتا ہے جو دلیل سے ہلاک ہو اور زندہ وہی رہتا ہے جو دلیل سے زندہ ہو۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ توہین رسالت کا علاج صرف یہ ہے کہ دلیل، تعلیم، نمونہ اور تبلیغ سے دنیا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

غلامی میں لا کر اللہ تعالیٰ سے منسلک کیا جائے اور رسول اللہ ﷺ کے عفو ورحم کو دنیا پر وسیع کیا جائے۔ آپ کے حسن و احسان کے واقعاتی منظر پیش کئے جائیں۔ آپؐ کی پاک تعلیم کی تبلیغ کا دائرہ اتنا پھیلا دیا جائے کہ تمام قوموں پر محیط ہو جائے۔

ذیل میں چند امور بطور لائحہ عمل پیش ہیں جو بنیادی طور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اور آپؑ کے مقدّس خلفاء کی تحریروں سے مأخوذ ہیں۔

ہمارے فریضے

الغرض جہاں یہ استہزاء مقدّر تھا وہاں اس کے مداوے کے سامان بھی خود اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں انبیاء علیہم السلام کے ناموس کی حفاظت کے لئے عموماً اور محبوب کبریاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ناموس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بنیادی زاویئے یہ ہیں۔

۱) ہر مذہب والے اپنی دعوت و تبلیغ میں آزاد ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دیگر بانیان مذاہب پر زبان درازی کریں اوران کی برائیاں تراشیں اور ان کی تشہیر کریں۔ بلکہ انہیں چاہئے کہ وہ اپنے مذہب کی سچائی کے ثبوت کے لئے صرف اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کریں۔ کیونکہ دوسرے کے مذہب کو بُرا ثابت کرنے سے اپنے مذہب کی سچائی ثابت نہیں ہوتی۔

۲) رسول اللہ ﷺ کے خلاف بدزبانیوں کے علمی دلائل کے ساتھ مدلّل تحریراًو تقریراً جواب دیئے جائیں۔

۳) قوی دلائل کے ساتھ یہ حقیقت بپایہ ثبوت پہنچائی جائے کہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام مرسَل پاک اور برگزیدہ تھے مگر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شان سب سے سوا تھی۔ آپؐ صفاتِ باری تعالیٰ کے مظہرِ اتمّ بھی تھے، مستجمع جمیع صفاتِ انبیاءؑ بھی اورآپؐ تمام انبیاء علیہم السلام کے ناموس کے محافظ بھی تھے۔

اپنے آقا و مولیٰ رسول پاک صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پاک اور حسین سیرت، آپؐ کے اوصافِ حمیدہ، آپؐ کے بلند ترین مقام اور بے نظیر قوّتِ قدسیہ کو حقیقت افروز جامع پیرایہ میں پیش کیا جائے اور ثابت کیا جائے کہ تا قیامت زندہ اور زندگی بخش رسول صرف اور صرف سیّد الانبیاء محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہیں۔

۴) اس حقیقت سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ سوائے کچھ استثناء کے خواہ علماء ہیں یا عوام الناس، ان کی اخلاقی حالتیں پستی کے پاتال کو پہنچی ہوئی ہیں۔ ہم رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے تو دل وجان سے عشق کرتے ہیں اور فدا ہو کر آپؐ کو تو مانتے ہیں مگر آپؐ کی نہیں مانتے۔ اس کے لئے معاشرے کے نیک دل اور پاک عمل لوگ آگے آئیں اور عملاً مسلمانوں کی دینی، اخلاقی اور روحانی قوّتیں بیدار کریں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پر امن اور پُر محبت پیغام کا منکروں اور بدزبانوں تک نہ پہنچنا مسلمانوں کا اپنا قصور ہے، ان کی تبلیغی سستی کا نتیجہ ہے۔ قانون تو ظاہری فتنے کا علاج کرتا ہے، دل کا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ہمارے لئے اس وقت تک تسلّی نہیں ہونی چاہئے جب تک کہ تمام دنیا کے دلوں سے محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا بغض نکل کر اس کی جگہ آپ کی محبت نہ قائم ہو جائے۔

یہ ایک ازلی سچ یہ ہے کہ ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ساری دنیا کے انسان کو حقیقی زندگی عطا کرنے کے لئے آئے تھے، مارنے کے لئے نہیں۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی

سنّت یہ تھی کہ آپؐ نے اپنے جانی دشمنوں کی جانوں کی بھی حفاظت فرمائی اور انہیں زندگی کی حقیقی قدریں بھی عطا فرمائیں۔ یہ آپؐ کی عزّت وعظمت کی روشن دلیل ہے۔ آپؐ انسان کو زندگی بخشنے کے لئے آئے تھے، ان کی جان نکالنے کے لئے نہیں۔ پس محمد رسول اللہ ﷺ کی عزّت دنیا کو زندگی دینے میں ہے نہ کہ اس کی موت کی خواہش کرنے میں۔

اس تناظر میں توہینِ رسول ﷺ کے حقیقی انتقام کے لئے مسلمانوں کو ایک عزم باندھنے اور ایک عہد کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ بہادر وہ نہیں جو غصے سے مغلوب ہو کر لڑ پڑتا ہے وہ بزدل ہے کیونکہ وہ اپنے نفس سے دب جاتا ہے۔ بہادر وہ ہے جو ایک مستقل ارادہ کر لیتا ہے اور جب تک اس کو پورا نہ کرلے اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ پس ضرورت ہے کہ ناموسِ رسولؐ کی حفاظت اور اسلام کی ترقی کے لئے اپنے دل میں کم از کم ان چار باتوں کا عہد کیا جائے۔

اوّل: ہم دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف رکھتے ہوئے دین کو بے پرواہی کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے اور قرآن وسنّت کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالیں گے۔

دوم: یہ کہ ہم خود تبلیغ اسلام میں پوری دلچسپی لیں گے اور اس کام کے لئے اپنی جان، اپنے مال اور وقت کی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔

سوم: ملک میں دیگر غیر مذاہب والوں سے اسوۂ رسول ﷺ کے مطابق یکجہتی اور اتحاد کا سلوک کریں گے۔ تاکہ وہ ہمارے محبت بھرے سلوک سے رسول اللہ ﷺ کے ممنون احسان ہوں کہ آپؐ کی تعلیم ہمیں ایسا نمونہ پیش کرنے کا سبق فراہم کرتی ہے۔

۵) جلسہائے سیرت النبی ﷺ کا قریہ قریہ، شہر شہر اور ملک ملک میں اجراء کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ رحمۃٌ للعالمین تھے۔ جیسے سورج تمام عالم پر برابر چمکتا ہے، اسی طرح رسول اللہ

ﷺ اس کا فیض تمام جہانوں پر اور تمام انسانوں پر برابر چمکتا ہے۔ لہٰذا آپؐ کی سیرت سے دوسروں کو آگاہ کرنے کی بہت ضرورت ہے۔

قرآن کریم محمد رسول اللہ ﷺ کے جس کردار کو پیش کرتا ہے اسے مسخ کرنے کے لئے مخالفینِ اسلام چاہے ہزار بہانے بنالیں، ہزار دلیلیں اکٹھی کرلیں، ہزار آیتوں اور حدیثوں کو غلط معنے پہنالیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات اور آپؐ کی سیرت ان معنوں کو ردّ کر دے گی اور دھتکار دے گی۔ پس محمد رسول اللہ ﷺ عالمین پر وسیع رحمت کو کوئی دھندلا ہی نہیں سکتا۔

ایک دفعہ مکرر عرض ہے کہ عملی طور پر ان امور پر بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے کہ

1: علماء اپنے اعمال و اقوال کو سنّتِ رسولؐ کے مطابق ڈھالیں اور عامّۃ الناس کے لئے نمونہ بنیں۔ غلیظ اور بازاری زبان استعمال کرنے کی بجائے رسول اللہ ﷺ کے نمونے پر نرم لہجہ اور پاک الفاظ استعمال کریں۔

2: علمائے اسلام بار بار اپنے خطبات اور خطابات میں آنحضرت ﷺ کے اُسوے کو اپنانے، آپؐ کی سیرت و اخلاق کے رنگ چڑھانے کی تلقین کریں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے رسول ﷺ کی سیرت و اخلاق کے رنگ چڑھانے کی ترغیب کریں۔

ملکی تدابیر

چونکہ یہ سب کچھ دین اور اسلام کی بنیاد پر اور رسول اللہ ﷺ کے نام پر ہو رہا ہے۔ اس لئے اس معاملہ کو رسول اللہ ﷺ کے اُسوے اور سنّت نیز آپؐ کے طرزِ حکومت کے مطابق سرانجام دینا چاہئے۔ چنانچہ آپؐ نے جب مدینے میں ریاست کا قیام فرمایا تو وہاں موجود یہود کے تین قبائل بنو نظیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع۔ مشرک قبائل اَوس اور خزرج نیز مہاجرین و

انصار کو اس معاشرہ اور ریاست میں امّتِ واحدہ قرار دیا۔ فرمایا: ''اِنَّھُمْ اُمَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ۔'' (سیرۃ ابن ہشام، زیر عنوان' الرسول یوادع الیھود'۔ جلد2، صفحہ 64) کہ یہ سب مسلمانوں کے ساتھ بطور اُمّتِ واحدہ شامل سمجھے جائیں گے۔

یہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا قائم کردہ روشن راستہ اور لائحۂ عمل ہے جس میں بلا تفریق مذہب و ملّت اور قوم و نسل ہر ایک شہری ملک کی ایک یکساں اکائی تھا۔ بحیثیتِ فردِ قوم کسی میں کوئی فرق نہ تھا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ راستہ اور عظیم اصول ''اُمَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ'' کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اس پر عمل حتمی طور پر قوم و ملک کو متحد و مضبوط بناتا ہے۔ فرقہ واریت اور جماعتوں اور قوموں کا استیصال ملک کی بنیادوں کو کھوکھلا اور عمارت کو کمزور کر دیتا ہے۔ دین و مذہب کی آزادی اور اظہارِ رائے اور آزادیٔ ضمیر پر قدغنیں ملک میں تفریقیں پیدا کرتی ہیں۔ اس میں پھر اسی طرح ظلم و تشدّد اور کشت و خون ہوتا ہے جیسا ہمارے ملک میں ہو رہا ہے۔ پس میثاقِ مدینہ کو ملک کا بنیادی قانون بنانا چاہیئے۔

* وکلاء اور سیاسی حلقوں میں اثر و رسوخ رکھنے والے مسلمانوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ بھی اربابِ حکومت کو باور کرائیں کہ جذبات و خیالات اور آزادیٔ رائے میں حدود مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔

* اگر کسی قوم یا ملک کا لیڈر شانِ رسولؐ میں گستاخی کرتا ہے تو اس کا جواب بھی علمی طور پر دلیل سے دیا جائے نہ کہ اپنے ہی ملک میں، اپنے ہی لوگوں کی املاک کی توڑ پھوڑ سے۔ گستاخی اور توہین کے ردّ کے لئے دلائل و براہین کی ضرورت ہے جو دلوں کو قائل اور انہیں سچائی کی جانب مائل کرتے ہیں۔ یہ واضح ظلم اور کھلی کھلی بے ہودگی ہے کہ مخالف تو اعتراض کریں اور غلامانِ رحمۃٌ للعالمینؐ اس کا جواب کشت و خون اور قتل و غارت گری سے دیں۔

* مذہب کے نام پر جبر و تشدّد اور 'سر تن سے جدا' قسم کے جذبات و عزائم کو روک کر اسوۂ محمدی کے مظاہر پیدا کرنے اور دنیا کو رسول اللہ ﷺ کے اس پاک اُسوے سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے اور بدلائل ثابت کرنا ضروری ہے اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور رسول اللہ ﷺ ایک زندہ اور زندگی بخش رسول ہیں (ﷺ)۔ آج انسان کی روحانی زندگی کا ضامن صرف اور صرف ایک ہی رسول ہے جس کا نام ہے محمد ﷺ۔ اس کا پیغام تلوار نہیں ہے بلکہ دلیل اور محبت ہے جو دلوں کو فتح کرتی ہے اور روحوں کو حصارِ محمدی میں محفوظ و مأمون کرتی ہے۔ توہینِ رسولؐ کے انتقام کے لئے ایسی تحریک کی ضرورت ہے۔

یہ کون سا اسلامی ردّ عمل ہے کہ اپنے ہی ملک کے لوگوں کو مار دیا جائے، اپنی ہی جائیدادوں کو آگ لگادی جائے اور اپنے ہی بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ بنادیا جائے۔ یعنی گناہ تو کوئی کرے اور سر ہم اپنا پھوڑ لیں۔ ایسی حرکتوں کا اسلام اور سنّتِ رسول اور انسانیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسلام تو غیر قوموں کی دشمنی میں بھی عدل اور انصاف کو ہاتھ سے چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ عقل، تحمّل اور صبر و عفو سے چلنے کا حکم دیتا ہے۔ بہر حال غیر ملکیوں کے کاروباروں کو یا سفارتخانوں کو نقصان پہچانے یا اپنے ہی لوگوں کو نقصان پہچانے کے جو عمل ہیں، سوائے اسلام کو بدنام کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔

* عوام میں یہ شعور اور پھر یقین پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ فتنہ و فساد اور نفرت و افتراق بھڑکانے والے ان غلط قسم کے علماء اور راہنماؤں کے پیچھے چلنے کی بجائے، ان کے پیچھے چل کر اپنی دنیا و آخرت کو خراب کرنے کی بجائے، عقل سے کام لیتے ہوئے اسوۂ رسول ﷺ اور آپؐ کی سنّت کو لازم پکڑیں۔ آپؐ کی سنّت کے خلاف احادیث کی من پسند ظالمانہ تشریحات اور خود تراشیدہ روایات کو ترک کر کے اسوۂ رسولؐ پر کاربند ہونا فرض ہے۔

* موجودہ مزاج کو بدلنے کے لئے اور قوم کو قانوناً بھی قتل و خون سے روکنے کے لئے حکومتِ وقت کو حسبِ ذیل قسم کے اقدام کرنے کی ضرورت ہے۔

۱: جو قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر از خود کسی کو توہین رسالت کا الزام دے کر قتل کرے اسے مقررہ سزا دی جائے۔

۲: جو کسی پر توہین کا جھوٹا الزام لگائے اسے مقررہ سزا دی جائے۔

۳: جو جھوٹی روایات کی بنیاد پر تعلیم دے اس ادارے اور استاد پر پابندیاں لگائی جائیں۔

۴: مدرسوں سے مرنے مارنے والی تعلیمات اور نصاب کو ختم کیا جائے۔

۵: جو خطیب مسجدوں یا جلسوں میں قتل و غارت والی زہر افشاں تقاریر کریں اور عوام الناس کو بھڑکائیں ان پر سزائیں اور قدغنیں لگائی جائیں۔

۶: توہینِ رسالت کے ملکی قوانین میں مناسب ترامیم کی جائیں۔

اسی طرح ہر اس قدم کو روکنا ہو گا جو گستاخی و توہین رسولؐ کے نعرے کی آڑ میں فتنہ و فساد کی طرف اٹھ رہا ہو۔

عالمی تدابیر

۱: ہر ملک میں قانون کے محافظوں کو بیدار کیا جائے کہ وہ تمام بانیان و پیشوایانِ مذاہب کے ناموس کی حفاظت کے لئے موئثر اقدام کریں۔ وہ ایسے قانون بنائیں کہ جن کے تحت ایسے لوگوں کو قابلِ تعزیز ٹھہرایا جاسکے جو دوسرے مذہب کے بانی یا پیشوا کی توہین کر کے ایک طرف ان کے پیروکاروں کے دل مجروح کرتے ہیں تو دوسری طرف ملک میں امنِ عامہ کو خطرے میں

ڈالتے ہیں۔ ملک میں فساد بھڑکانے کے لئے یہ ایک بنیادی وجہ ہے۔ جسے دور کرنا حکومتِ وقت کا کام ہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ یہ تعزیز توہینِ رسالت کی نہیں بلکہ فساد فی الارض اور امنِ عامہ برباد کرنے کی ہوگی۔

الغرض اربابِ اقتدار کو بار بار اس طرف توجہ دلائی جائے کہ امن عامہ کے قیام اور ملک میں بسنے والی مختلف قوموں کے درمیان باہمی بھائی چارے کی فضا کے قیام کے لئے یہ از حد ضروری ہے کہ بانیانِ مذاہب کے تقدّس کو قائم کیا جائے اور ان کے خلاف کسی کو بدزبانی کی اجازت نہ دی جائے۔ ہر مسلمان اپنے اپنے ملک میں اربابِ حکومت کو بھی اس بیہودہ گوئی سے باز رہنے اور روکنے کی طرف توجہ دلائے، اور آنحضرت ﷺ کی سیرت کے خوبصورت پہلوؤں سے آگاہ کرے۔

۲:　اسی نہج پر مسلمان ممالک اقوامِ متحدہ میں اس مسئلہ کو پیش کر کے اس کا حل نکالیں۔ بانیانِ مذاہب کے خلاف دلآزار اور گندی زبان استعمال کرنے کی روک تھام کا قانون بنوائیں۔

۳:　دنیا کے ایک بڑے خطے پر مسلمان حکومتیں قائم ہیں۔ مسلمان ممالک یو این او (UNO) کا حصہ بھی ہیں، وہ قرآن کریم کی خوبصورت تعلیم کو دنیا پر ظاہر کرنے کی کوشش کریں، یہ واضح کریں کہ دنیا میں رائج دیگر جرائم کی نسبت کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اور انبیاءؑ کی بے حرمتی کرنا زیادہ بڑا جرم ہے۔ دنیا کے امن کے لئے بھی ضروری ہے کہ اس کو بھی یو این او کے امن چارٹر کا حصہ بنایا جائے۔ جس کے ذریعے یہ امر یقینی بنایا جائے کہ کوئی ممبر ملک اپنے کسی شہری کو اجازت نہیں دے گا کہ دوسروں کے مذہبی جذبات سے کھیلے۔

۴:　تمام ممالک کے مسلمان فیصلہ کریں کہ اپنے ملک میں حتّی الامکان ووٹ ان سیاستدانوں کو دیں گے جو مذہبی رواداری کا اظہار کریں۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ ان دنیاوی

حکومتوں میں بھی ایک طبقہ کھل کر اسلام اور رسول اللہ ﷺ پر اس بیہودہ گوئی کے خلاف اظہارِ خیال کرنے والا نکل آئے گا۔

۵: واضح ثبوتوں کے ساتھ دنیا کی حکومتوں نیز UNO کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ

i: اِسلام وہ پاک اور صلح کار مذہب ہے جس نے کسی قوم کے پیشوا پر حملہ نہیں کیا۔

ii: قرآن وہ قابل تعظیم کتاب ہے جس نے قوموں میں صلح کی بنیاد ڈالی اور ہر ایک قوم کے نبی کو مانا اور انہیں اپنا نبی قرار دیا۔

iii: تمام دُنیا میں یہ فخر خاص صرف قرآن شریف کو حاصل ہے۔ جس نے دُنیا کی نسبت ہمیں یہ تعلیم دی کہ لاَ نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ۔(البقرہ:137 و الِ عمران:85) یعنی تم اے مسلمانو! یہ کہو کہ ہم دُنیا کے تمام نبیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ اور ان میں تفریق نہیں کرتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو ردّ کر دیں۔ ایسی صلح کار کوئی اور الہامی کتاب دنیا میں نہیں ہے۔ قرآن شریف نے خدا تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کو کسی خاندان کے ساتھ مخصوص نہیں کیا۔ اسرائیلی خاندان کے جتنے نبی تھے کیا یعقوب، کیا اسحٰقؑ، کیا موسیٰؑ، کیا داوٗدؑ اور کیا عیسیٰ علیہم السلام سب کی نبوّت کو مان لیا۔ اسی طرح ہر ایک قوم کے نبی جو خواہ وہ ہندوستان میں گزرے ہیں، فارس میں یا دنیا کے کسی اور خطّے میں گزرے ہوں، کسی کی تکذیب نہیں کی بلکہ ہر ایک کو ایمان کا لازمی جزو بنایا۔ اس طرح تمام قوموں کے لئے صلح کی بنیاد ڈالی۔ مگر افسوس کہ اس صلح جُو اور صلح پسند نبی کو گالیاں دی جاتی ہیں اور توہین و تنقیص کی جاتی ہے۔

الغرض ایک مضبوط، محکم، مسلسل اور مخلصانہ جدّوجہد اور جہاد کی ضرورت ہے کہ ایسے مثبت، سچّے اور حقیقی اقدام اس حدّ تک کئے جائیں کہ رسول اللہ ﷺ پر اٹھنے والا ہر تیر

واپس اپنی کمان میں لوٹ جائے اور یہانتک کہ دنیا کی اکثریت آپؐ کی غلامی میں آکر آپؐ پر درود بھیجنے والی بن جائے۔ قرآن کریم کی پیشگوئیوں کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی تقدیر ہے جو لازماً قائم ہونے والی ہے۔ انشاء اللہ

*****

حرفِ آخر

توہینِ رسالت کی حفاظت کا الٰہی نظام

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (الاحزاب: 57) کہ یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم بھی اس پر درود اور خوب خوب سلام بھیجو۔

قارئینِ کرام! وہ کیسا عالی مرتبت، عظیم الشّان، بے نظیر، ارفع و اعلیٰ اور وہم و گمان سے برتر وجود ہے جس پر اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ مومنوں کو بھی درود و سلام بھیجنے کی تلقین کرتا ہے کہ وہ بھی اس پر درود و سلام بھیجیں۔ کائنات میں ہر جگہ موجود اللہ تعالیٰ کے درود و سلام اور کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے فرشتوں کے درود و سلام کے ساتھ اس کرّۂ ارض کے طول و عرض میں مقیم مومنوں کے درود و سلام کے ہوتے ہوئے چند گندے اور بدزبان لوگوں کی توہین معنے ہی کیا رکھتی ہے؟ اس کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اس پاک نبیؐ کے پاک وجود اور پاک ذات اور پاک ذکر کو جس طرح درود و سلام نے ہر جانب سے اور ہر وقت اپنے ہالے میں، اپنے گھیرے میں اور کروڑ در کروڑ غلافوں میں لپیٹا ہوا ہے وہاں کسی کی توہین داخل کیسے ہو سکتی ہے؟ کائنات کی وسعتوں پر پھیلا ہوا درود و سلام کس طرح کسی سبّ و شتم اور توہین و تنقیص اُس پار جانے دے سکتا ہے؟ عقل اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

درود و سلام کی اس تجلّی یا تقدیر کا ایک منظر وہ بھی ہے جو آج سے اڑہائی رتین ہزار سال پہلے اسرائیلی نبی حضرت حَبَقُّوق علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے لئے اس فصیل درود و سلام کی تجلّیات کا مشاہدہ کرتے ہوئے ایک پیشگوئی کی تھی۔ اس پیشگوئی میں انہوں نے یہ ذکر فرمایا تھا کہ: "خدا تیمان سے آیا اور قدّوس کوہِ فاران سے.........اس کا جلال آسمان پر چھا

گیااورزمین اس کی حمد سے معمور ہو گئی،اس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی۔اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلتی تھیں اوراس میں اس کی قدرت نہاں تھی۔'' (حبقوق باب 3 آیت 3,4)

(تیمان ۔ فدَک کے پاس ایک وادی ہے۔ اسے تیماء کہتے ہیں۔نجد میں بھی اس نام کا ایک مقام ہے۔)

اس پیشگوئی میں رسول اللہ ﷺ پر درود و سلام کا ایک عظیم منظر بتایا گیا ہے۔وہ منظر یہ ہے کہ ویسے تو اللہ تعالیٰ اور کائنات کے چپے چپے پر مأموراس کے فرشتوں کا درودو سلام ہی آسمان و زمین کو حمد سے بھر دیتا ہے۔ لیکن مومنوں کے درود و سلام سے بھی اس زمانے میں ہر لمحے زمین و آسمان بھر چکے ہیں۔ آج افرادِ جماعتِ احمدیہ دنیا کے ہر خطّے میں موجود اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر صبح و مساء درود و سلام بھیج رہے ہیں۔ دن رات کی آمد ورفت یا سورج کے طلوع و غروب کے ساتھ ساتھ دنیا کے ہر حصّے میں لمحے لمحے پر درود و سلام چلتا رہتا ہے۔یعنی اگر کرّۂ ارض پر ایک جگہ سورج کے غروب کے ساتھ نمازِ مغرب کی ادائیگی ہو رہی ہے تو اس سے اگلے علاقے میں چند لمحوں کے بعد نمازِ مغرب ہو رہی ہوتی ہے اور یہ نماز رفتہ رفتہ آگے سے آگے چلتی جاتی ہے۔اسی طرح پیچھے پیچھے عشاء کی نماز کا وقت ہو جاتا ہے اور وہ بھی اسی طرح آگے روانہ ہونے لگتی ہے۔ اس طرح ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری اور بعینہٖ سب نمازیں ایک دوسرے کے پیچھے پوری دنیا میں رواں دواں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ پھر ان کے علاوہ تہجّدوں، دیگر نمازوں، سنّتوں اور نوافل وغیرہ کے علاوہ ذکر اذکار میں درود و سلام چلتا رہتا ہے۔ یہ ایسا الٰہی نظام ہے جو ایک لمحہ بھی نہ معطّل ہوتا ہے نہ رکتا ہے،نہ رک سکتا ہے۔

ان عملی حقیقتوں کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ تک کسی کی توہین پہنچ سکے۔ اللہ تعالیٰ نے ازل سے ابد تک کے لئے آپؐ کو درود و سلام اور حمد و تعریف کی

آہنی فصیلوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ توہین اور رسول اللہ ﷺ کی تکریم و تعظیم کے درمیان ہر ہر لمحہ جاری کروڑوں درود و سلام کا ایسا بند باندھ دیا ہے، ایک ایسی فصیل کھڑی کر دی ہے جو ہر توہین واستہزاء کو آپؐ تک آنے سے روک دیتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب کفّارِ مکّہ نے رسول اللہ ﷺ کی تحقیر اور تخفیف بلکہ آپؐ کی اذیّت کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا، مگر کیا ان سے رسول اللہ ﷺ کی توہین ہو گئی تھی؟ کیا اس دَور کے بعد اب تک ایسا کرنے والوں کی بدزبانیوں کی وجہ سے آپؐ کی توہین ہو گئی تھی؟ کیا اب ہو سکتی ہے؟ یا آئندہ ہو سکے گی؟ ہر گز نہیں اور ہر گز نہیں۔ لیکن ان سوالوں کا جواب جو خود سیّد المعصومین، اطہر المطہّرین، اکرم المکرَمین ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے دیا تھا، وہ کیسا سچّا اور عظمتوں کی معراج پر مبنی تھا۔ آپؐ نے فرمایا: "اَلَا تَعۡجَبُوۡنَ کَیۡفَ یَصۡرِفُ اللّٰہُ عَنِّی شَتۡمَ قُرَیۡشٍ وَ لَعۡنَھُمۡ ، یَشۡتِمُوۡنَ مُذَمَّمًا وَ یَلۡعَنُوۡنَ مُذَمَّمًا وَ اَنَا مُحَمَّدٌ۔" (صحیح البخاری کتاب المناقب باب ما جآء فی اسمآءِ رسول اللہ ﷺ) کیا یہ تمہارے لئے تعجّب خیز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کس طرح مجھ سے قریش (یعنی کفّار) کی گالیوں اور ان کی لعنت کو دور رکھتا ہے۔ وہ تو مذمّم کو گالی دیتے ہیں اور مذمّم پر لعنت کرتے ہیں مگر میں تو محمد ہوں (ﷺ)۔

اپنی جس محبوب اور پاک ذات کو اللہ تعالیٰ نے محمّد بنایا، محمّد قرار دیا اور محمّد ثابت فرمایا (ﷺ)، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی توہین ہوتی ہے، بذاتِ خود ایک جھوٹ ہے، ایک توہین آمیز خیال ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی نہ توہین ہو سکتی ہے نہ کوئی ایسا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

اگر کوئی اللہ تعالیٰ پر بدزبانی کرتا ہے اور اس کی اس بد حرکت سے اللہ تعالیٰ کی توہین نہیں ہوتی، کوئی سورج یا چاند پر بدزبانی کرتا ہے تو ان کی توہین نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر کوئی

رسولِ پاک ﷺ کی توہین کرتا ہے تو ممکن نہیں ہے کہ آپؐ کی توہین ہو جائے۔ اس کی مثال یہ بھی ہے کہ جیسا کہ ایک بد انسان نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کیا مگر وہ آپؐ پر نہیں ہوا۔ یعنی اس نے تو اپنی طرف سے یہ کیا تھا مگر وہ آپؐ پر ہو نہیں سکا۔ جیسے کوئی کسی کو تیر مارے مگر وہ اسے نہ لگے۔ بعینہٖ ہر نبی پر استہزاء ضرور ہوتا ہے، اس کی توہین کی کوشش ضرور کی جاتی ہے مگر ان کی توہین نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ مخالفوں کی ایسی حرکتوں سے محفوظ و مصئون رکھتا ہے۔ وہ عزّتوں اور عظمتوں کے بلند ترین مقام پر قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ اس سچّائی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو باقی تمام دیگر انبیاء علیہم السلام سے زیادہ اور بڑھ کر قابلِ احترام اور مقدّس بنایا ہے۔

پس رسول اللہ ﷺ کی کبھی اور کسی طور پر توہین ممکن نہیں۔ جو لوگ توہین کے نعرے لگا لگا کر انسانوں کے خون کے درپے ہیں انہیں اس سے ہاتھ کھینچنے چاہئیں اور خاطر جمع رکھنی چاہئے کہ سیّد المقدّسین، اکرم المکرّمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی نہ توہین ہوئی ہے، نہ ہوتی ہے اور نہ ہی کبھی ہو گی۔ انشاء اللہ۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اپنے جان سے پیارے اور عزیز اور اللہ کے محبوب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر بکثرت درود بھیجا جائے تا کہ یہ فصیلِ درود و سلام تہ بہ تہ بلند، وسیع اور مضبوط ہوتی چلی جائے۔

قارئین کرام! اس زمانے میں ناموسِ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا حقیقی کام حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذمہ ہے۔ لہٰذا یہی وہ جماعت ہے جو آپؑ کے لائے ہوئے نظام، تعلیم اور عمل کے مطابق ناموسِ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرتی ہے، کر رہی ہے اور کرتی رہے گی اور انشاء اللہ کرتے رہے گی۔ جماعتِ احمدیہ خلافتِ حقّہ کی الٰہی قیادت میں ایک مضبوط اور محکم لائحۂ عمل رکھتی ہے اور اس کا یہ جہاد ہمیشہ سے جاری ہے اور خلافتِ حقّہ کے تحت ہمیشہ جاری

رہے گا۔ یہاںتک کہ رسول اللہ ﷺ پر اٹھنے والا ہر تیر واپس اپنی کمان میں لوٹ جائے اور یہاںتک کہ دنیا کی اکثریت آپؐ کی غلامی میں آکر آپؐ پر درود و سلام بھیجنے والی بن جائے۔ انشاء اللہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ تقدیر ہے جو کبھی نہ ٹلنے کے لئے جاری ہو چکی ہے اور اپنی تکمیل کی جانب سرعت کے ساتھ رواں دواں ہے۔

زندہ نبی اور خدا تعالیٰ کا اعلیٰ درجہ کا پیارا نبی ﷺ

حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام امیدِ بہارِ رحمت اور نوشتۂ تقدیر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”ہم جب انصاف کی نظر سے دیکھتے ہیں تو تمام سلسلۂ نبوت میں سے اعلیٰ درجہ کا جوانمرد نبی اور زندہ نبی اور خدا کا اعلیٰ درجہ کا پیارا نبی صرف ایک مرد کو جانتے ہیں یعنی وہی نبیوں کا سردار، رسولوں کا فخر، تمام مرسلوں کا سرتاج جس کا نام محمد مصطفیٰ و احمد مجتبیٰ ﷺ ہے جس کے زیرِ سایہ دس دن چلنے سے وہ روشنی ملتی ہے جو پہلے اس سے ہزار برس تک نہیں مل سکتی تھی ...... سو آخری وصیّت یہی ہے کہ ہر ایک روشنی ہم نے رسول نبی اُمّیؐ کی پیروی سے پائی ہے اور جو شخص پیروی کرے گا۔ وہ بھی پائے گا اور ایسی قبولیت اس کو ملے گی کہ کوئی بات اُس کے آگے اَنہونی نہیں رہے گی۔ زندہ خدا جو لوگوں سے پوشیدہ ہے اُس کا خدا ہو گا اور جھوٹے خدا سب اس کے پیروں کے نیچے کچلے اور روندے جائیں گے۔ وہ ہر ایک جگہ مبارک ہو گا اور الٰہی قوتیں اُس کے ساتھ ہوں گی۔ والسّلام علیٰ من اتّبع الھدیٰ۔“ (سراج منیر روحانی خزائن 12 صفحہ 82)

یَا رَبِّ صَلِّ عَلیٰ نَبِیِّکَ دَائِمًا فِی ھٰذِہِ الدُّنْیَا وَ بَعْثٍ ثَانٖ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

****